مَنْ عَمِلَ صَالِحًا مِّنْ ذَكَرٍ اَوْ اُنْثٰى وَهُوَ مُؤْمِنٌ فَلَنُحْيِيَنَّهٗ حَيٰوةً طَيِّبَةً وَلَنَجْزِيَنَّهُمْ اَجْرَهُمْ بِاَحْسَنِ مَا كَانُوْا يَعْمَلُوْنَ

تذکرہ وقار

یعنی

مختصر حالات نواب وقار الدولہ وقار الملک

مولوی مشتاق حسین خاں بہادر انتصار جنگ

سابق

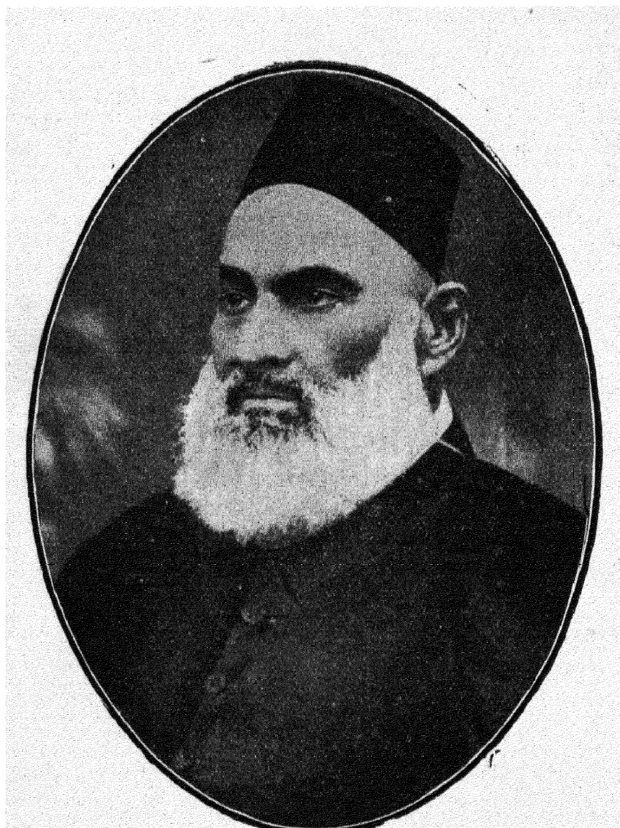
معتمد مال گذاری مملکت آصفیہ حیدرآباد دکن

(و)

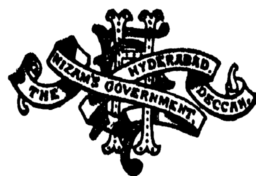
بانی آل انڈیا مسلم لیگ و آنریری سکریٹری ایم اے او کالج علی گڑھ

مرتبہ

محمد امین زبیری مارہروی وظیفہ یاب مہتمم تاریخ حکومت بھوپال



نواب وقارالملک



عدالت پناه [illegible] رشیدی

بوجوه و الطاف [illegible] رسید [illegible]

مبالغ [illegible] نصب شد [illegible]

وقوع شده و انتظام جدید در [illegible]

و [illegible] ارکان مجلس عدالت [illegible]

انتظام جدید عسکریه [illegible] خواهد شد

قرار [illegible] نظر [illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible] عدالت پناه [illegible]

[illegible]

فہرست مضامین

دیباچہ ، انتساب

دیباچہ

ہندوستان کے اِس عصرِ جدید میں جس کا آغاز تاج برطانیہ کی حکومت ۱۸۵۸ء سے ہوتا ہے برباد شدہ اور زوال یافتہ مسلمانوں کی قومی تعمیر و تشکیل میں جس طرح سرسید احمد خاں (غفرلہٗ) کا مرتبہ سب سے بلند و برتر ہے اسی طرح ان کے اعوان اور رفیقانِ کار میں مولوی سید مہدی علی (نواب محسن الملک) اور منشی مشتاق حسین (نواب وقار الملک) نمایاں اور ممتاز درجہ رکھتے ہیں جو یکے بعد دیگرے سرسید کے ہی جانشین ہوئے اور قوم نے ان کو اپنا رہبر و قائد تسلیم کیا۔

ان تینوں جلیل القدر شخصیتوں نے اس زمانہ میں قومی تعمیر و تشکیل کا عزم کیا جبکہ نفسی نفسی کا عالم تھا، تقریباً ساٹھ سال تک وہ متحداً اور منفرداً اس مقصد کی تکمیل میں نوبت بہ نوبت سرگرمِ عمل رہے اور آنے والی نسلوں کے لئے ایک پائدار عمارت تیار کر گئے۔

زمانہ کتنا ہی ترقی کر جائے، کتنے ہی قائد آسمانِ شہرت و عزت پر تارے بن کر چمکیں، کیسے ہی سخت و صعب معرکے پیش آئیں اور سر کئے جائیں مگر قومی مطلع پر ان بزرگوں کے خلوص و ایثار اور ہمت و عمل کی روشنی سب پر غالب رہے گی۔ اور انھیں کے شاندار کارناموں سے قومی اصلاح و ارتقا کی تاریخ کا آغاز ہوگا۔

ایسے واجب الاحترام بزرگوں کے سوانحِ حیات نوجوانوں کے لئے دلیلِ راہ اور شمعِ ہدایت ہیں، جن کی ترتیب و تدوین بھی بلا شبہ ایک قومی خدمت و فرض

ہے۔ اِس خدمت میں بھی اسی جماعت کے ایک ممتاز بزرگ مولانا الطاف حسین حالیؔ کو خاص اوّلیت و امتیاز حاصل ہے جنھوں نے سرسید کی ضخیم لائف لکھ کر نہ صرف اُن کے مُہتم بالشان کاموں اور قومی احسانوں کو حیاتِ جاوید بخشی بلکہ اُردو میں ایک مایہ ناز لٹریچر کی شاہراہ بنادی۔

اسی نقشِ قدم اور نمونہ پر ضرور تھا کہ سرسیدؒ کے ان دونوں جانشینوں کے سوانح حیات بھی لکھے جاتے لیکن اہلِ قلم تعلیم یافتہ طبقہ کے سامنے نئے نئے علمی میدان کھُل جانے اور تفریحاتِ ادب کی مصروفیتوں یا یہ کہ احساسِ فرض کے فقدان سے یہ "ضرورت" ہی متصور نہ ہوئی اور اس فرض کے ادا کرنے کی ایسے شخص کو جرأت کرنی پڑی جس کو اُدبا و عُلماء کے صفِ نعال میں بھی جگہ نہیں مل سکتی۔

جہاں تک ان بزرگوں کی قومی خدمات کا تعلق ہے اس کا مواد فراہم کرنا اگر آسان نہ تھا تو بہت زیادہ مشکل بھی نہ تھا، لیکن مملکتِ نظام کے نظم و نسق اور مختلف النوع فرائض اور خدمات کے حالات کو جمع کرنا اور ان اسرار و رموز تک رسائی حاصل کرنا جو دولت آصفیہ کے صیغہ سیاسیات سے متعلق ہیں دشوار سے دشوار تر تھا۔ نواب محسن الملک کی رحلت کے بعد جب کسی طرف سے بجز چند اخباری مضامین کے مستقل تذکرہ یا سوانح کی صدا نہ اُٹھی تو راقم نے یہ ارادہ کیا مگر چاکری کی مجبوری اور اس مشکل تر مرحلہ کے خیال سے جی چھوٹ گیا تا آنکہ نواب وقار الملک کا انتقال ہوا اور اب ان کی باری آئی۔ اس وقت کچھ فرصت بھی تھی اور کچھ اسباب بھی مہیّا ہو گئے۔ برادرِ محترم مولوی صبغۃ اللہ صاحب بی۔ اے کی مہربانی سے مواد کا ایک معقول حصّہ خود نواب وقار الملک کے یہاں ملگیا اور اس کے مطالعہ سے مزید رہنمائی ہوئی، ایم اے، او کالج کے مواد کا بہت بڑا مرتب

ذخیرہ مولوی نظام الدین حسن، بی۔اے، ال ال۔بی (سابق ڈپٹی کمشنر برار و معین المہام بھوپال) رئیس نیوتنی (اودھ) نے اپنی خانگی دفتر سے عنایت کر دیا۔ لٹن لائبریری (مسلم یونیورسٹی) میں انسٹیٹیوٹ گزٹ کے قدیم فائل موجود تھے، متعدد ایسے اصحاب سے مراسلت کی جن کو ان دونوں کے ساتھ ذاتی تعلق رہ چکا تھا، اور ان میں سے بعض اصحاب نے یادداشتیں لکھیں بعض اصحاب کی خدمت میں جا بجا خود حاضر ہونا پڑا اور اُن سے مستند واقعات قلمبند کئے اور مزید معلومات حاصل کیں۔

حیدرآباد سے نواب سر فریدوں جنگ، نواب فخر یار جنگ نے بھی رہبری فرمائی اور میرے عزیز محترم منشی شفقت حسین زبیری نے تو محنت شاقہ کر کے پورا ذخیرۂ مواد فراہم کر دیا۔ متعدد اصحاب نے خانگی خطوط[1] مرحمت کئے۔ جو ایک تذکرہ یا سوانح عمری کے لئے سب سے قیمتی اور اہم مسالہ ہے۔

یہ نادر اتفاق تھا کہ ان دونوں بزرگانِ ملت کی زندگی میں اتنی یکسانی تھی کہ شاید ہی دوسرے ۲ آدمیوں کی زندگی میں ہو، دونوں نے یکساں حالت سے ترقی کی، دونوں ۲ یا ۳ سال کے فرق سے (جو اُن کی عمروں میں تھا) سرسید کی تحریک میں شریک ہوئے، سال دو سال کے تفاوت سے دونوں حکومتِ نظام کی ملازمت میں داخل ہوئے، دونوں نے قابلِ رشک اوج و عروج حاصل کیا اور اتنی ہی مدت کے وقفہ سے ریاستی سازشوں کے جال میں پھنس کر حیدرآباد کو خیرآباد کہنے پر مجبور ہو گئے، اور پھر دونوں نے علیگڈھ تحریک کی ترقی اور قومی خدمت میں عمریں بسر کر دیں، محسن الملک نے اکتوبر ۱۹۰۷ء میں اور وقار الملک نے جنوری ۱۹۱۷ء میں رحلت کی، اس لئے قدرتی طور

---

[1] راقم نے اُن خطوط کا ایک مجموعہ مکاتیب کے نام سے ۱۹۱۶ء میں شایع کر دیا ہے۔

پر دونوں کی سوانح حیات کا مواد ایک ساتھ ملتا رہا۔ اسی سلسلہ میں دیگر مشاہیر اصحاب کے متعلق بھی جو کچھ ملا اُس کی یادداشت بھی قلمبند کر لی گئی۔

اس مواد کے فراہم ہو جانے کے بعد ترتیب و تالیف کی نوبت آئی، محسن الملک کے مواد میں ہنوز کمی تھی، اِس لئے وقار الملک کے سوانح سے کام شروع کیا اور ۱۹۲۱ء تک مسودہ مکمل ہو گیا۔ ادھر ۱۹۱۹ء سے آل انڈیا مسلم ایجوکیشنل کانفرنس کے دفتر میں بھی یہی ارادہ تھا۔ راقم کو مصارف طباعت کی اور کانفرنس کو مواد کی مجبوری نے باہمی معاہدہ پر آمادہ کیا اور بالآخر یہ کتاب "وقار حیات" کے نام سے شایع ہوئی جس پر صرف مولوی اکرام اللہ خاں ندوی کا نام مصنف کی حیثیت سے درج تھا۔ اس کی اشاعت سے قبل "بشیر پاشا سیریز"[1] کی اسکیم سامنے آ چکی تھی۔ اور اس سلسلہ میں راقم نے سرسید اور ان کے رفقا کے مختصر تذکرے مرتب کرائے اور کئے چنانچہ منجملہ آٹھ تذکروں کے چار خود لکھے جن میں ان دونوں بزرگوں کے بھی تھے۔

---

[1] ۱۹۲۵ء میں مولوی بشیر الدین صاحب منیجر اسلامیہ ہائی اسکول اٹاوہ کے جواں مرگ فرزند بشیر پاشا بی۔ اے کی یادگار میں مشاہیر کے مختصر تذکروں کی اشاعت تجویز کی گئی تھی چنانچہ حسب ذیل تذکرہ مرتب ہوئے۔

تذکرہ سرسید — از — نور الرحمٰن صاحب بی۔ اے (علیگ)

تذکرہ سید محمود
تذکرہ وقار الملک
تذکرہ محسن الملک
تذکرہ مولانا حالی
} محمد امین زبیری

تذکرہ مولوی سمیع اللہ خاں — سید عبد الکریم صاحب بی۔ اے۔ ال۔ ال۔ بی (علیگ)

تذکرہ مولوی نذیر احمد
تذکرہ مولانا شبلی
} مولوی محمد مہدی صاحب

پھر محسن الملک کے سوانح حیات "حیات محسن" کی باری آئی، اور اس کو کانفرنس خاکسار مصنّف کے نام سے ہی شائع کرنے پر مجبور کی گئی، اشاعت سے قبل بہت کافی اور اہم مواد اتفاقیہ طور پر دستیاب ہو گیا جس کو کانفرنس نے شامل کرنا مناسب نہ جانا لیکن یہ ایک ظلم ہوتا اگر وہ منظر عام پر نہ لایا جاتا۔ اور منتشر و برباد ہو جاتا۔ چنانچہ راقم نے ۱۳۵۲ھ ۱۹۳۳ء میں "بشیر پاشا سیریز" کے مختصر تذکرہ کو اضافات کے بعد شایع کر دیا، اسی طرح یہ "تذکرہ وقار" بھی شایع کیا جا رہا ہے۔

اُردو ادب سے عدم توجہی تفریحی وجذباتی لٹریچر کی گرم بازاری اور مزید برآں طباعت و اشاعت کی مشکلات و گرانباری کا بھی اقتضا یہی ہے کہ اس نوعیت کی کتابوں کو حشو وزوائد سے پاک رکھا جائے اور ایجاز و اطناب میں احتیاط رکھ کر ضخامت کم کی جائے تاکہ تصنیفی مقصد بوجہ احسن حاصل ہو اور راقم نے اسی اصول پر ان تذکروں کو مرتب کیا ہے۔

ان میں ریاستی زندگی کا حصّہ نہایت اہمیّت سے بھرا ہوا ہے اور عجیب و غریب سیاسی واقعات کا حامل ہے اس کا مواد ملنے کے بعد اس کو سمجھنا بھی ایک نازک سوال تھا لیکن یہ دربار بھوپال کے توسّل کا فیض ہے کہ راقم نے اس کو سمجھا اور صفحات کاغذ پر نمایاں کیا۔ یہ امر کہ راقم تصنیفی حیثیت سے کس حد تک کامیاب ہے چنداں قابلِ لحاظ نہیں کیونکہ راقم نے نہ تو تصنیفی شہرت کی تمنا سے اس تذکرہ کو مرتب کیا ہے اور نہ تجارتی غرض اور مالی نفع کی امید سے صرف ایک فرض کا احساس قومی شکر گذاری اور عقیدت کا اثر و اقتضا ہے۔

(نوٹ):۔ اِن دونوں کتابوں کی تالیف در اصل ایک المیۂ ہے اور اگر کبھی کسی نے مصنفین کا تذکرہ لکھا تو وہ اس وقت تک مکمل نہ ہوگا جب تک کہ یہ دردناک افسانے بیان نہ کئے جائیں گے۔

نواب وقار الملک کے حالات و سوانح ولادت سے رحلت تک لکھے گئے ہیں اور اس تسلسل سے اُن کی زندگی کا ہر دَور پورے طور سے نگاہ کے سامنے آجاتا ہے ان تمام اَدوار کا مطالعہ اس حقیقت کو نمایاں کرتا ہے کہ ماں کی ابتدائی تربیت اور مذہبی تعلیم سے جو نقوش ابتدا میں مرتسم ہوئے وہ نفسِ واپسیں تک قائم رہے۔

معمولی ملازمت کے فرش سے حکومت نظام کے مناصب اعلیٰ کی کرسی تک ایک وسیع ملک کے نظم و نسق اور اصلاح میں اور پھر ریذیڈنسی اور ریاستی پالیٹکس کے خارزار میں کامیابی کی مسرت و سرشاری اور ناکامیوں کی تلخی و افسردگی میں عروج و اقتدار اور زوال و معزولی کی بہار و خزاں میں قوم کی مزدورانہ خدمت سے مخدومیت و قیادت کے مرتبہ میں تعلیمی و سیاسی مراحل اور باہمی کشمکشوں اور فرقہ بندیوں میں دوست دشمن عزیز و غیر کے ساتھ تعلقات اور عوام و خواص اور غربا و امرا کے ساتھ برتاؤ میں گھر کے صحن و دالان اور پبلک مجامع میں غرض اُن کی زندگی کے ہر ایک حال و قال اور حرکت و سکون میں اسلامی سیرت و اخلاق کا ہی جلوہ نظر آتا ہے۔ انھوں نے قدرت کے فیّاضانہ عطیات کی پوری قدر کی اور ذہانت و بیدار مغزی دقیقہ سنجی و نکتہ رسی اور عزم و حوصلہ کا جو جوہر پایا تھا اس کو پورے طور پر چمکایا وہ درجہ بدرجہ عام حالت سے ترقی و شہرت اور تنگی سے فارغ البالی تک پہنچے اور ان منازل کی رہروی سے زبردست نفسیاتی تجربے حاصل کئے مگر یہ ان کا عیب تھا یا خوبی کہ زمانہ حاضرہ کی ڈپلومیسی کے شاطر نہ تھے اور ہر بات کو صداقت و ایمان داری کے معیار پر پرکھتے تھے۔

چونکہ یہ تمام تر زندگی اپنے تنوعات کے ساتھ محاسن و فضائل اخلاق کا نہایت نمایاں مظہر ہے اِس لئے عام روش سے ہٹ کر راقم نے اخلاق و عادات کے لئے کوئی باب مخصوص نہیں کیا اور خود مطالعہ کرنے والوں کے غور و فہم پر چھوڑ دیا ہے اسی طرح

وقار الملک کی عالمانہ فضیلت اور ادبی و انشائیہ قابلیت پر بھی کوئی بحث و تبصرہ نہیں لیکن متعدد مواقع پر جہاں ان کی سرکاری و قومی تحاریر و مضامین اور اُن کے خانگی خطوط کے حوالے اور اقتباس ہیں وہ ہندوستان میں فارسی لٹریچر کے آخریں اور اُردو ادب کے نشو و نما کے اوّلین دَور کا نہایت اچھا نمونہ ہیں جن میں عالمانہ فضیلت کی آب و تاب موجود ہے اور انشا کے ساتھ احتیاط و حفظ مراتب اور سلاستِ بیان ان کا امتیازی وصف ہے۔

اوائلِ عمر میں وقار الملک کو سرسیّد کا فیض تربیت حاصل ہوا تھا اور عرصہ تک ان کی ماتحتی و رفاقت میں رہے مذہبی معتقدات کے علاوہ ہر حیثیت سے وہ سرسیّد کے مقلد تھے مگر ان کی یہ تقلید "تقلید جامد" نہ تھی چنانچہ اس صدی میں جب تعلیم و سیاست کے میدان وسیع ہو گئے تو انھوں نے سرسید کی قائم کردہ حدود سے باہر نکلنے میں تامّل نہ کیا اُن سے نکلے اور تیزی کے ساتھ آگے بڑھے

سرسید کے زمانہ میں علیگڈھ تحریک کا دائرہ حکّام سلطنت اور طبقاتِ خواص تک محدود تھا نواب محسن الملک نے اس کو وسیع کیا اور نواب وقار الملک نے وسیع تر کر کے علی گڈھ کو حقیقی طور پر قومی تحریک کا مرکز بنا دیا۔ اور قوم کے تمام طبقات اُسکے ساتھ وابستہ کر دیئے

ان کا زمانہ بہ لحاظ سیاسیات نہایت پر شور اور سخت تھا مگر انھوں نے کامیابی کے ساتھ گذارا طالب علموں اور نوجوانوں میں سیاسی آراء و افکار اور کردار و اعمال کی بنیاد ڈالی قومیت کا زبردست جذبہ و حوصلہ پیدا کیا اور بالآخر ان کی ذات جدید تعلیم یافتہ سیاسیّین کی محور و مرکز بن گئی۔

اس شخصیّتِ جلیل نے کم و بیش نصف صدی قومی خدمت کر کے آئندہ نسلوں کے لئے اپنے اوصاف کا ایک بیش بہا ورثہ چھوڑا اور اس کی موت پر قدیم تعلیم کے اصحاب کی قیادت و رہبری کی تاریخ بھی ختم ہو گئی۔

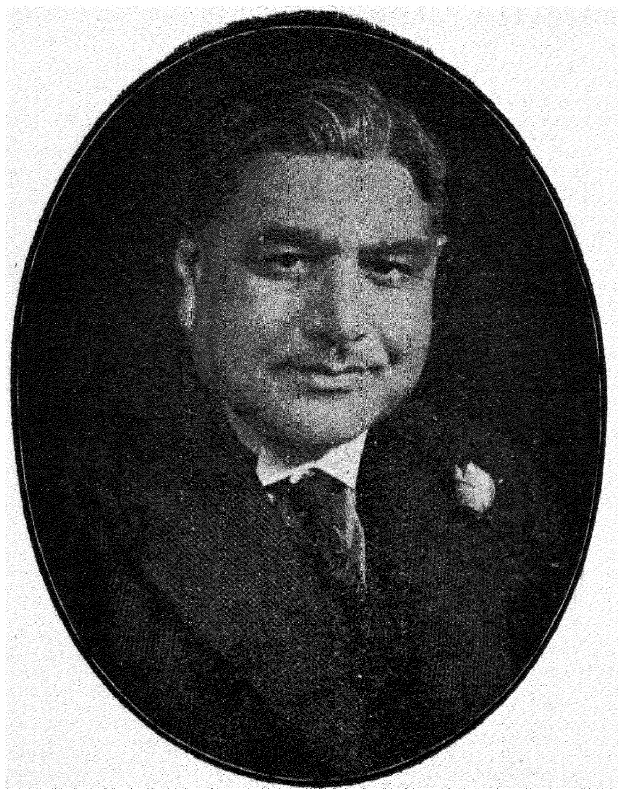
محمد امین زبیری علی گڈھ

مئی ۱۹۳۶ء

انتساب

میں نہایت ادب و احترام کے ساتھ اس تذکرۂ وقار کو قوم کے مخلص ہمدرد آنریبل سر مولوی محمد یعقوب وکیل و رئیس مُراد آباد کے عزیز و گرامی نام سے منسوب کرتا ہوں جن کا دل نواب وقار الملک کی عظمت و محبت سے معمور ہے اور جنھوں نے اس شخصیتِ جلیل کی رفاقت میں ایک عرصۂ دراز تک قابل تعریف طریقہ سے قومی خدمات انجام دی ہیں۔

محمد امین مؤلف تذکرہ



آنریبل مولوی سر محمد یعقوب
رئیس مراد آباد

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

تذکرہ

نواب وقار الدولہ وقار الملک مولوی مشتاق حسین خان بہادر
مشیر معتمد دولت آصفیہ و آنریری سکریٹری محمڈن اینگلو اورنٹیل کالج
علی گڑھ و بانی آل انڈیا مسلم لیگ
رئیس امروہہ

باب اوّل

ابتدائی حالات ملازمت و قومی خدمات

ولادت و تربیت و تعلیم مولوی مشتاق حسین ۲۹ محرم ۱۲۵۷ھ مطابق ۲۴ مارچ ۱۸۴۱ء کو موضع سرادہ میں پیدا ہوئے۔ اُن کے والد شیخ فضل حسین تھے جن کا جدّی سلسلہ دیوان عبدالمومن خاں سے ملتا ہے جو دربار شاہجہانی میں دیوان[۱] تن کے منصب پر فائز تھے۔

---

[۱] عہد مغلیہ میں یہ عہدہ وزارت کے ہم پایہ تھا جس سے جمع خرچ سلطنت عطا و ترقی اور مناصب کا تعلق تھا۔

ان کا خاندان (کنبوہ) صوبہ متحدہ[۵۲] کے چند اضلاع میں آباد ہے جس کی خصوصیات و امتیازات کے اعتبار سے ایک شان دار تاریخ ہے اور اس زمانہ جدید میں بھی تعلیمی خدمت کے لحاظ سے کچھ کم ممتاز[۵۳] نہیں مشتاق حسین کی عمر چھ مہینے کی ہوئی تھی کہ باپ کا سایہ عاطفت سر سے اُٹھ گیا اور ان کی پرورش اور تعلیم و تربیت کا بار قدرت نے صرف ماں (بتول النساء) پر ڈال دیا۔ اس زمانہ کے تمام شریف خاندانوں میں عورتوں کی تعلیم اتنی کم ہوگئی تھی کہ گویا وہ تعلیم کے قابل ہی نہ تھیں تاہم اُن کی تربیتِ اخلاق بدرجۂ اتم ملحوظ رہتی تھی اور یہ خانگی تربیت اُن خواتین میں وہ اخلاقِ حسنہ اور صفات عالیہ پیدا کرتی تھی جو صنفِ اناث کے لئے مایہ شرف ہیں۔

بتول النساء اگرچہ ناخواندہ تھیں مگر اخلاق و صفات کا ایک مکمل نمونہ تھیں انھوں نے یتیم بیٹے کی پرورش و تربیت میں حفظانِ صحت اور اخلاقِ فاضلہ کے اصول ملحوظ رکھے اور ان اصولوں کے ساتھ فطری سعادت کے امتزاج نے بیٹے میں اطاعت، وقت کی پابندی، سادگی، انسانی ہمدردی، صداقت، حفظ مراتب اور بہت سے اخلاقِ فاضلہ پیدا کردیئے جو قوائے جسمانی کے ساتھ ساتھ نشو و نما پاتے رہے اور نفس واپسیں تک قائم رہے۔ زندگی کے دشوار گذار مرحلوں، اقتدار حکومت اور دولت و امارت کی بہاروں میں قوم کی سرداری اور قوم کی خدمتوں میں زمانہ کو اُن ہی اخلاق کا مشاہدہ اور تجربہ ہوا جو شفیق ماں کی تربیت کا نتیجہ ہے۔

---

[۵۲] ایک شاخ پنجاب کے دو چار اضلاع مثل پانی پت وغیرہ میں بھی ہے لیکن بُعد مکانی کے سبب سے تعلقات برادری قائم نہیں رہے اب کنبو کانفرنس کے قیام سے امید ہے کہ یہ شاخیں مل جائینگی۔

[۵۳] خان بہادر مولوی بشیر الدین بانی و منیجر اسلامیہ ہائی اسکول اٹاوہ، مولوی سعید احمد صاحب مارہروی منیجر شعیب محمدیہ ہائی اسکول آگرہ اس صوبہ میں خاص طور پر مشہور ہیں۔ اور ڈاکٹر ضیاء الدین احمد سی آئی ای پی ایچ ڈی حال وائس چانسلر مسلم یونیورسٹی کی تو عالمگیر شہرت ہے۔

جب زمانہ تعلیم آیا تو قدیم دستور کے مطابق رسم بسم اللہ کے ساتھ مکتبی تعلیم کا آغاز ہوا لیکن اس دور قدیم کے مکاتب کو دور جدید کے مدارس سے کوئی مناسبت نہ تھی چٹائی ٹاٹ یا دو ایک چوبی تخت ایک کمرے یا دالان میں بچھے ہوئے مولوی صاحب یا میاں جی دونوں وقت بچوں کو تعلیم دیتے عموماً شام کو تختی لکھوائی جاتی - ہر طالب علم بالعموم منفرداً پڑھتا تھا بڑے مکاتب میں ایک خلیفہ بھی ہوتا ہوشیار اور بڑی عمر کے طلبا استاد کی خدمت کو شرف وسعادت سمجھتے تھے مہینہ میں حسب حیثیت تنخواہ اور عیدین اور شب برات کے تہواروں میں عیدی پیش کی جاتی تھی - یہ تنخواہ اور عیدی چند آنوں سے شروع ہو کر زیادہ سے زیادہ روپیہ دو روپیہ پر ختم ہو جاتی غربا کے بچے مفت پڑھتے لیکن ان کے ساتھ شفقت و تعلیم میں کوئی امتیاز نہ ہوتا تھا -

اسی تعلیم و تربیت کے وہ بہترین اخلاقی نتائج نکلتے تھے جو اس زمانہ کے اسکولوں اور کالجوں میں مفقود ہیں -

ان مکاتب کے بعد ایک درجہ تکمیل تھا یعنی طلبا کسی عالم کے پاس کسی مسجد یا مکان میں جمع ہو جاتے اور وہاں عربی ادب، فقہ اور تفسیر و حدیث کا درس لیتے اور یہ تعلیم عموماً بغیر کسی معاوضہ کے محض حصولِ خیر و برکت کے لئے دی جاتی تھی -

مشتاق حسین نے بھی مکتب کی تعلیم مکمل کر کے امروہہ کے ایک جیّد عالم مولوی راحت علی صاحب مرحوم سے عربی میں مذہبی تعلیم حاصل کی -

اس زمانہ میں تحصیلی (ورنیکلر) مدارس کا آغاز ہو گیا تھا اور ایسے مدارس کے سند یافتوں کو ملازمت ملنے میں آسانی ہوتی تھی اسی خیال سے انہوں نے تحصیلی مدرسہ میں بھی تعلیم پائی پھر رڑکی انجینرنگ کالج میں داخل ہوئے اور ۱۸۶۱ء میں امتحان دیا -

ملازمت اور سرسید کا فیض صحبت | چونکہ عام اشراف خاندانوں میں آئندہ

ترقی مدارج کا زینہ ملازمت کو سمجھا جاتا تھا مشتاق حسین کو بھی ملازمت کا خیال ہوا اور جس تحصیلی مدرسہ کے وہ طالب علم تھے اُسی میں دس روپیہ کے قائم مقام نائب مدرسس مقرر ہوئے۔

۱۸۶۰ء میں قحط کے امدادی کاموں کے سلسلہ میں ضلع مرادآباد سرسید[۱] کے سپرد تھا۔ انھوں نے امروہہ کے محتاج خانہ کی نگرانی پر نوجوان مولوی مشتاق حسین کو مقرر کیا جنھوں نے بڑی دل سوزی سے فرائض خدمت انجام دیئے

اس کے بعد وہ مختلف مقامات میں محرری واہلمدی اور سررشتہ داری بندوبست وصدرالصدوری کے مدارج طے کرکے علی گڑھ کی ججی میں منصرم ہوگئے خوش قسمتی سے یہاں بھی سرسید کی پیشی اور ماتحتی میں کام کرنے کا موقع ملا جو اس زمانہ میں صدرالصدور (سب آرڈینیٹ جج) تھے۔

یوں تو ان کی محنت وذہانت اور قابلیت کا اثر تمام حکام پر تھا جن سے ان کا سابقہ ہوا لیکن سرسید خاص طور پر متاثر تھے اُن کی دوررس نظر نے بغور دیکھ لیا تھا کہ ع بالائے سرش زہوشمندی۔ می تافت ستارۂ بلندی۔ اس لئے بہت زیادہ توجہ اور مربیانہ شفقت تھی۔

مولوی مشتاق حسین کام میں غیر معمولی طور پر تیز تھے اور اکثر اپنے ساتھیوں کو مدد دیتے رہتے تھے انھوں نے اوقات فرصت میں امتحان تحصیلداری کی تیاری کی

---

[۱] مولوی مشتاق حسین کے ماموں مولوی امام الدین صاحب (مرحوم) ڈپٹی کلکٹر مرادآباد میں سرسید کے ساتھ انتظام قحط میں شریک تھے اور دونوں میں دوستانہ وعزیزانہ مراسم وتعلقات ہوگئے تھے۔ مولوی مشتاق حسین اکثر ماموں کے پاس مقیم رہتے اور سرسید کی خدمت وصحبت میں حاضر ہوتے۔ اور یہی وہ تعلقات اور فیضان صحبت تھا جن کی بنیادوں پر ان کی قومی خدمات کی عظیم الشان عمارت تعمیر ہوئی۔

اور ۱۸۶۵ء میں صیغہ فوجداری میں کامیاب ہوئے - چونکہ صیغہ دیوانی میں آئندہ ترقی انگریزی دانی کے ساتھ مشروط ہو گئی تھی اور صیغہ مال میں ہنوز راستہ کھلا ہوا تھا اس لئے تبادلہ کرا لیا -

اس صیغہ میں کچھ عرصہ تک پیشکار، نائب تحصیلدار اور قائم مقام تحصیلدار بھی رہے ۱۸۷۴ء میں جب گورکھپور اور بستی میں قحط کے امدادی کام جاری ہوئے اور سرسید اس کے نگراں مقرر کئے گئے تو انہوں نے کچھ مدت کے لئے سر جان اسٹریچی سے بطور خاص درخواست کر کے مولوی مشتاق حسین کی خدمات اپنی امداد کے لئے حاصل کیں اور ان کی خدمات کا حکام بالادست کی جانب سے تحریری اعتراف ہوا

دو مرحلے | اس دور ملازمت میں مولوی مشتاق حسین کو دو سخت مرحلے پیش آئے جن میں اُن کے توکل علے اللہ اعتماد علے النفس اور استقامتِ طبع کا امتحان ہوتا ہے

ہر عہدہ دار کے دل پر ان کی دیانت و قابلیت کا نقش مرتسم تھا اس لئے منصرمی کے زمانہ میں وہ لوکل کمشنر مقرر ہوتے رہتے تھے اور جو کیفیتیں لکھتے تھے اُن سے حکام متفق و مطمئن ہو جاتے تھے لیکن ججی کے عہدہ پر جب مسٹر ایس این مارٹن آئے جو ایک خاص قسم کی طبیعت رکھتے تھے وہ کسی حاسد کی بدگوئی سے یا خود ہی بدگمان ہو گئے اور اُن کے کام پر ایک سخت ریمارک کیا -

اُس وقت کیا اب تک بھی کسی منصرم کو کسی انگریز جج کے مقابلہ میں کسی احتجاج کی جرأت بہت کم ہوتی ہے مگر باوجودیکہ مولوی مشتاق حسین اس صیغہ سے تبادلہ کرا چکے تھے اور ایک اور انگریز افسر کے ماتحت تھے تاہم انہوں نے اس ریمارک کے خلاف نہایت زبردست احتجاج کئے -

دوسرا مرحلہ یہ تھا کہ اوقات دفتر میں پابندی کے ساتھ وہ نماز کے لئے اٹھ جاتے تھے اور یہ بات مسٹر کالون کلکٹر کو جن کی پیشی میں وہ کام کرتے تھے

سخت ناگوار تھی انھوں نے روکا اس پر جھگڑا ہوا اور بالآخر مولوی مشتاق حسین نے رخصت کی درخواست پیش کی مگر مسٹر کالون نے اس کے لینے سے انکار کر دیا اور طنزاً یا حقیقتاً استعفا پیش کرنے کی ہدایت کی چنانچہ انھوں نے نماز پڑھنے کی اجازت کی اور وہ غیر حاضری جو نماز کی وجہ سے ہوتی تھی معاف کئے جانے کی درخواست کی اور بصورت عدم منظوری رخصت چاہی اور رخصت کی نامنظوری کی صورت میں اس درخواست کو بطور استعفا[ل] قبول کئے جانے کی استدعا کی۔

ان کی مستقل ملازمت کو اس وقت تک چودہ سال گذر چکے تھے۔ سو روپیہ مشاہرہ تھا جو اُس زمانہ میں ہی ایک معقول تنخواہ نہ تھی بلکہ آج بھی گریجویٹوں کو بڑی مشکل سے ملتی ہے اور پھر ترقی کے آخری منازل یعنی تحصیلداری و ڈپٹی کلکٹری کا راستہ صاف تھا لیکن انھوں نے خدا پر توکل کیا اور احکم الحاکمین کی اطاعت کو دنیاوی حاکم کی اطاعت پر مقدم رکھ کر استعفا پیش کر دیا نتیجہ میں رخصت منظور کر لی گئی اور ملازمت قایم رہی۔

قومی خدمات کا آغاز علی گڑھ میں جو قومی تحریک شروع ہوئی تھی اس میں مولوی مشتاق حسین بطور ایک خادم کے شریک ہوے اور اُن کے دل میں ہمدردی کا جو دلولہ وجذبہ فطرت نے ودیعت کیا تھا اب وہ ظاہر ہونے لگا ہر ایک کام جو اُن کے تفویض کیا جاتا محنت و دلچسپی سے انجام دیتے سینٹفک سوسائٹی[ع] اور پریس کا اہتمام اور تہذیب الاخلاق کی اشاعت کا انتظام ان کے ذمہ تھا۔ ۱۸۶۶ء میں وہ سینٹفک سوسائٹی کے ممبر اور پھر معاون منتخب ہوے۔

۱۸۷۰ء میں سر سید نے جب کمیٹی خواستگار تعلیم مسلمانان کی جانب سے ایک[ل]

ل سر سید کو جب اس ناگواری کی اطلاع ہوئی تو انھوں نے ایک دلچسپ اور حوصلہ افزا خط لکھا مگر اس خط کے موصول ہونے سے پہلے ہی تمام معاملہ ختم ہو چکا تھا۔ (مجموعہ خطوط سر سید صفحہ ۱۰۹)

مضمون کا اشتہار شائع کیا جس کا مقصد یہ تھا کہ ان وجوہ کو معلوم کیا جائے کہ کیوں مسلمان سرکاری مدارس میں داخل نہیں ہوتے، اُن میں علوم جدیدہ کی تعلیم کیوں نہیں پھیلتی اور علوم قدیمہ کی تعلیم کیوں گھٹ گئی ہے تو مولوی مشتاق حسین نے بھی ۹ دن کے اندر ایک مبسوط رسالہ لکھا جس کے چار حصوں میں انہوں نے سوال کے ہر جزو پر نہایت مدلل بحثیں کیں۔

ان بحثوں میں صرف زورِ انشا ہی نہیں ہے بلکہ بنیادی حقیقی امور کو تاریخ و واقعات اور ذاتی تجربات سے بیان کیا ہے۔ انہوں نے گورنمنٹ اسکولوں اور کالجوں میں مسلمانوں کی کمی کے متعلق اس بات سے قطعی انکار کیا کہ مذہبی تعصب سدِّراہ ہے بلکہ اس کی وجہ یہ قرار دی کہ ان مدرسوں اور کالجوں میں طلباء کا اخلاق درست نہیں ہوتا اور کورس کی تاریخی کتابوں سے مسلمانوں کی مذہبی توہین ہوتی ہے۔

حلقہ بندی اور تحصیلی مدرسوں کے سلسلہ میں اردو کی تعلیم کی کمی، افسرانِ تعلیم کا مسلمانوں کی ضروریات سے تغافل، بعض دل آزار اور ہندو مسلمانوں میں دشمنی کے جذبات پیدا کرنے والی کتابوں کا داخلِ نصاب ہونا اور نفسِ تعلیم کی عدم نگرانی پر بسیط بحث کی۔

اس سوال کے جواب میں کہ علومِ قدیمہ کی تعلیم کیوں گھٹ گئی" عرب کی علمی تاریخ اور مسلمانوں کے علمی کارناموں، یورپ کی تعلیمی حالت اور موجودہ زمانہ کی تعلیم کے نقائص سے بحث کرکے موجودہ تنزل کے تمام اسباب و علل کو بیان کیا آخری حصہ میں تعلیم نسواں کی ضرورت اور اہمیت کو دکھایا ہے اور بتیس ۳۲ جواب مضمون لکھنے والوں میں سے انہوں نے ہی اس مسئلہ پر کماحقہٗ توجہ کی اور اس ضرورت پر زور دیا۔

یہ سب رسائل جب پیش ہوئے تو کمیٹی نے اس رسالہ پر درجہ دوم کا

انعام تجویز کیا۔

سیٹنفک سوسائٹی کے مقاصد کی تائید کے لحاظ سے منشی گلزاری لال اور بابو گنگا پرشاد کی اعانت سے انھوں نے "فرنچ ریوولیشن اینڈ نپولین" کا انگریزی سے اردو میں ترجمہ کیا جس کا نام "سرگزشت نپولین بوناپارٹ" رکھا ان کے دونوں رفیق عبارت پڑھ کر اُن کو ترجمہ سمجھاتے اور یہ اس کو اردو کی شُستہ عبارت میں لکھتے اور وہ دونوں اس پر نظر ثانی کرتے۔

غرض چند گرم مہینوں کی راتوں میں انھوں نے اس ترجمہ کی تکمیل کی اور سررشتہ تعلیم سے ان تینوں کو انعام ملا۔ یہ کتاب ۱۸۷۱ء میں نولکشور پریس لکھنؤ نے شائع کی۔

۱۸۷۲ء میں جب محمڈن اینگلو اورنٹیل کالج فنڈ کمیٹی قایم ہوئی اور جا بجا سب کمیٹیاں بنائی گئیں تو مولوی مشتاق حسین نے علی گڑھ کمیٹی میں وصولی چندہ کے متعلق بڑی سرگرمی کے ساتھ کام کیا کمیٹی کے دفتر کی نگرانی اور بجٹ کی تیاری بھی ان کے سپرد تھی۔

مضمون نگاری ان کو جب موقع ملتا تو تہذیب الاخلاق میں مضامین بھی لکھتے مگر ان مضامین کی وجہ سے سرسید اور نواب محسن الملک کے ساتھ وہ بھی الحاد و زندقہ کے الزاموں سے محفوظ نہ رہے۔

یکم محرم ۱۲۹۰ھ (۱۸۷۳ء) کے تہذیب الاخلاق میں سرسید نے ان الزاموں کے متعلق لکھا تھا کہ

اُب ہمارے محبوب مہدی[1] علی اور ہمارے عزیز مشتاق حسین کا حال سنو۔

یہ ہمارے دونوں دوست ایسے ہیں جن کا کچھ حال چھپا نہیں ہے۔ مولوی مہدی علی کا علم، اس کی ذاتی خوبیاں اس کی پیاری پیاری باتیں اس کی سچی

---

[1] ۔ نواب محسن الدولہ محسن الملک منیر نواز جنگ فنانشل سکرٹری دولت آصفیہ و آنریری سکرٹری ایم اے او کالج رحلت اکتوبر ۱۹۰۷ء

ایمانداری اس کی فصیح تقریریں اس قابل ہیں کہ اگر ہماری قوم کے دل کی آنکھیں اندھی نہ ہوتیں تو اس کے نام سے فخر کیا کرتے۔

منشی مشتاق حسین کی ذاتی نیکی، اور نہایت سخت دین داری، بے ریا عبادت سچی خدا پرستی، غایت تشدد سے نماز روزہ اور احکام شریعت کی پابندی جو درحقیقت بے مثل ہے اس لائق تھی کہ اگر ہماری قوم پر خدا کی خفگی نہ ہوتی تو اس سے مسلمانی کو فخر سمجھتے۔

مگر خدا نے ایسا اپنا غضب ہماری قوم پر نازل کیا ہے کہ ایک رائے یا ایک مسئلہ یا ایک آبائی رسم ورواج کے اختلاف کے سبب ایک کو نہایت حقارت سے حواری جس سے اشارہ عیسائی کا رکھا ہے اور دوسرے کو ملحد کا خطاب دیا۔ کبرت کلمۃ تخرج من افواھھم ان یقولون الا کذبا۔

مگر ہمارے ان دوستوں کو خدا کا شکر کرنا چاہیئے کہ ان کو بعوض سچائی اور دین داری کے یہ خطاب ان ہی کی قوم سے ملے ہیں جن کی وہ بہتری چاہتے ہیں۔

نیک باشی و بدت گوید خلق   بہ کہ بد باشی و نیکت گویند"

جوش وخلوص خدمات

مولوی مشتاق حسین جس جوش وخلوص کے ساتھ یہ قومی خدمات انجام دیتے تھے اس کا کسی قدر اندازہ کرنے کے لئے ایک خانگی خط سے ذیل کا فقرہ پڑھنا چاہیئے کہ

گو یہ سچ ہے کہ سید صاحب قبلہ نے بنارس کے متعلق کاموں میں اسی کشیدگی خاطر کی وجہ سے آپ کو تکلیف نہ دی مگر آپ کیوں شکایت نہیں کرتے ضرور شکایت کیجئے، جب مدرسۃ العلوم کا ابتدائی چندہ قایم ہوا اور مجلس خزینۃ البضاعۃ کے ممبر تجویز ہونے لگے تو جناب ممدوح نے مجھ کو ممبر

نہیں بنایا تھا میں نے اپنے چندہ سے ان کو اطلاع دی اور لکھا کہ مجھ کو حضرت خالد کا وہ فقرہ یاد ہے جب کہ انھوں نے لشکر اسلامی کی سپہ سالاری حضرت عبیدہ بن الجراح کو سپرد کرتے وقت فرمایا تھا کہ "ہم کو اس سے کچھ مطلب نہیں کہ جھنڈا ہمارے ہاتھ میں ہو یا کسی اور کے ہاتھ میں۔ ہم کو اس جھنڈے کے نیچے اسلام کی خدمت گذاری کرنی ہے" خیر وہ وقت گذر گیا اور آج وہی میں ہوں اور وہی سرکار ہیں ان باتوں کا کوئی لحاظ نہیں ہو سکتا"

(مکاتیب حصہ دوم)

وہ جسمانی و دماغی خدمتوں کے علاوہ بقدر حیثیت مالی امداد بھی کرتے رہتے تھے اور اُس وقت کا پانچ پانچ اور دس دس روپیہ کا چندہ آجکل کے سیکڑوں اور ہزاروں کی رقوم پر بھاری تھا۔

رفاہ عام کے بعض مقامی کام

وہ اس قومی تحریک کے علاوہ مقامی رفاہ عام کے کاموں میں بھی حصہ لیتے رہے میونسپلٹی میں سرکاری طور پر ممبر نامزد کئے گئے اور اپنے فرائض کو نہایت سرگرمی سے ادا کیا۔ ۱۸۶۹ء میں انھوں نے ایک یونانی شفاخانہ اور باقاعدہ دواخانہ پرائیویٹ چندوں سے قایم کرایا۔

۱۸۶۷ء میں جو تعلیمی کمیٹیاں اضلاع شمال و مغرب میں مقرر ہوئیں ان میں سے علی گڑھ کی کمیٹی میں مولوی مشتاق حسین کو ممبر بنایا گیا اور پھر اسسٹنٹ سکرٹری اور بعدہ سکرٹری مقرر ہوئے آٹھ سال تک نہایت شوق و انہماک کے ساتھ اس کمیٹی کا کام کیا حلقہ و تحصیل کے مدارس کا جب معائنہ کرتے تو طلبا کا امتحان لیتے اور ہر ایک ضرورت اور اصلاح اور اسباب ترقی پر غور و خوض کر کے بالتفصیل اپنی کیفیتیں لکھتے تھے۔ وہ غائر نظر سے ہر ایک چیز کو دیکھتے اور نہایت آزادی اور استدلال کے ساتھ سررشتہ تعلیم کے افسروں کو توجہ دلاتے

جب اُن کو یہ یقین ہوگیا کہ سررشتہ تعلیم کی لاپروائی اور دست اندازی سے وہ نتائج نہیں نکلتے جو ان کیٹیوں کا مقصد ہے تو انہوں نے بے خوفی کے ساتھ ان امور پر زبردست بحث کی۔ اور متعدد یادداشتیں لکھیں۔

ان کوششوں سے حسبِ مراد تو نہیں لیکن پھر بھی کچھ نہ کچھ فوائد حاصل ہوئے اور گورنمنٹ نے بھی گزٹ میں ان کی کوششوں کا شکریہ اور اعتراف شائع کیا۔

علی گڑھ میں سیاسی اغراض کے لئے جو برٹش انڈین ایسوسی ایشن[۱] قایم ہوئی تھی مولوی مشتاق حسین اس کے بھی ممبر تھے انہوں نے ایک مسودہ قانونی پر جو بعض ہندوستانیوں کے ازدواج کی بابت اس زمانہ کی مجلس واضع قوانین (لیجس لیٹو کونسل) میں پیش تھا اپنی رائے لکھی اور اس قانون سے ہندوستانیوں کے رسم ورواج پر برا اثر پڑنے اور معاشرتی تعلقات میں خرابیوں کے پیدا ہونے کے امکان کو دکھا کر نہایت آزادی سے نکتہ چینی کی۔

غرض ۱۸۷۵ء کی ابتدا تک جو ان کے حیدرآباد جانے کا زمانہ ہے سرکاری فرائض ادا کرنے کے بعد جو وقت ملتا وہ ایسی ہی کوششوں میں صرف کرتے رہتے تھے۔

---

[۱] ۱۸۶۶ء میں سرسید کی تحریک اور علی گڑھ اور اس کے نواح کے روساء اور چند یورپین افسروں کی تجویز سے اس ایسوسی ایشن کا قیام عمل میں آیا تھا جس کا مقصد یہ تھا کہ گورنمنٹ سے حقوق حاصل کرنے کے لئے پارلیمنٹ سے تعلق پیدا کیا جائے۔

ملاحظہ ہو حیات جاوید صفحہ ۱۲۶

باب دوم

حیدرآباد کی ملازمت

عہد اصلاح صدیوں کی اُن خانہ جنگیوں اور معرکہ آرائیوں میں جن سے دکن کی تاریخ معمور رہے مملکتِ آصفیہ میں کوئی معقول یا قابل الذکر نظام حکومت بعید از امکان تھا۔ لیکن جب کسی قدر امن و امان حاصل ہوا تو جس طرح کہ برٹش انڈیا کے صوبوں میں جدید نظام پر توجہ کی گئی اسی طرح دکن کی اس اسلامی ریاست میں بھی جو آج مسلمانوں کے لئے مایہ افتخار ہے توجہات مبذول ہوئیں اور کوئی شک نہیں کہ یہ توجہات اور مساعی اصلاح سر سالار جنگ اعظم کے اُن قابل احترام جذبات کا نتیجہ تھیں جو ان کے دل میں اپنے آقا اور اپنے ملک کے متعلق موجزن تھے ہنگامہ غدر سے سکون واطمینان کے بعد ان انتظامات واصلاحات کے سلسلہ میں سر سالار جنگ نے بڑی چھان بین اور تحقیق سے مختلف اطراف ہند کے قابل اور لائق آدمیوں کو اپنی امداد کے لئے منتخب کیا اس انتخاب میں سرسید کا مشورہ بھی شامل تھا جس کی وجہ سے مولوی سید مہدی علی خاں (نواب محسن الملک) اور دیگر اصحاب کی خدمات حاصل کی جاچکی تھیں اور مولوی مشتاق حسین کی نسبت مراسلت جاری تھی۔

نظامت دیوانی چنانچہ وسط ۱۸۷۵ء میں موجودہ تنخواہ سے بیش قرار مشاہرہ پر ان کا بھی ناظم دیوانی کے عہدہ پر تقرر ہو گیا جو اُن کے آیندہ عروج کی منزل اولیں تھی اس تقرر کے بعد وہ انگریزی ملازمت سے مستعفی ہو گئے اور سر سالار جنگ کی قدر دانی اور فیاضی سے انگریزی سروس کا زمانہ سرکار

سرکار عالی کی ملازمت میں شمار کرلیا گیا۔

مولوی مشتاق حسین کی انگریزی ملازمت محرری سے شروع ہو کر عارضی طور پر قائم مقام تحصیلداری تک پہونچی تھی لیکن ان کی نظر بلند و وسیع تھی ان کا دماغ سیاست و تمدن اور تدبیر مملکت کے لئے خاص طور پر موزوں تھا ساتھ ہی وہ نڈر اور صحیح معنوں میں بہادر تھے اور حق و صداقت کے سوا ان کو کوئی قوت مغلوب نہ کرسکتی تھی۔

معتمدی صدرالمہام عدالت

تقریباً ایک سال تک انہوں نے حاکم عدالت دیوانی کی خدمات انجام دیں لیکن سرسالار جنگ کی دقیقہ رس نگاہ نے اس عرصہ میں ان کی قابلیت کا اندازہ کرلیا اور صدرالمہام[۱] عدالت (جوڈیشنل منسٹر) کی معتمدی پر ترقی دے دی گئی۔ اس صیغہ سے امن عامہ، حفاظت رعایا اور تلافی حقوق کا تعلق تھا مگر اس کے تمام نظام میں اصلاحات کی ضرورت تھی۔

اصلاحات

معتمد عدالت نے اول صوبہ (اورنگ آباد) کی حالت اور قوانین و آئین اور جیل خانوں کا معائنہ کرنے کے بعد ایک اصلاحی رپورٹ مرتب کی۔ اور پھر ۱۸۷۸ء میں عام انتظامات و اصلاحات پر ایک مبسوط تبصرہ کر کے تجاویز کی مکمل اہم یادداشت پیش کی جس کے نتیجہ میں ضروری اصلاحات عمل میں آئیں۔ عدالتوں کا طریقہ کارروائی بدلا گیا ضروری قوانین کی ترتیب کی گئی معتمد عدالت نے خود اہم گشتیاں سرکلر

---

[۱] جدید انتظامات کے سلسلہ میں جو اس دور میں کئے گئے سرسالار جنگ اول کی خواہش سے نواب بشیرالدولہ سرآسمان جاہ محمد مظہرالدین خاں بہادر نے جو مشہور خاندان پائیگاہ کے ایک نہایت قابل رکن اور اعلیٰ حضرت نظام الملک آصفجاہ سادس کے بہنوئی تھے اعزازی طور پر صدرالمہامی عدالت یعنی وزارت شعبہ انصاف کا عہدہ قبول کیا تھا۔ امور مملکت میں سرسالار جنگ نے ان کی خاص طور پر تربیت کی تھی اور اپنے سفر یورپ کے دوران میں انہیں کو قائم مقام مقرر کرایا تھا۔ ولادت ۱۲۵۲ھ / ۱۸۴۰ء رحلت ۱۳۱۶ھ / ۱۸۹۸ء

جاری کیں - اور روبکار لکھے جو قانون اساسی کی حیثیت رکھتے تھے - کاغذ مہور (اسٹامپ) کا اجرا کرایا - جیل خانوں میں کارخانوں کے قیام پر توجہ دلائی قیدیوں کی اخلاقی حالت کی اصلاح کے لئے واعظین کا تقرر کرایا - لیکن ہنوز ایک سب سے اہم اصلاح باقی تھی جس کا عمل پذیر ہونا بھی کچھ کم اہمیت نہ رکھتا تھا اور جس کی کامیابی صرف اخلاقی جرأت پر ہی منحصر تھی -

ایک اہم اصلاح

ملک میں ایک اعلیٰ عدالت "مجلس مرافعہ" کے نام سے قائم تھی لیکن اکثر اپیلوں کی سماعت صدر المہام عدالت اور مدار المہام (وزیر اعظم سر سالار جنگ) بھی کرتے تھے اس طرح مجلس مرافعہ عملاً احکام انتظامی کے ماتحت ہوگئی تھی انفصالِ مقدمات میں بھی طوالت ہوتی تھی بعض اوقات اس قسم کے احکام و روبکار بھی صادر ہو جاتے جن سے کسی دستور العمل (قانون و قواعد) نافذہ کے بعض دفعات کی خود بخود تنسیخ ہو جاتی تھی -

مولوی مشتاق حسین نے نہایت جسارت کے ساتھ اس سخت ترین نقص کی طرف توجہ دلائی اول مرتبہ تو مدار المہام نے چند دلائل کے ساتھ اس اصلاح کو مسترد کر دیا لیکن مولوی مشتاق حسین نے دوبارہ ایک مفصل یادداشت پیش کی جس میں تفصیل سے ان نقائص پر بحث تھی اس کا ایک فقرہ یہ تھا :-

"مجلس واضع آئین و قوانین از محکمۂ مدار المہام سرکار عالیٰ علٰحدہ باشد گو منظوری و عدم منظوری یا ترمیمِ مسوداتِ قوانین مرتبہ مجلس بلحاظِ حالاتِ وقت، و مصالحہ ملکیہ بہ اختیار مدار المہام سرکار عالی باشد و دریں قوانین اقتدار ہر یک محکمہ صاف صاف بیان کردہ شوند تا آیندہ مدار المہام سرکار عالی ہم ازاں تجاوز نہ فرمایند و اگر ضرورت اصلاح کدامی قاعدہ پیش آید بغیر از مشورۂ مجلس مجرد از رائے آں محکمہ تنسیخ و ترمیم آں شدن

نتواند کہ بغیر از کارروائی مذکورہ محکمہ جات ماتحت راگاہے آزادی نخواہد شد

و نہایت ضرورست کہ کارروائی صیغہ عدالت از حکومت کار فرمایان وقت آزاد

باشد - بریں موقع باز ہماں سوال پیدا خواہد شد کہ اراکین ایں چنیں مجلس از کجا

آیند - و جواب صدرالمہام ہماں است کہ زمانہ ہنوز از کار آگاہاں خالی نیست

و زر کہ بر اکثر مواقع غیر ضروری صرف آں دیدہ میشود کفالتِ ایں امر ضروری

ہم بخوبی کردن میتواند ؛

کامیابی

بالآخر ان کی تجاویز منظور ہوئیں - مدارالمہام کے تمام اقتدارات و اختیارات مجلس مرافعہ کو تفویض ہو گئے نظام عدالت مکمل ہوا قابل و متقن عہدہ دار مقرر کیے گئے - قوانین و قواعد کی وضع و ترتیب کے لئے ماہرین قانون کی خدمات حاصل کی گئیں -

جوڈیشل رپورٹ کا اقتباس

ان کوششوں کا جو نتیجہ نکلا وہ مجلس عالیہ کی جوڈیشل رپورٹ ۱۲۹۴ف ۱۸۸۵ء میں مختصر طریقہ سے یوں بیان کیا گیا ہے کہ :-

" نواب صاحب مرحوم (سر سالار جنگ اول) نے اپنے قدیم اصول کی کہ لئیق

عہدہ دار اور عہدہ داران غیر متعہد گورنمنٹ انگریزی سے پسند کر کے سرکار میں

مقرر کریں پیروی کر کے مولوی مشتاق حسین صاحب کو معتمد صدرالمہام مقرر فرمایا

ان کے زمانہ میں صیغہ عدالت کی اصلاح اور رفارم کی تاریخ کی ایک نئی بنیاد

پڑی - اپنی بے انتہا محنت اور فطری لیاقت سے انہوں نے ملک میں بہت سی

اصلاحیں کیں - ان کی جانفشانی سے عدالتوں کی طرز کارروائی بالکل بدل گئی

اور ان کی تحریرات سے عدالتوں کو اپنی کارروائی میں آزادی حاصل ہوئی

جو اس وقت انہیں میسر نہ تھی - اُن ہی کی سفارش پر مدارُالمہام نے

مقدمات کی نسبت اپنی مداخلت کو روکا اور حکّام عدالت کی تنخواہوں میں اضافہ کیا - اس کے قبل یہ بے ضابطگی تھی کہ بعض حکّام جن کی تنخواہ سو کے اندر تھی بہت بھاری اقتدارات دیوانی و فوجداری کے رکھتے تھے -

انہوں نے عدالتہائے تحت کی نگرانی کے لئے ایک کامل انتظام جاری کیا ان کی کامیابی کی وجہ اُن کی ذاتی اخلاقی خوبیاں تھیں جن کا حیدرآبادیوں کے دل پر بہت ہی عمدہ اثر پڑا تھا - اور جن کی وجہ سے انہوں نے وہ کارروائیاں کیں جن کے جاری کرنے میں کسی دوسرے آدمی کو بہت ہی سخت مشکلات لاحق ہوتیں "

محتاج خانوں کا انتظام

۱۸۷۶ء کے قحط میں امدادی کاموں کے لئے ایک مجلس قایم ہوئی مولوی مشتاق حسین بھی اس کے رکن تھے ان کی تجویز سے مختلف مقامات میں محتاج خانوں کا اجرا منظور کیا گیا اور انتظام بھی ان ہی کے سپرد ہوا چنانچہ انہوں نے موزوں مقامات پر متعدد محتاج خانے قایم کئے جن میں مردوں اور عورتوں کے جدا جدا حصے تھے شیر خوار بچوں کا خاص انتظام تھا جن کی مائیں مرگئی تھیں ان کی پرورش کے لئے محتاج خانہ کی عورتوں کو انتخاب کیا گیا - دودھ اور دودھ پلانے کی شیشیاں حسب ضرورت مہیا کی گئیں چھوٹے بچے جو محنت و مزدوری کے قابل نہ تھے ایک علٰحدہ حصے میں رکھے گئے اور سب کا یکساں لباس بنایا گیا حفظانِ صحت اور طبی امداد کا اعلیٰ پیمانہ پر اہتمام تھا مریضوں اور بچوں کی تفریح کے لئے سبزہ زار بنائے گئے ساتھ ہی تمام محتاجین کی اخلاقی نگرانی بھی نہایت سخت تھی -

مولوی مشتاق حسین جب ان محتاج خانوں میں جاتے تو گھنٹوں محتاجین و مساکین اور خصوصاً بچوں کے ساتھ مصروف گفتگو رہتے - کبھی وہ ایک جگہ کھڑے ہو جاتے یا بیٹھ جاتے اور سبزہ زار میں بچوں کے کھیلنے کا تماشہ دیکھتے اور اس وقت اِن کے

دلی جذبات قطرات اشک کی صورت میں آنکھوں سے نکلتے معلوم ہوتے ان محتاج خانوں میں ۹۰۰۰،۶۳ محتاج داخل ہوئے جن میں ۴،۸،۷،۷،۳ معذور محض تھے ۔

جو محتاج سڑکوں وغیرہ پر کام کرنے کے قابل تھے اُن سے وہاں کام لیا جاتا تھا اور جو محتاج خانوں سے باہر جا کر کام نہیں کر سکتے تھے مگر کام کے قابل تھے ان کے لئے محتاج خانوں میں کام کا انتظام کر دیا گیا تھا ۔ ان محتاج خانوں کا وقتاً فوقتاً عہدہ داران سرکار عالی کے علاوہ مدراس و بمبئی کے صوبوں اور دوسری ریاستوں کے عہدہ داروں نے بھی معائنہ کیا اور نہایت عمدہ ریمارک کئے

کارہائے قحط کے اختتام اور محتاج خانوں کے شکست ہونے کے بعد مولوی مشتاق حسین نے ایک مفصل رپورٹ صدر مجلس قحط کے سامنے پیش کی جو تقریباً سو صفحہ فلسکیپ پر ہے ۔

شکریہ

صدر مجلس نے ان کی کوششوں کا خاص طور پر شکریہ ادا کیا اور سر سالار جنگ نے اپنی تقریر میں کہا کہ

" مولوی مشتاق حسین مسکین خانوں کے قایم کرنے میں تکلیف اٹھانے کے باعث حکومت کی طرف سے شکریہ کے مستحق ہیں اور ابتدا سے ہی مسکین خانوں کے عمدہ انتظام کا سبب ان کی ذات ہے "

کمیشن میں شہادت

۱۸۸۰ء کے کمیشن میں جب ان کی تحریری شہادت پیش ہوئی تو مذکورہ بالا رپورٹ بھی اس کے ساتھ منسلک کی گئی

سر سالار جنگ کی جوہر شناسی اور تربیت

مولوی مشتاق حسین کی محنت اور آزادی رائے کی سر سالار جنگ کے دل میں بڑی قدر و منزلت تھی اور وہ مربیانہ شفقت کے ساتھ حقیقتاً ان کی ایک قسم کی تربیت کر رہے تھے ۔

بعض اوقات یہ آزادی رائے مرتبہ اور عمر کی ان حدود سے بھی متجاوز کر دیتی تھی جو ان کے اور سالار جنگ کے درمیان قدرتی طور پر واقع تھیں لیکن اس کا جواب ہمیشہ نازبرداری و حوصلہ افزائی سے ملتا تھا

چنانچہ ایک مرتبہ ان کے ایک روبکار پر وزارت سے ایک ایسا اعتراض ہوا جس کو انھوں نے اپنی نسبت ملامت خیال کیا تو ضابطہ سے اس کے جواب میں جو کیفیت لکھی اور ساتھ ہی جو خانگی عریضہ پیش کیا دونوں میں خودداری و صداقت کی وہ ہی تیزی تھی۔ خانگی عریضہ میں بعض ایسے فقرات بھی لکھے تھے جو استعفےٰ کے مرادف تھے۔

لیکن اس کا جواب یہ تھا :۔

آں مہربان خواہ مخواہ ناخوشی را بخاطر خود جا نہ دہند۔ این معاملات اند و در آں تکرارات وقوع می یابند۔ لیکن مناسب نیست کہ ہیچ تکرارات جاری بمانند۔ بعض اوقات از محکمۂ آں مہربان تکرارات بے سبب و فائدہ برپا میشوند کہ بالمشافہ در آں باب فہمائش خواہد شد حالا آں مہربان بر خلاصہ کارروائی غور کنند۔

اس کے بعد انھوں نے خلاصہ کارروائی کو بیان کر کے تحریر کیا کہ :۔

حالا آں مہربان بر جنگ جوئی کہ از محکمۂ آں مہربان میشود خیال کنند کہ آں مہربان بطور خانگی کاغذ نزد ایں جانب فرستادند و بدون ایں کہ از رائے ایں جانب مطلع شوند روبکار محکمہ مدارالمہام را بازیچہ طفلاں گفتند و بہ مدارالمہام ہماں طور نوشتند آیا آں مہربان نمی دانند کہ ہیچ روبکارات بلکہ کل روبکارات بدونِ ملاحظہ ایں جانب اجرا نمی شوند۔

آیا ایں جواب سخت تر از عبارت روبکار معتمد کہ بہ حسب اصلاح ایں

جانب اجرا شدہ بود نہ بودہ است - خیر

این جانب بخوبی می داند کہ کار ایں جانب فہمائش و براہ راست آوردن کارگزاراں است نہ تکرار و جنگجوئی - باقی حالات بالمشافہ خواہم فہمانید -

۱۰ - ۹ - ۹۴ - س - م

مکرر جواب امروزی فرستادم چوں کہ از قلم سرائی شب گذشتہ نوشتہ بودم و آں آں قدر گنجان بود کہ خواندن آن دشواری داشت امروز بر آن از سیاہی نوشتہ تحریر قلم سرائی را حک کنایندہ فرستادم

س م

اس زمانہ میں اعلیٰ حضرت نظام الملک آصف جاہ سادس کی نابالغی کی وجہ سے عنان حکومت سر سالار جنگ اول کے ہاتھ میں تھی لیکن ان کے اور سر رچرڈ میڈ رزیڈنٹ کے تعلقات خراب تھے امیر کبیر نواب رشید الدین خاں کو سر سالار جنگ کی مرضی کے برخلاف شریک انتظام کر دیا گیا تھا اور بقول سر اسٹوارٹ بیلی کے سی ایس - آئی "سر رچرڈ میڈ کا سر سالار جنگ کے برخلاف امیر کبیر سے مل جانا بہت افسوسناک ہوا اور گورنمنٹ ہند کو اس وجہ سے بہت سے ناگفتہ بہ کام کرنا پڑے"

اسی حالت میں رزیڈنٹ اور وہ دونوں اسی فکر میں رہتے تھے کہ شریک ایجنٹ کو جس طرح ممکن ہو اپنا ممنون و طرفدار بنا کے رکھیں -

نواب بشیر الدولہ (سر آسمان جاہ) صدر المہام عدالت اور امیر کبیر ثانی جو ایک ہی خاندان کے ارکان تھے خانگی نزاعات اور حقوق و مرتبہ کے متعلق تنازعات تھے نواب بشیر الدولہ (سر آسمان جاہ) پر مولوی مشتاق حسین کا خاص اثر تھا اور وہ ان پر بے انتہا اعتماد کرتے تھے ان تنازعات میں سر سالار جنگ ان ہی کے ذریعہ سے

لے بنسل ۵۲ آصف جاہ ثانی کے نواسے تھے سالار جنگ کی قوت ضعیف کرنے کے لئے شریک مدار المہام

سر آسمان جاہ کو کچھ پیغامات بھیجتے اور وہی جوابات بھی لاتے اور اس طرح ایک خانگی معاملہ سے ان کا تعلق پیدا ہو گیا۔ اس تعلق میں بھی ایک نہایت نازک موقع پیش آیا جو خود مولوی مشتاق حسین کی عبارت میں یہ ہے کہ :۔

ایک دفعہ نواب سر سالار جنگ مرحوم نے فدوی سے فرمایا کہ تم بشیر الدولہ بہادر سے جا کر کہو کہ میں اور نواب رشید الدین خاں میرے شریک جو فیصلہ آپ کے معاملات کا کر دیں گے گورنمنٹ آف انڈیا اس میں دخل نہیں دے سکتی فدوی نے جواب میں عرض کیا کہ "بہت خوب" لیکن نواب بشیر الدولہ بہادر کی عادت ہے کہ فدوی سے فدوی کی رائے بھی دریافت کیا کرتے ہیں لیکن اس موقع پر بھی اگر انہوں نے رائے دریافت کی تو فدوی کیا عرض کرے؟ نواب سر سالار جنگ بہادر نے فرمایا کہ "تم اپنی یہی رائے بیان کرنا" میں نے عرض کیا کہ "میری یہ رائے ہی نہیں" نواب صاحب نے فرمایا کہ پھر تمہاری کیا رائے ہے" میں نے عرض کیا کہ "آپ کا یہ ارشاد اس وقت ٹھیک ہو سکتا تھا جب کہ عنانِ حکومت خود والیٔ ملک کے ہاتھ میں ہوتی اور آج تو گورنمنٹ آف انڈیا اپنے آپ کو اعلیٰ درجہ کا ولی اور محافظ قرار دے کر سب کچھ دخل دے سکتی ہے" یہ سن کر نواب صاحب نے فرمایا کہ "ہم دونوں گورنمنٹ آف انڈیا کو اس کا موقع اور پاور ہی نہ دیں گے تو وہ دخل کس طرح دے گی" میں نے عرض کیا کہ اس کی پاور اس کی گرجتی ہوئی توپوں اور چمکتی ہوئی سنگینوں سے ہے نہ کہ مدار المہام اور شریک المہام کی منظوری سے جس نے خاص بڑودہ کی سلطنت میں مہاراجہ بڑودہ پر فوجداری کے الزام کی تحقیقات کے لئے کمیشن قایم کر دیا۔ کیا آپ اس کو اس سے روک سکیں گے کہ وہ آپ کے بعض امرار ریاست کی فریاد کو

نہ سنے جو صرف یہ کہہ رہے ہیں کہ" ہمارے اوپر ہمارے چچا جو شریک مدارالمہام ہیں ظلم کر رہے ہیں اور مدارالمہام ان کی خاطر سے ہماری داد نہیں دیتے اور ہمارے بادشاہ کے ہاتھ میں جو کہ ہمارے مالک ہیں اس وقت اختیار نہیں ہے"

فدوی کے اس جواب کو سُن کر سرسالار جنگ مرحوم نے فرمایا کہ" اب معلوم ہوا کہ آپ ہی باہم صلح نہیں ہونے دیتے" فدوی یہ سن کر خاموش چلا آیا اور اسی گھنٹہ میں اپنی خدمت سے استعفا لکھ کر مرحوم و مغفور کی خدمت میں بھیجدیا۔ اس کاغذ کو پڑھ کر نواب صاحب نے فدوی کو یاد فرمایا اور جب میں وہاں پہنچا تو اول مہدی علی صاحب نے اور ان کے بعد نواب مکرم الدولہ بہادر نے جہاں تک ان سے ممکن تھا فدوی کو سمجھایا کہ فدوی اپنا استعفےٰ واپس لے۔ اور جب یہ دونوں کوششیں بے سود ثابت ہوئیں تو نواب سرسالار جنگ مرحوم نے فدوی کو خود اپنے سامنے بلایا اور مجھ سے فرمایا کہ" جو کچھ مولوی مہدی علی اور مکرم الدولہ نے تم سے کہا وہ انہوں نے میرا کہا ہوا نہیں کہا یہ انکی اپنی رائے تھی میں نے تم کو کچھ اور ہی کہنے کو بلایا ہے اور وہ یہ ہے کہ جو کچھ اُس وقت میں نے تم سے کہا وہ میری غلطی تھی مجھے کوئی حق نہیں تھا جو میں تم سے کہتا کہ جو کچھ تمہاری رائے نہ ہو اس کو تم اپنی رائے کے طور پر بیان کرو اور میں اب تم سے اپنی خطا کا اعتراف کرتا ہوں" اس وقت فدوی پر ایک رِقّت کا عالم طاری ہو گیا جس کے اثر سے نواب صاحب مرحوم خود بھی اس وقت محفوظ نہ رہ سکے اور جس محبت و نوازش کا اظہار اس وقت مرحوم و موصوف کی طرف سے ہوا وہ کبھی میرے دل سے محو ہونے والا نہیں ہے اور جب وہ وقت یاد آجاتا ہے تو بے اختیار ان کی مغفرت کے لئے دعا نکلتی ہے"

چند روزہ معزولی - اس زمانہ میں بدقسمتی سے جو تنازعہ کہ ان ہر دو جلیل القدر امرائے پائگاہ میں تھا اور جو مخلصانہ تعلقات مولوی مشتاق حسین کے نواب بشیر الدولہ سر آسمان جاہ سے تھے اس کے لحاظ سے بعض اشخاص امیر کبیر کو ان کی طرف سے مشتعل کرتے رہتے تھے -

اس لئے امیر کبیر کی یہ خواہش ہوئی کہ ان کو اس خدمت سے علحدہ کر دیا جائے تاکہ نواب بشیر الدولہ کو امداد نہ مل سکے - سر رچرڈ میڈ نے امیر کبیر کی تائید کی - لیکن سر سالار جنگ اس کو ٹالتے رہے اسی دوران میں مولوی مشتاق حسین کی ترقی ہوئی اور وہ بحصول رخصت وطن آئے راستہ میں کرنل ٹوئڈی ریزیڈنٹ گوالیار سے ملاقات کی جو نواب بشیر الدولہ کے خاص احباب میں تھے اور حیدرآباد میں ریزیڈنٹ کے فرسٹ اسسٹنٹ رہ چکے تھے - اس ملاقات کی اطلاع کسی طرح امیر کبیر اور سر رچرڈ میڈ کو مل گئی اور دونوں نے دوبارہ مولوی مشتاق حسین کی علحدگی کا سر سالار جنگ پر تقاضہ کیا اور یہاں تک زور دیا کہ آئندہ ان میں اور سر سالار جنگ میں باہم تعلقات کا دوستانہ عالت میں رہنا صرف اس برخاستگی پر منحصر ہے -

سر سالار جنگ سے مراسلت زمانہ رخصت میں ہی مولوی مشتاق حسین کو ان واقعات کی اطلاع پہنچی تو انہوں نے سر سالار جنگ کو لکھا کہ :-

میں نہیں چاہتا کہ مشتاق حسین وہ شخص قرار پائے جس پر مدار المہام اور رائج شریک ایجنٹ کی باہم نا اتفاقی کی بنیاد قایم ہو اور ریاست کے کاروبار میں خلل آئے - آپ بے تامل اس وقت شریک مدار المہام کی خواہش پوری کر دیجئے - اور مجھ کو اس سے کچھ رنج نہ ہوگا بلکہ خوشی ہوگی کیونکہ میں سمجھونگا کہ یہ بھی مجھ سے اپنی سرکار کی عمدہ خدمت ادا ہوئی "

چنانچہ وہ معزول کئے گئے لیکن جو حکم جاری ہوا اس میں اس واقعہ کے متعلق ایک ایسی الزامی شکل قایم کی گئی جس سے ان کی پوزیشن پر بہت بُرا اثر پڑتا تھا اس لئے نہ صرف ان کو بلکہ سرسید اور مولوی سیدؔ مہدی علی (محسن الملک) کو بھی سخت رنج ہوا اور ان دونوں کے مشورہ سے یہ طے پایا کہ اس الزام کے متعلق تحقیقات کی استدعا کی جائے چنانچہ سرسید نے اپنے خط کے ساتھ ایک درخواست مولوی سید مہدی علی کی وساطت سے بھیجی مگر امیر کبیر اور ریزیڈنٹ نے جو فضا قایم کر دی تھی اس کے لحاظ سے اس پر کوئی کارروائی مناسب نہ سمجھی گئی اور سالار جنگ نے بالواسطہ ہی یہ جواب دیا کہ :-

"در اطمینان مولوی مشتاق حسین سعی فرمایند۔ مولوی صاحب اگر این جا می بودند و بذاتِ خود بر حالات این جا واقف می شدند۔ شکے نہ دارم کہ از کارروائی این جانب بکلّی اتفاق می نمودند چونکہ مولوی صاحب شایقِ بہتریِ تمام قومِ خود ہستند دریں امر خلاف نخواہند نمود کہ حفاظتِ فوائد عام را بر فائدہ یا فوائد خاص ترجیح است"

اس کے بعد ملک کی موجودہ حالت کو ایک بچہ سے تشبیہ دے کر اور موسمی تغیرات کے اثر سے اس کو محفوظ رکھنے اور اس کے مربی کی ہوشمندی اور تجربہ کاری وغیرہ کو تلمیح و استعارہ میں بیان کرکے بہت کچھ اطمینان دلا دیا۔

خدا کی رحمت پر توکل یہ زمانہ اگرچہ ان کے لئے ایک دورِ ابتلا تھا اور ان کی زندگی کے مستقبل پر گہری تاریکی چھائی ہوئی تھی لیکن ان کو حسب معمول خدا پر توکل تھا وہ اس واقعہ کو جس نظر سے دیکھتے تھے اور خدا کی رحمت پر ان کو جو بھروسہ تھا اس کا اندازہ ان کے ایک خط سے ہوتا ہے جو ایک بزرگ کو اسی زمانہ میں تحریر کیا تھا جس میں وہ لکھتے ہیں کہ :-

"حضرت نے جو ایما فرمایا ہے کہ میں اپنے دل سے اس بات کو نکال ڈالوں جو میرے دل میں ہے یعنی میں اس نفرت کو دور کر دوں جو میرے دل میں اس نوکری کی نسبت ہے۔ درحقیقت بارہا میرے دل میں یہ خیال گذرا تھا کہ نہایت ناانصافی کی بات ہے کہ اس طور سے میں بلا قصور برخاست کیا گیا اور میں خیال کرتا تھا کہ اس کارروائی سے میری ایک قسم کی رسوائی ہوئی اور اب غیرت وحمیّت نہیں چاہتی کہ پھر وہاں جانے کا قصد کیا جائے اب حضرت نے اپنے کشف سے یہ ارشاد فرمایا ہے کہ اس خیال کے ترک کر دینے میں کوئی بے عزتی کی بات نہیں ہے جو نفرت اور کراہت میرے دل میں پیدا ہوئی تھی وہ ایک طبعی بات تھی میں نے اپنا کام جس محنت اور دیانت سے کیا تھا اُس کو خدا ہی خوب جانتا ہے میں نے نوکروں کے سے فرائض ادا نہیں کئے تھے بلکہ یہ سمجھ کر کام کیا تھا کہ ایک اسلامی ریاست ہے (جس کو خدا قائم رکھے) پس جہاں تک ہوسکے اس کی خدمت کرنا چاہئے جو عین اسلام کی خدمت تھی، بااین ہمہ یہ سلوک جو میرے ساتھ ہوا وہ مجھ کو نہایت ناگوار تھا اور بے شبہ میں اس کو اپنی عزت اور غیرت کے بالکل منافی سمجھتا تھا۔ مگر یہ میری غلطی تھی کہ خدا کے کام کی جزا کا امیدوار میں بندوں سے ہوا اور دوسری غلطی یہ ہے کہ میں نے اس کام کو قابل جزا سمجھا کیونکہ جو کچھ خدا نے مجھ کو دیا میں اس کا لاکھواں بلکہ کروڑواں حصہ بھی کوئی کام نہیں کرسکا اور نہ کرسکتا ہوں، لیکن اب حضرت کے الہامی ارشاد سے کہ کوئی بے عزتی کی بات نہیں ہے میں نے اپنے دل سے اس خیال کو بالکل نکال ڈالا تاہم اس قدر کو تو حضرت بھی غالباً منع نہ فرمائیں گے کہ جب کوئی موقع آجاوے تو بہ رسم شکایت کچھ کہا جاوے کیونکہ اگر میں یہ وعدہ بھی کروں کہ ایسی شکایت میں کبھی نہ کروں گا تو مجھ کو نہایت خوف ہے کہ میں

اس وعدہ کو پورا کرسکوں گا یا نہیں اور یقین ہے کہ حضرت بھی اس نفرت میں جو اپنے کام پر حاضر ہونے میں تھی اور اس شکایت میں جو فرق ہے اس کو تسلیم فرمائیں گے اور اس طبعی نفرت کا دور ہوجانا اس وقت کی ضرورت کے واسطے کافی ہوگا۔

مجھ کو چوں کہ خود ایک قسم کا رنج اور بیزاری اس معاملہ میں تھی اس لئے میں خود کوئی خارجی سعی اس باب میں نہیں کرتا تھا بجز اس کے کہ اس معاملہ کو میں نے اپنے خدا کے سپرد کر دیا تھا جو اب بھی اس کے سپرد ہے۔

. . . . دنیا میں مختلف قسم کی قسمتوں کے لوگ ہوتے ہیں میں اس وقت تک بہ عنایت الٰہی اُن میں ہوں جن پر ہمیشہ خدا کی مہربانی رہتی ہے ابتدا سے اور اس وقت تک جس قدر معاملات میرے خدا نے میرے ساتھ کئے وہ سب اس کے رحم اور فضل و کرم پر شامل تھے جو باتیں بعض وقت طبیعت کو ناگوار بھی معلوم ہوئیں وہ آخر الامر مفید ثابت ہوئیں میری لیاقت سے ہزاروں لاکھوں حصہ زیادہ اس نے مجھ کو دیا اور میری نالائق حرکتوں سے قطع نظر کرکے ہمیشہ مجھ کو اپنے رحم میں شامل رکھا اس وقت کو بھی جب کہ میں ایک بڑے عہدے سے موقوف ہوگیا ہوں نہایت خلوص دل سے میں اس مہربانی اور رحم میں سمجھ رہا ہوں اور اس کو خدا کا ایک فعل سمجھ رہا ہوں نہایت پُر حکمت۔

اسی وقت اس کی نظیر میرے ذہن میں یہ گذری ہے کہ میری یہ ظاہر حالت اس گھٹا سے مشابہ ہے کہ جس میں بارانِ رحمت بھرا ہوتا ہے اور برستا ہے۔ میں بلا مبالغہ کہتا ہوں کہ اس خدائی حکمت اور ربّانی رحمت کے آثار اس وقت بھی اس قدر جھلک رہے ہیں کہ میں ان کو اپنی انہیں دو آنکھوں سے بھی

متواتر دیکھ رہا ہوں اور جو کچھ کہ آیندہ ہونے والا ہے اس کا تو خدا ہی کو علم ہے"

سر سالار جنگ کی خوشنودی اور ترتیب قواعد و ضوابط۔

اس زمانۂ بے کاری میں مولوی مشتاق حسین مالی مشکلات میں مبتلا ہوگئے تو اب بشیر الدولہ نے مختلف طریقوں سے با صرار امداد کرنی چاہی لیکن انہوں نے قبول کرنے سے صاف انکار کر دیا۔ سر سالار جنگ کو جب ان واقعات کی اطلاع ہوئی تو انہوں نے ایک خط میں جو کچھ لکھا اس میں ایک فقرہ یہ بھی تھا کہ "ہمہ را دیدم و خوش شدم کہ از شرفا غیر از آنچہ از مولوی مشتاق حسین عمل شد دیگر نمی تواند شد و امید است کہ روزے بیاید کہ ایشاں نتیجۂ عمل خود را حاصل کنند" ساتھ ہی جب تک کوئی دوسرا انتظام ہو چار سو روپیہ ماہانہ اپنے پاس سے مقرر کئے مگر مولوی مشتاق حسین نے اس رقم کو اپنی ضرورت سے زیادہ تصور کر کے کم کرنے کی درخواست کی اور وہ بھی اس شرط کے ساتھ کہ یہ جو کچھ امداد ہو بطور قرض متصور ہو لیکن اس کی نوبت نہیں آئی اور سکریٹ سروس فنڈ سے چار سو روپیہ ماہانہ مقرر کر دیا گیا۔ سر سالار جنگ کی ہدایت سے اس دوران میں انہوں نے سررشتہ مال کے قواعد و ضوابط کی ترتیب اور عدالت دیوانی سے صیغہ مال کے کام کو علیحدہ کرنے کے متعلق گشتیوں ہدایتوں اور مسودۂ قانون مالگزاری کو مرتب کیا اور تہذیب و ترتیب دفاتر کے دستور العمل پر نظر ثانی کی۔

علی گڑھ کے قیام میں کالج کے بورڈنگ ہاؤس کی نگرانی

حیدرآباد جانے کے بعد اگرچہ وہاں کے سرکاری فرائض کا سخت بار تھا لیکن جس عمارت کی بنیاد بھرنے میں انہوں نے نو دس سال تک کام کیا تھا اپنے فرائض کی گراں باری کے باوجود اس کے تعمیری کاموں میں معاون و مشیر رہے اب کہ علی گڑھ میں اتفاقیہ قیام کا موقع ملا تو بہت زیادہ وقت کالج کے کاموں میں صرف کیا اور جب بورڈنگ ہاؤس کا انتظام اور

طلبا کی تربیت اخلاق کی نگرانی خاص طور پر ان کے سپرد ہوئی تو بورڈنگ میں سکونت اختیار کرلی۔ بورڈروں کے ساتھ اُن کی شفقت اور محبت، ان کے آرام اور راحت کا لحاظ اور اُن کی اخلاقی تربیت و اصلاح کے طریقے اس زمانہ کے طلبار میں ابھی تک زبان زد ہیں اور بطور روایت کے بیان کئے جاتے ہیں۔

وہ زجر و سرزنش کو سزا کا آخری درجہ سمجھتے تھے۔ چھوٹے چھوٹے قصوروں سے بظاہر چشم پوشی کرجاتے لیکن کسی نہ کسی موقع پر قصوروار کو اُس کے قصور سے اس طرح آگاہ کرتے کہ وہ خود اپنے ضمیر سے تنبیہ حاصل کرلیتا۔ اکثر و بیشتر قصوروں کے موقعہ پر طلبار کے جذبات غیرت اور حمیّتِ نفس کو اس طرح متحرک کردیتے کہ وہ آئندہ کے لئے تائب و محترز ہوجاتے۔ راتوں کو نگرانی بہت سخت تھی اور انہوں نے وقت پر سوتے اور وقت پر جاگنے کا عادی بنانے میں زیادہ توجہ کی تاکہ راتوں کے اطمینان میں طلبار لہو و لعب میں وقت گذار کر اپنی صحت خراب نہ کرلیں۔

طلبار کے ساتھ اُن کی شفقت بالکل ایسی ہی تھی جیسی اپنی اولاد کے ساتھ ہوتی ہے وہ اُن کی تکالیف سے سخت متاثر ہوجاتے تھے۔ ۱۸۸۲ء میں جب تعلیمی کمیشن کے سامنے انہوں نے اپنی شہادت پیش کی ہے تو عام تعلیمی مسائل پر بحث کرتے ہوئے امتحان کی سختیوں کے ساتھ زمانۂ امتحان پر جو موسم بارش گذرتے ہی شروع ہوجاتا تھا کمیشن کو توجہ دلائی اور بارش کی اُمس میں طلبار جس طرح تیاری امتحان کے لئے تکالیف برداشت کرتے تھے اس کو نہایت موثر طور پر بیان کیا۔

اخلاقِ اسلامی اور اعمال مذہب کی پابندی کے متعلق البتہ تشدد کو جائز رکھتے تھے۔ لیکن اس کی شاذ ہی نوبت پہنچتی تھی۔ قصوروں پر سزائے بدنی کے متعلق ان کے اور سرسید کے مابین سخت اختلاف تھا اور جب تک وہ نگراں رہے انہوں نے اس طریقہ کو جاری نہیں ہونے دیا۔ وہ سزا سے زیادہ ملامت کو موثر سمجھتے تھے وقتاً فوقتاً

حسب موقع وضرورت طلبار کے سامنے تقریریں بھی کرتے تھے جس کا زیادہ تر موضوع تربیت اخلاق اور پابندی احکام مذہب ہوتا۔ بورڈنگ ہاؤس کے متعلق جب کوئی متعصب معترض کوئی غلط فہمی پھیلانے والا مضمون اخباروں میں لکھتا تو اس کے جوابات بھی شائع کرتے رہتے تھے۔ غرض جب تک وہ حیدرآباد واپس نہیں گئے کالج اور بورڈنگ ہاؤس کے کاموں میں مصروف رہے۔ اس کے علاوہ مضامین نویسی کا سلسلہ بھی جاری تھا۔

اسی دوران میں حاجی اسمٰعیل خاں صاحب مرحوم رئیس دتاؤلی نے سرسید کے احسانات کے اعتراف میں ان کی یادگار قایم کرنے کی تحریک پیش کی تو مولوی مشتاق حسین نے نہایت دلچسپی اور شغف کے ساتھ اس کی تائید میں اپلیں شائع کیں اور جو کمیٹی فراہمی چندہ کے لئے قایم ہوئی اس میں سکرٹری کی حیثیت سے کام کیا۔

بحالی اور ترقی

ساڑھے تین برس میں بہت سے انقلابات ہوئے امیر کبیر کا انتقال ہوگیا اور سررچرڈ میڈ تبدیل ہوگئے سرسالارجنگ نے اول ہی موقع پر مشتاق حسین کو طلب کیا اور باضابطہ حکم جاری کرنے کے بجائے اپنے قلم خاص سے حسب ذیل خط اُن کے نام بھیجا :-

عدالت پناہ بوجوہ ماسبانے کہ رسیدن آن مہربان برائے چندے مناسب نبود بہ سببِ شدن فیصلۂ مقدمہ نواب بشیرالدولہ بہادر مرفوع شدہ وانتظام جدیدہ درپیش است و آن مہربان رکن مجلس عدالت کہ بہ طرزِ انتظام جدید عنقریب خواہد شد قرار خواہند یافت نظر برآں بہ خوشنودی تمام نوشتہ می شود کہ بمجردِ رسیدنِ حکم ہذا روانہ شدہ دریں جا برسند کہ در بندوبستِ عالیہ ازاں عدالت پناہ بہ سببِ تجربۂ سابقہ فائدہ حاصل خواہد شد۔ زیادہ چہ بقلم آید۔

المرقوم بست و ہفتم جمادی الاول ۱۲۹۹ھ

سالار جنگ

اس حکم کو پانے کے بعد مولوی مشتاق حسین فوراً روانہ ہوگئے لیکن بجائے رکن مجلس عدالت کے اپنے پہلے عہدہ پر مامور کئے گئے اور پھر چند ہی دن بعد گلبرگہ کے صدر تعلقدار مقرر ہوئے مگر اسی مہینہ میں سالار جنگ نے اپنا خاص معتمد عدالت وکوتوالی مقرر کرکے واپس بلا لیا اب وہ وقت آیا تھا کہ ان کی تمام اصلاحات بروئے کار آئیں لیکن بقول صاحب بستان آصفیہ[51] نواب صاحب سرسالار جنگ مرحوم نے صیغۂ عدالت کے ریفارم کی طرف مولوی مشتاق حسین کی معتمدی کے زمانہ میں خاص توجہ فرمائی مگر قبل اس کے کہ اس کا پورا انتظام ہوا تھا ہو نئے انتقال فرمایا

سرسالار جنگ کا انتقال

نواب مختار الملک سرسالار جنگ میر تراب علی خاں کامل تیس سال تک بڑے انہماک سعی وکوشش اور قابلیت وتدبر کے ساتھ جس میں پورا جوش وجذبہ کار فرما تھا ملک کے ہر صیغہ کی اصلاحات میں مصروف رہے اور اب صرف ایک ہی سال باقی تھا کہ اپنے مالک اور خداوند نعمت نظام الملک آصفجاہ سادس میر محبوب علی خاں کو تخت دکن پر پورے اختیار واقتدار کے ساتھ حکمراں دیکھیں کہ دفعتاً ۲۹ ربیع الاول ۱۳۰۰ھ (۸ فروری ۱۸۸۳ء) کی شام کے وقت ہیضہ سے ۵۶ سال کی عمر میں انہوں نے رحلت کی۔

اس سانحہ پر آنکھوں کے آنسو بھی خشک نہ ہوئے تھے کہ بلدہ میں وزارت کے امیدواروں کی متعدد پارٹیاں بن گئیں ایک پارٹی سرسالار جنگ کے آوردگان خاص کی تھی جس کے ارکان سب سے زیادہ قابل اور ممتاز تھے یہ پارٹی ان کے فرزند اکبر میر لائق علی خاں کی وزارت کے لئے ساعی تھی۔ اور مولوی مشتاق حسین بھی اسی پارٹی[52] ایا کے

---

[51] - مانک راؤ وٹھل متعدد کتابوں کے ایک قابل مصنف ہیں انہوں نے کئی جلدوں میں سلطنت آصفیہ کے مکمل حالات لکھے ہیں جن میں نظم ونسق ملکی کی بھی مفصل تاریخ ہے اور تمام تر سرکاری کاغذات سے ماخوذ ہے۔

[52] اس موقع پر نواب محسن الملک مرحوم نے کارنمایاں کیا تھا (ملاحظہ ہو تذکرہ محسن)

ایک رُکن تھے انہوں نے اپنے عہدے کے لحاظ سے آیند انتظام حکومت کے متعلق پہلے ہفتہ کے اندر ایک مفصل یادداشت مرتب کر کے ریزیڈنسی میں پیش کی جس میں سرسالار جنگ کے زمانہ کی ترقی وغیرہ کا تذکرہ کر کے ان اصلاحات کی طرف توجہ دلائی جو مرحوم کے پیش نظر تھیں یا جن کی موجودہ حالات کے لحاظ سے اہم ضرورت تھی اور آخر میں آیند گورنمنٹ کی تشکیل کے متعلق یہ رائے ظاہر کی کہ :-

ایک ایسی گورنمنٹ ہونی چاہئے جو گذشتہ گورنمنٹ کے ساتھ پوری ہمدردی کرتی ہو اور ملک کا بھی اس کے اوپر اسی قسم کا اعتبار ہو جیسا کہ ہز ایکسیلنسی نواب مرحوم کی گورنمنٹ کی نسبت تھا اور مجھ کو ناگزیر یہ کہنا پڑتا ہے کہ نواب صاحب مرحوم کے فرزند اس گورنمنٹ میں شریک کئے جاویں جن کے ساتھ آج اس ملک میں فی صدی پچانوے اشخاص سے بھی زیادہ ہمدردی کرتے ہیں اور ہر ایک شخص کے دل میں گو کہ وہ بلحاظ اپنے مرتبہ اور درجہ کے کتنا ہی بڑا کیوں نہ ہو ان کی موروثی عظمت و وقعت اور ان کا خاندانی لحاظ اور پاس سمایا ہوا ہے اور جن کے چال چلن اور اخلاق کی نسبت کسی شخص نے اس وقت تک یقیناً کوئی اعتراض نہیں کیا ہے اور ایسے باپ کے ہونہار بیٹے ہیں جس نے نہایت ایمانداری، اور قابلیت اور اخلاق اور علم اور ہمت اور استقلال کے ساتھ اپنی تمام عزیز عمر ملک اور اہل ملک اور فرماں روائے ملک کی بیش بہا خدمات میں صرف کر دی اور اپنی ذات کے واسطے بجز اس مسلّم نیک نامی کے جس کا آج ہر فرد و بشر اور ہر فریق مداح ہے اور سوائے ایک نہایت بھاری بوجھ قرضہ کے اور کچھ نہیں چھوڑا اگر مجھ کو اس باب میں تردد نہ ہوتا کہ آیا ایک ایسی یادداشت میں جو میں لکھ رہا ہوں نواب مرحوم کے خانگی حالات کا ذکر کرنا جن سے مجھ کو بھی ذاتی واقفیت ہے مناسب ہے یا نہیں تو میں اس موقع پر ایک ایسی تصویر کھینچ سکتا تھا جس کے

دیکھنے سے بے اختیار آنسو نکل پڑیں مگر اس قدر کہنے کی تاہم معافی چاہتا ہوں
کہ یہ جو کچھ ہوا سب اس وجہ سے ہوا کہ مرحوم کو اپنے آقا اور ملک اور اہل ملک
کی خدمت گذاری میں اپنے ذاتی کاروبار کی درستی کے لئے مطلق مہلت نہ ملی
اور رعایت درجہ دیانت داری سے انھوں نے بہت سے ایسے مصارف کو اپنی
ذات پر عائد کیا جن کو وہ واجبی اور انصاف کی راہ سے اپنی گورنمنٹ پر عائد
کر سکتے تھے بہر حال جو کچھ ہوا اس وقت ان امور کے تذکرہ سے صرف یہ مطلب تھا
کہ برٹش گورنمنٹ بھی غالباً ایک ایسے باپ کے بیٹوں کے ساتھ ویسی ہی ہمدردی
کرے گی جیسے کہ خود ملک ان کی ہمدردی کر رہا ہے مجھ کو مرحوم کے جنازہ کی ہمراہی
اور سویم کی فاتحہ خوانی میں شامل ہونے کی عزت حاصل تھی میں بیان نہیں کر سکتا کہ
ان مواقع پر شہر والوں نے ان کے ساتھ کس قدر گہری ہمدردی ظاہر کی ہے۔
میرا یہ مطلب نہیں ہے اور نہ کسی شخص کا جو کہ ملک اور گورنمنٹ کے ساتھ
سچی ہمدردی رکھتا ہو اس میں یہ مطلب ہو سکتا ہے کہ مرحوم کے کسی فرزند کو ان کے
باپ کے پورے اقتدارات بلا شرکتِ غیرے فوراً دے دیئے جائیں گو کہ اس قدر
تجربہ اور واقفیت کے لحاظ سے جو مجھ کو اس باب میں ہے ۔میں اس باب میں کوئی
شک نہیں کر سکتا کہ چند عرصہ کے بعد وہ اس ریاست میں ایک ایسے قابل شخص
پائے جاویں گے جو ہر طرح اس عہدے کے قابل ہوں ۔اس وقت جو کچھ مناسب معلوم
ہوتا ہے وہ یہ ہے کہ بڑے فرزند نواب میر لائق علی خاں بہادر منصرم مدار المہام
مقرر کئے جاویں اور ان کے ساتھ ایسے چند امرا جو باعتبار اپنے مرتبہ اور تجربہ
کے بڑی ذمہ داری کے لائق ہوں اور سابق کی گورنمنٹ کے کاموں اور
انتظاموں کے ساتھ ان کو ایک نوع ہمدردی ہو اس وقت تک کے واسطے شریک
کئے جاویں جب تک کہ حضرت بندگان عالی متعالی عنانِ حکومت خود اپنے یدِ قدرت

میں لے لیں"

اس کے بعد اس کی تفصیلات پر بحث کر کے تحریر کیا کہ :-

"اور اس طرح پر نواب میر لائق علی خاں بہادر کو ہر ایک کام میں پوری قابلیت حاصل اور ظاہر کرنے کا بتدریج موقعہ مل جائے گا اور وہ اپنے آپ کو اس امر کے قابل ثابت کرسکیں گے کہ آیندہ تنہا وہ اس کام کے انجام دینے کی جو ان کے عہدے کے لئے مناسب ہے کافی قابلیت رکھتے ہیں اور اس وقت حضور پر نور کو آسانی کے ساتھ یہ موقع حاصل ہوگا کہ ان کی قابلیت اور تجربہ کے لحاظ سے ان کے ساتھ مسلوک ہوں۔

پھر نواب میر سعادت علی خاں کی نسبت جو مرحوم کے دوسرے فرزند تھے یہ مشورہ دیکر کہ ان کو بھی کوئی بڑا عہدہ تجربہ کے لئے سپرد کیا جائے۔ اپنے عہدے کے صیغوں کے لحاظ سے عامہ رعایا کے رجحانات وخیالات پر جو آگاہی تھی اس کو بیان کیا اور آخر میں اس امر پر توجہ دلائی کہ :-

اس کے لحاظ سے آخر میں پھر اس بات کے بیان کرنے کی معافی چاہتا ہوں کہ نواب مدار المہام مرحوم کے فرزندوں کی سرفرازی علے العموم خوشی اور اطمینان کا موجب ہوگی اور تمام ملک جس سے میری مراد فی صدی ۹۵ مردم شماری سے بھی زیادہ کی ہے برٹش گورنمنٹ کا بدل ممنون اور اس کے انصاف کا بدل معترف ہوگا اور اس کے ذریعہ سے برٹش گورنمنٹ ایک ایسی گورنمنٹ قایم کرنے پر قادر ہوسکے گی جو خواہ اس ریاست کے قدیم آئین اور رواج کے اور خواہ بلحاظ ملک کی موجودہ حالت اور اہل ملک کی عام طبائع کے اور خواہ بلحاظ ان ضرورتوں کے جو گورنمنٹ کو انجام دینی ہوں گی ہر ایک گورنمنٹ سے جس پر اس وقت خیال اور ذہن منتقل ہوسکتا

ہے بہتر ہوگی "

لیکن لارڈ رپن کی گورنمنٹ نے دو ہفتہ کے اندر ہی اعلیٰ حضرت کی تخت نشینی کے زمانہ تک ایک کونسل آف ریجنسی قایم کردی جس کے صدر بہ نفس نفیس اعلیٰ حضرت اور ممبروں میں چند امرا نامزد کئے گئے اور مدار المہامی کے اختیارات مشترکاً راجہ نرپندر پرشاد اور نواب میر لائق علی کو تفویض کئے۔

مولوی مشتاق حسین کی نسبت بدظنی پھیلانے کی کوشش

اب ریزیڈنسی، ایوان شاہی اور مشترک وزارت کے ارکان اُمیدوں اور تمناؤں کے محور و مرکز تھے یہ زمانہ اعلیٰ عہدہ داروں کے لئے بڑے نازک امتحان کا تھا لیکن مولوی مشتاق حسین کو نہ تو عہدہ کی فکر تھی اور نہ ان کے دل میں ایک بہتر گورنمنٹ کی تشکیل کے سوا کوئی اور امید جاگزیں تھی چونکہ میر لائق علی خاں کی وزارت بہت زیادہ متیقن تھی اس لئے بعض اطراف سے کوشش کی گئی کہ اُن کو مولوی مشتاق حسین کی طرف سے بدظن کردیا جائے تاکہ وزارت کے ایک اہم صیغہ پر ایک خاص پارٹی کا قبضہ ہوسکے۔ چنانچہ بلا تاخیر بدظنی شروع کرائی گئی جس کا اثر بھی محسوس ہونے لگا ایک دن اتفاقیہ دونوں کے مابین باتوں میں تذکرہ آگیا اور ایک گونہ صفائی بھی ہوگئی

ایک اہم خط

لیکن مولوی مشتاق حسین نے دوسرے دن نواب میر لائق علی خاں کو ایک خط لکھا جس میں ان واقعات کا اعادہ کرکے تحریر کیا کہ :-

" سرکار از کمالِ امارت وغایتِ صفائے باطن صاف صاف ومکرر ارشاد فرمودہ اند کہ از وابستگانِ دامنِ دولت، ہر کہ بہ خلوصِ باطن پیش آید باید کہ در حالتِ خود مطمئن باشد، وفدوی ہم صاف صاف عرض می نماید کہ تا آن کہ اعتبار و اعتمادِ سرکار بر عقیدت مندان راسخ باشد، وما ہم تا جاں در تن داریم بہ وفاداری و خلوص

تمام کہ خدمت مستحکم بستہ بے دریغ خود را فدائے خیرخواہی و خیرسگالی سرکار خواہیم نمود و الّا بحالتِ بے اعتمادیِ آقا اگر ملک سلیمان ہم زیرِ نگیں باشد در نگاہِ ہمو سنے ہیچ میرزد خارے بیش نیست تا بہ معتمدی چہ رسد . . . .

آقائے من مکرر معافیِ ایں عرضِ مکرر میخواہم کہ وفاداری و عقیدت مندی ہم چو ما نیازمنداں بہ کُلّی در قبضۂ اقتدارِ آقایانِ نعمت مے باشد اگر بہ اعتمادِ خداوندی پیش آیند از ملازمان ہم جز از خلوص و وفا دیگر ہیچ نہ بیند۔

بندۂ حلقہ بگوشش ار ننوازی برود
لطف کن لطف کہ بیگانہ شود حلقہ بگوش

واگر ایں چنیں نیست، و بنیاد اعتماد و اعتبار صرف بر روایت بعضے از حضور رساں باشد نہ یک روز اطمینان بکدامی ملازم میسر شدنی است و نہ یک لمحہ راحتے و آرامے با آقا . . . .

چوں از شب دریں بے اطمینانی بودم بفحوائے الا بذکر اللّٰہ تطمئن القلوب، فالے از قرآن مجید جستم ہر آنچہ یافتم قولے فیصل است از رب العزۃ و ہو ہذا:

"ویقولون طاعة فاذا برزوا من عندک بیّت طائفة منهم غیر الذی تقول والله یکتب ما یبیتون فاعرض عنهم و توکل علی الله و کفیٰ بالله وکیلا"

پورا ایک سال ایسے ہی تردد اور کشمکش میں گذرا تا آں کہ ۷ ربیع الثانی سنہ ۱۳۰۱ھ (۵ فروری سنہ ۱۸۸۴ء) کو اعلیٰ حضرت کی باضابطہ مسند نشینی عمل میں آئی اور میر لائق علی خاں عماد السلطنت سالار جنگ ثانی کے خطابات کے ساتھ منصب وزارت پر فائز ہوئے۔

ایک اہم تجویز اب مولوی مشتاق حسین نے اعلیٰ حضرت اور وزیر کی نوعمری کا جو علی الترتیب اٹھارہ اور اکیس سال کی تھی اور حیدرآباد کے خاص حالات سے جو خطرات نظر آ رہے تھے اُن کا خیال کرکے یہ تجویز پیش کی کہ حضوری اور دیوانی کی دو کونسلیں بنائی جائیں پہلی کونسل میں امرائے بلدہ اور دوسری میں معتمدین اور اعلیٰ عہدہ دار شریک کئے جائیں۔ اور یہ کونسلیں اس بات کی ضمانت ہوں گی کہ اعلیٰ حضرت

اور وزیر کی کم عمری و کم سنی انتظام ملک کے لئے مضر نہ ہو گی

رکنیت مجلس مالگذاری

لیکن اس تجویز کو ناقابل اعتنا سمجھا گیا[۱] اور جدید انتظامات کے سلسلہ میں ان کو بتاریخ دوم جمادی الاول ۱۳۰۱ھ اضافہ مشاہرہ کے ساتھ بورڈ آف ریونیو (مجلس مالگذاری) کی رکنیت پر مامور کیا گیا۔ یہ مجلس دو سال قبل قایم ہوئی تھی اور اس کے قیام کا مقصد یہ تھا کہ آراضی و مالگذاری اور اس کے متعلقات کے قوانین و ضوابط منضبط کئے جائیں۔ انہوں نے جائزہ لینے کے بعد دو ماہ تک تلنگانہ کے چند اضلاع کا دورہ کر کے مالگزاری کے ہر ایک شعبہ کا نہایت غور و تعمق کے ساتھ معائنہ کیا اُن کی بالغ نظر زیادہ تر اِن امور پر رہی جو بحق رعایا تکلیف کا باعث اور بحق حکومت نقصان کا سبب تھے۔ انہوں نے اُن طبقات رعایا سے جن کا تعلق ایسے انتظام اور مقامی پیشوں سے تھا اور عام معززین سے خلوت و جلوت میں ملاقاتیں اور گفتگوئیں کیں۔ پیمائش اور تشخیص جمع کی خرابیوں کو دیکھا اور اُن طریقوں پر غور کیا جن سے رعایا پر توبارِ عظیم پڑ جاتا تھا اور سرکاری خزانہ کو کوئی فایدہ نہ پہنچتا تھا اس طرح وہ صوبہ کے اُن تمام جزوی و کلی حالات سے واقف ہو گئے جو اصلاحات کی بنیاد ہو سکتے تھے۔ چنانچہ ان سب امور پر غور کے بعد ایک سرسری بندوبست اور آبپاشی کے مسائل درست کرنے اور ان کو رعایا کے قبضہ میں دینے کی مدلل تجاویز پیش کیں رسد اور بیگار کے نام سے جو مظالم ہوتے ہیں اُن کو نہایت موثر طریقہ سے ظاہر کر کے ان کے انسداد پر توجہ دلائی۔

یہ تجاویز وزارت میں نہایت توجہ سے دیکھی گئیں اور اکثر و بیشتر پر منظوری صادر کی گئی۔ نواب عماد السلطنت نے ان تجاویز پر جو تبصرہ کیا اس کے آخر میں لکھا کہ:۔

"مدار المہام سرکار عالی کمال تحسین کارگذاری مولوی مشتاق حسین می نمایند۔

---

[۱] ۔ اس تجویز کی قدر و قیمت بعد کے اُن افسوس ناک واقعات سے معلوم ہوتی ہے جو دو سال بعد ہی اعلیٰ حضرت اور عماد السلطنت کے مابین پیش آئے جن کے باعث دونوں جلیل القدر ہستیوں کو انتہائی ناگواریاں اور تلخیاں برداشت کرنی پڑیں اور حکومت میں ریذیڈنسی کی مداخلت تامہ ہو گئی (ملاحظہ ہو خطیب دکن برہان)

درحقیقت مولوی صاحب موصوف نہ صرف فرائضِ منصبی خود را ادا نمودند ولیاقتِ خود را ظاہر کردند بلکہ بکمالِ غور و تامل بر تمام کارروائیہائے اضلاع نظر نمودند و تا بامکان کارکثیر در مدتِ قلیل نمودند۔ بخاتمۂ کلام مدار المہام سرکارِ عالی از تہ دل اظہار شکریہ محنت مولوی مشتاق حسین صاحب می نمایند“

صوبہ داری اور خطاب

انتظامی مصالح کی بنا پر ایک سال کے اندر مجلس مالگزاری شکست ہوگئی مولوی مشتاق حسین ربیع الاول ۱۳۰۲ھ (۱۸۸۵ء) میں صوبہ شرقی کے صوبہ دار مقرر کئے گئے جس کا رقبہ ۲۰۷۰۰ مربع میل اور آبادی ۱۷۶۳۰ ،۱۷ ،۷ تھی ہنوز صوبہ کا جائزہ نہ لیا تھا کہ ربیع الثانی میں اعلیٰ حضرت کے دربار سالگرہ کی تقریب پر نواب عماد السلطنت کی سفارش اور تجویز سے ”خانی و بہادری اور انتصار جنگ“ کا خطاب عطا ہوا اور اب مولوی مشتاق حسین نواب انتصار جنگ بہادر کے لقب سے معروف و مشہور ہوئے۔

اصلاحات صوبہ

جائزہ لینے کے بعد انھوں نے سب سے پہلے چار مہینے کا ایک طویل دورہ کیا جس میں زرعی حالت پر خاص توجہ کی طبقات رعایا سے بالمشافہ گفتگوئیں کیں ان کو آزادی کے ساتھ اظہار حالات کا موقع دیا ان کی زبان سے ان کی تکلیفیں سنیں اور بعض اصلاحی امور پر جن کا تعلق مالگزاری سے تھا ان سے بحثیں کیں رعایا کے ساتھ حکام کے طرزِ عمل کا مشاہدہ کیا مفصلات میں بالخصوص ماتحت اور چھوٹے درجہ کے عہدہ دار رعایا پر جو زیادتیاں کرتے ہیں اور دوروں میں رسد اور بیگار کے نام سے ان کے جان و مال کو نقصان پہنچاتے ہیں ان سب پر عبور حاصل کر لیا۔ پٹیل و پٹواری کے کاغذات سے لے کر پولیس، عدالت ہائے انصاف، صیغہ ہائے مال اور دیگر تمام شعبوں کے دفاتر کا معائنہ کیا اور ان تکلیف دہ طریقوں پر نظر ڈالی جو وصولی مالیہ میں پیش آتی ہیں آبپاشی کے ذرائع۔ کنووں، باولیوں اور تالابوں کے متعلق تحقیقاتیں کیں۔

جہاں تک کہ اپنے حدودِ اختیارات تھے فوراً احکام نافذ کئے اور جن معاملات میں وزارت کی منظوری درکار تھی منظوریاں حاصل کیں۔ آبپاشی کے منہدم ذرائع کو درست کرنے اور جدید ذرائع مہیا کرنے کے لئے زر خطیر منظور کرایا۔

جو احکام نافذ کئے سختی کے ساتھ اُن کی تعمیل کے متعلق نگرانی کی۔ رعایا کے لئے طبی امداد کا ایک نظام قایم کرایا عہدہ داروں اور اہلکاروں کی سزا و جزا سے ایک عام رعب قایم کر دیا۔

جب سر سالار جنگ ثانی نے اپنا دورہ کیا تو ان کو موقع پر تمام ضروری اصلاح طلب امور پر توجہ دلائی وہ ان انتظامات اور تجاویز سے بہت متاثر ہوئے اور جب وہاں سے روانہ ہو رہے تھے تو ایک طولانی خط اپنے قلم خاص سے لکھا جس کا آخری جملہ یہ تھا کہ:۔

اعترافِ خدمات

بالآخر اظہار ایں معنی ضروری می شمارم کہ دریں دورۂ قلیل المدت آنچیکہ دا تفنیت از انتظام و کارگزاری آں مہربان حاصل نمودم ازاں بے انتہا خورسند شدم و امید بلکہ اطمینانِ کامل دارم کہ سمت شرقی در ایام حکومت و نگرانیِ آں مہربان رشک دیگر اسماتِ سرکار عالی خواہد شد "

اسی سلسلہ اصلاحات میں صوبہ دار نے مستقر صوبہ کو از سرِ نو آباد کرایا ایوان صوبداری کی رفیع الشان عمارت بنوائی۔ سڑکیں، شفاخانے، مدرسے اور دیگر سرکاری مکانات تعمیر کرائے چوپڑ کا بازار[1] تیار کرایا۔ اس کے وسط میں ایک عالی شان مسجد تعمیر کرائی۔ سرکاری طور پر ایک یتیم خانہ بھی اس اصول پر قایم کیا کہ "جب سرکار لاوارث مال کی مالک ہوتی ہے تو لاوارث بچوں کی کفالت بھی اسی کے ذمہ ہونی چاہئے" اور صدور حکم منظوری تک

---

[1] یہ بازار انتصار گنج کے نام سے موسوم ہے۔

اس کے اخراجات خود برداشت کئے۔ صوبہ بھر سے بیگار کا نام و نشان مٹا دیا۔ مزروعہ رقبہ کی ترقی اور ویران مقامات اور جنگلوں کی آبادی میں کوئی دقیقہ باقی نہ رکھا پیداوار کو ترقی دینے کے لئے نمائشیں قایم کیں اور زراعت پیشہ طبقہ کو بہت سی مراعات دلوائیں

نتیجہ اصلاحات اس انتظام سے نہ صرف وہ رعایا کے سرکار عالی جو علاقہ سرکار انگریزی میں آباد ہو گئی تھی پھر اپنے وطن میں واپس آ گئی بلکہ سرحدی اضلاع انگریزی کی رعایا نے بھی اس صوبہ میں سکونت اختیار کر لی جس سے ۱۸۹۱ء کی مردم شماری میں بمقابلہ ۱۸۸۱ء کے تقریباً چار لاکھ نفوس کا اضافہ ہو گیا۔ غرض چار سال کے اندر صوبہ ورنگل حسنِ انتظام کا نمونۂ کامل بن گیا۔

ان کوششوں اور ہمدردیوں کا لازمی نتیجہ تھا کہ رعایا میں ایک عام گرویدگی پیدا ہو چنانچہ رعایا نے شہر کا صدر دروازہ ان کی یادگار کے طور پر بنایا اور اس پر ان کے نام کا ایک بڑا کتبہ نصب کیا۔

اعتراف مزید نواب انتصار جنگ نے جس ہمدردی و محنت کے ساتھ صوبہ داری کے فرائض ادا کئے ان کی نسبت دو موقعوں پر نواب سر آسمان جاہ نے بھی لکھا ہے کہ

(۱) چار سال تک انہوں نے مفصلات میں بیش قیمت خدمات انجام دیں اور اور رعایا کی خستہ حالت کو دور کرنے میں کوشش کی اور ان کی اصل تکالیف کو بہت جلد دور کر دیا .... میں بلا مبالغہ کہہ سکتا ہوں کہ شرقی صوبہ کی رعایا شاق حسین کے نام کو احسانمندی کے جذبات کے ساتھ ہمیشہ یاد رکھے گی .....

(۲) بیس سال ہوئے جب کہ میں ماہ ذی قعدہ ۱۲۔۔ھ میں مرحوم سر سالار جنگ اول کے ساتھ ملک کے دورے کے لئے گیا تھا اور چونکہ ایک بڑے صیغہ کی

نگرانی میرے ذمہ تھی میں نے بہت دل لگاکر اضلاع کی انتظامی حالت کو دیکھا تھا
جو فرق اس وقت کی حالت سے اب میں دیکھتا ہوں اس کی نسبت مجھ سے زیادہ
کوئی اپنی خوشی اور حیرت ظاہر نہیں کرسکتا اس وقت مجھے اور مرحوم مدارالمہام
کو ملک کی حالت دیکھنے سے نہایت رنج ہوا تھا ....
جب میں اس حالت کو اس وقت سے ملاتا ہوں اور جو کچھ میں نے اب ضلع کھم
میں دیکھا اس پر خیال کرتا ہوں تو مجھ کو بے انتہا خوشی اور اطمینان ہوتا ہے
چاروں طرف ترقی نظر آتی ہے ہر جانب اصلاح کے آثار اور تہذیب کے
نتیجے دکھائی دیتے ہیں عمارتیں بنتی چلی جاتی ہیں تجارت بڑھ رہی ہے باہر کے
لوگ اپنا پورا سرمایہ پورے اطمینان سے سرکار کے ملک میں لگارہے ہیں کاشتکار
زراعت کی ترقی میں مشغول ہیں دیہات کے ملازمین سے لے کر صوبہ دار تک
اپنے اپنے کاموں میں مصروف اور اپنے فرائض کے انجام دینے میں سرگرم ہیں
ہر چیز کی تحقیق اور تنقیح بخوبی ہوتی ہے - ہر عہدہ کے کام کی نگرانی اس کے افسر
کرتے رہتے ہیں کوتوالی اور عدالت کا انتظام اول کی بہ نسبت نہایت بہتر اور عمدہ
ہے مالگذاری کے انتظام کی تکمیل نہایت نرمی سے ہو رہی ہے عہدہ دار اکثر لایق اور
ہوشیار اور متدین اور اپنے اپنے کام سے واقف اور اپنے اپنے فرائض کے انجام
میں مستعد ہیں احکام کی تعمیل بہت اچھی ہوتی ہے سرکاری خوف بھی لوگوں کے
دلوں پر ہے غرضکہ ۲۰ برس گزشتہ کی نسبت حیرت انگیز ترقی ہے جن عہدہ داروں
کا کام میں نے دیکھا ان کی نسبت میں کہہ سکتا ہوں کہ جو ترقی اور درستی ضلع کھم
(ورنگل) میں نظر آتی ہے وہ نتیجہ نواب انتصار جنگ بہادر کی ان عمدہ کوششوں
اور بے نظیر کارروائیوں کا ہے جو انھوں نے اپنے زمانہ صوبہ داری میں کیں
درحقیقت اگر وہ اپنے آپ کو اس صوبہ کی درستی اور اصلاحات میں فنا نہ کردیتے

تو وہ عمدہ حالت جو میں نے اس صوبہ کی پائی اس وقت نظر نہ آتی۔

نواب عماد السلطنت کا استعفےٰ

اس دور میں اگرچہ گذشتہ عہد کی مجوزہ اصلاحات کے نفاذ سے ہر طرف ترقی کے آثار نظر آنے شروع ہو گئے تھے۔ اور اب اصولاً اعلیٰ حضرت کے با اختیار حکمراں ہونے کے بعد رزیڈنسی کا تعلق صرف بیرونی معاملات تک محدود رہنا چاہیے تھا مگر اولاً شاہ و وزیر کی کم سنی نے اندرونی انتظامات میں کچھ نہ کچھ مداخلت کا قدرتی موقع پیدا کر دیا تھا اور وزیر کے طرز کارروائی نے معمولی و جزوی امور تک میں اس مداخلت کو وسیع کر لیا تھا حتےٰ کہ عہدہ داروں کے عزل و نصب اور عام انتظامات میں بھی رزیڈنٹ کی مشورت اعلیٰ حضرت کی مرضی پر فائق تھی۔

کچھ عرصہ تک تو اس کے نتائج محسوس نہ ہوے لیکن پھر یہ طریق کار بہت سی سازشوں اور پیچیدگیوں کا باعث بن گیا درباری امرا اور عہدہ داروں کی رقابتوں اور ذاتی اغراض اور مخالفتوں نے اعلیٰ حضرت اور وزیر کے مابین اعتماد و یک جہتی کو زائل کر دیا اور تعلقات میں انتہائی کشمکش اور تلخی پیدا ہو گئی۔ بعض وفادار عہدہ دار و امرا ایسے بھی تھے جو اس صورت حال سے متردد تھے اور تعلقات خوش گوار بنانے اور تلخی دور کرنے میں ساعی تھے رزیڈنسی اور فارن آفس سے بھی کوشش تھی لیکن وزارت کی تائید اور طرفداری کا پہلو نمایاں تھا اسی سلسلہ میں آخری کوشش یہ کی گئی کہ ایک کیبنٹ بنائی جائے اور دو چیف سکرٹری مقرر ہوں۔ اعلیٰ حضرت کے حضور میں ایک یورپین پرائیویٹ سکریٹری کا تقرر کیا جائے جو درباری امرا کی سازشوں سے علٰحدہ رہے پہلی تجاویز وایسرائے نے نامنظور کیں لیکن پرائیویٹ سکریٹری کے عہدہ پر پنجاب سول سروس کے ایک رُکن کرنل مارشل کا تقرر ہو گیا ان معاملات کو سلجھانے کے لئے لارڈ ڈفرن وایسرائے ہند کو ذاتی طور پر توجہ کرنی پڑی اور ایک حد تک کامیابی بھی ہوئی لیکن کچھ ہی مدت بعد تلخیاں اور کشمکشیں انتہائی

حد پر پہنچ گئیں اور بالآخر اپریل ۱۸۸۷ء (رجب ۱۳۰۴ھ) میں عماد السلطنت نے استعفےٰ پیش کر دیا جو فوراً منظور ہوا اور جدید انتخاب تک اعلیٰ حضرت نے امور وزارت کی انجام دہی ذات شاہانہ کے متعلق رکھی۔

ایثار کی حیرت انگیز مثال

نواب عماد السلطنت سر سالار جنگ ثانی کے مستعفی ہونے کے بعد کوئی شخص نہیں کہہ سکتا تھا کہ اب اس منصب عظمےٰ پر کس کا انتخاب کیا جائے گا اور کیا تغیرات و انقلاب واقع ہوں گے کہ اسی دوران میں نواب بہرام الدولہ (خویش سر سالار جنگ اول) کو کسی اعلیٰ عہدہ پر مقرر کئے جانے کا مسئلہ اعلیٰ حضرت کے زیر غور تھا مگر ان کے مناسبِ مرتبہ کوئی جگہ خالی نہ تھی نواب صاحب موصوف اور نواب انتصار جنگ کے بھی تعلقات تھے پوری حالت اُن کے علم میں تھی اور وہ اس اثر کو بھی محسوس کر رہے تھے جو اس تازہ واقعہ سے سالار جنگی خاندان کے وقار پر پڑ رہا تھا اس لئے انہوں نے نواب بہرام الدولہ سے مشورہ کر کے اور مسودہ دکھا کر اعلیٰ حضرت کے حضور میں حسب ذیل عریضہ پیش کیا کہ۔

فدوی نہایت خوشی اور دلی تمنا کے ساتھ اس بات پر آمادہ ہے کہ اگر نواب بہرام الدولہ بہادر صوبہ دار مقرر فرمائے جاویں تو فدوی ان کے پاس بحیثیت معتمد کے کام کرے۔

اس تجویز پر اگر اعتراض ہو سکتا ہے تو یہ ہی کہ اس قدر بڑی ذمہ داری کا کام ابتداءً امر میں بہادر موصوف کو دینا مناسب نہ ہوگا لیکن اس تمام ذمہ داری کو فدوی اپنے اوپر بدستور قبول کرتا ہے صرف اس قدر شرط کے ساتھ کہ اگر کسی معاملہ میں فدوی کی اور بہادر موصوف کی رائے میں اختلاف ہو تو وہ معاملہ سرکار میں پیش کر دیا جایا کرے اور جو اطمینان خانہ زاد کو بہادر موصوف کی طبیعت کی طرف سے ہے اس کے لحاظ سے خانہ زاد کو کافی بھروسہ ہے کہ اختلافات یا تو

قطعاً پیش ہی نہ آویں گے اور اگر کبھی ایسا اتفاق ہوگا تو وہ اس قدر کم ہوگا کہ اس کی وجہ سے سرکار کے محکمہ پر کچھ کام نہ بڑھے گا اور پھر جس وقت حضرت کو اطمینان ہوجاوے کہ بہادر موصوف اس بڑی ذمہ داری کے کام کو خود انجام دے سکتے ہیں تو اس کے بعد بھی خانہ زاد کو خواہ اسی خدمت معتمدی پر رکھا جاوے خواہ میرے لئے اس وقت دوسرا کوئی عہدہ تجویز کردیا جاوے۔

نیز اگر حضرت کی مرضی مبارک بہادر موصوف کو اورنگ آباد بھیجنے کی ہے تو فدوی وہاں جانے کے لئے تیار ہے۔

اور اس امر کے متعلق کہ خانہ زاد کیوں ایسی درخواست پیش کرتا ہے کچھ زیادہ عرض کرنے کی ضرورت نہیں ہے وہ ایک بہت صاف سی بات ہے نواب مختار الملک مرحوم اللّٰھم اغفروارحم کے احسانات میرے اوپر اس قدر ہیں کہ اگر اس سے کچھ زیادہ بھی کرنا پڑے تو بھی اس بارے سبکدوشی نہیں ہوسکتی اور اس معتمدی کو میں اپنے لئے ہزار درجہ موجب افتخار سمجھوں گا"

لیکن مصالح انتظامی سے اعلیٰ حضرت نے یہ درخواست منظور نہیں فرمائی - اور دوسرا انتظام کیا گیا۔

معتمدی مالگذاری

اعلیٰ حضرت نے ۲۸ شوال ۱۳۰۴ھ (اپریل ۱۸۸۷ء) کو منصب وزارت پر نواب سر آسمان جاہ کو منتخب فرمایا جو اس زمانہ میں حکومت نظام کے قایم مقام کی حیثیت سے ملکہ معظمہ قیصر ہند کی پنجاہ سالہ جوبلی میں شرکت کی غرض سے لندن میں تھے ان کو ٹیلگراف سے اس سرفرازی کی اطلاع دیدی گئی اور جب ۴ ذی قعدہ ۱۳۰۵ھ (جولائی ۱۸۸۸ء) کو واپس تشریف لائے تو وزارت کی نذر پیش کی اور خلعت سے سرفراز ہوئے۔

نواب انتصار جنگ کی نسبت اعلیٰ حضرت کو ذاتی معلومات تھیں اور ان کی قابلیت

اور دیانت پر بھروسہ تھا نواب سر آسمان جاہ کے تعلقات و اعتماد کا بھی علم تھا اس بنا پر بغیر کسی تحریک کے معتمدی مالگذاری پر تبادلہ فرمایا اور چونکہ ان کا موجودہ عہدۂ صوبہ داری درجہ اور مشاہرہ میں معتمدی مالگذاری سے زیادہ تھا اس لئے وہی درجہ اور مشاہرہ برقرار رہا۔

ایک اہم عرضداشت

نواب انتصار جنگ کی وفاداری و خلوص، قابلیت اور کام کے جوش کا جو تجربہ نواب سر آسمان جاہ کو ہوا تھا اس کا نہ صرف زبردست اثر ان کے دل پر تھا بلکہ پانچ چھ سال کی افسری و ماتحتی کے تعلقات میں مربیانہ عنایت اور احسان مندی کے جذبات بھی شامل تھے اس فرمان سے قدرتی طور پر ان کو نہایت مسرت و طمانیت ہوئی لیکن نواب انتصار جنگ نے ان حالات و واقعات اور ان کے اسباب کو جو میر لایق علی خاں عماد السلطنت کے دور وزارت میں پیش آئے مدنظر رکھ کر یہی بہتر اور مناسب جانا کہ آغاز کار میں وزارت کی جانب سے ایسے امور سے متعلق جن سے ان حالات کے اعادہ کا امکان ہو اعلیٰ حضرت کو آزادی اور صاف بیانی کے ساتھ توجہ دلائی جائے علاوہ بریں نواب سر آسمان جاہ کو یہ مشورہ بھی دیا کہ اعلیٰ حضرت کے اطمینان خاطر کے لئے اس عرضداشت کے ساتھ بلا ثبت تاریخ ایک استعفےٰ بھی منسلک کر دیں تاکہ جس وقت تغیر وزارت مناسب تصور کیا جائے اس پر احکام صادر کر دیئے جائیں یہ مشورہ قبول کیا گیا اور نواب انتصار جنگ نے ایک مفصل عرضداشت تیار کی جس کے ساتھ استعفےٰ بھی منسلک کر دیا گیا۔

مضامین عرضداشت

اس عرضداشت میں پہلے اعلیٰ حضرت کی توجہ اس امر پر منعطف کرائی گئی کہ تمام معاہدات کی رو سے حضور کی گورنمنٹ اپنے ملک کے اندرونی معاملات میں آزاد ہے۔ اور سرکار انگریزی کو کوئی مداخلت نہیں پھر انہوں نے دیوان کی معزولی کو بھی اندرونی مسئلہ قرار دے کر لکھا کہ چونکہ دیوان کو

حضور پر نور کی طرف سے سرکارِ عظمت مدار کے ریذیڈنٹ کے ساتھ کام پڑتا ہے لہذا انگریزی گورنمنٹ اس قدر ضرور دیکھتی ہے کہ جس کو حضرت پیر و مرشد دیوان مقرر کرنا چاہتے ہیں اس کے ساتھ کام کرنے میں ریذیڈنٹ صاحب کو کوئی مشکل تو نہ ہوگی - اور چونکہ حضرت خود ایسے شخص کو دیوانی کے لئے منتخب ہی کیوں فرمانے لگے جس میں اس عہدہ کی قابلیت ہی نہ ہو تو نتیجہ بھی اس کا یہی نکلا کہ دیوان کی موقوفی اور تقرری سب کچھ حضرت پیر و مرشد ہی کے اختیار میں ہے - اور جب ایسے بڑے معاملہ کا یہ حال ہے تو اور چھوٹی چھوٹی باتوں کا ذکر ہی کیا اصل یہ ہے کہ ہر چیز حضرت کی مرضی پر منحصر ہے - ''

اس کے بعد اعلیٰ حضرت کی حکومت کی کامیابی کے متعلق انگریزی گورنمنٹ کی صدق دلی و مخلصانہ معاونت کا یقین دلایا اور لارڈ رپن اور لارڈ ڈفرن کی کارروائیوں کی بعض مثالیں دے کر گذشتہ وزارت کے طرز عمل سے معمولی و جزوی امور میں ریذیڈنٹ کی جو مداخلت بڑھ گئی تھی اور جس سے اعلیٰ حضرت کی مرضی اس کے تابع کر دی گئی تھی اس کا مختصراً تذکرہ کر کے اپنے اس اصول کو ظاہر کیا کہ آئندہ تمام معاملات اعلیٰ حضرت کی پیشی میں آئیں گے - اور جن میں ریذیڈنٹ کی رائے ضروری ہوگی - اعلیٰ حضرت کے حضور میں ماقبل اطلاع پیش کر کے رائے لی جاوے گی پھر اس اصول سے جو خطرات تھے انہیں بھی بیان کیا کہ "میرے لئے یہ کمی کچھ کم مشکلات پیدا کرنے والی نہیں ہے ابھی چند مہینہ میں چاروں طرف سے میرے کان میں آوازیں آرہی ہیں اور کچھ شک نہیں کہ بہت مبالغہ کے ساتھ ان کو حضرت پیر و مرشد کے سمع مبارک تک بھی پہنچایا گیا ہوگا کہ میں مقدمات میں صاحب عالی شان بہادر سے مشورہ نہیں کرتا مگر خانہ زاد کیا کرے صاحب عالی شان بہادر سے جو معاملات رائے لینے کے قابل ہوتے ہیں ان ہی میں ان سے رائے لی جاتی ہے - محض نمائش کے لئے تو کارروائی کرنا اور اپنی آزادی کو خواہ نہ خواہ بھی خاک میں ملا دینا کوئی پسندیدہ ادا نہیں ہے" اس اصول کو

عرض کرتے ہوئے آخر میں ریذیڈنٹوں کی عمدہ اور قیمتی راؤں کی اہمیت بھی ذہن نشین کی اختلاف رائے کی صورت میں اپنے اوپر تمام تر ذمہ داری لینے کا یقین دلایا۔

اس کے بعد ان مشکلات کا تذکرہ کیا جب کہ بلا توسط وزارت کوئی معاملہ ریذیڈنٹ یا وائسرائے ہند کے سپرد کیا جاتا ہے اور بعد کو ان کی راؤں پر عمل پیرا ہونے سے بہ لحاظ حالات ملک مشکلات کا سامنا ہوتا ہے۔ اسی سلسلہ میں ۶۰[1] لاکھ روپیہ کے آفر اور زاید فوج کی ترتیب اور گورنمنٹ کی مرضی پر اس کی تعداد کے انحصار کی مشکلوں پر توجہ منعطف کی۔

اس مثال کو بیان کرکے ایسے اہم امور میں وزارت اور عہدہ داروں سے ماقبل مشورہ کی اہمیت وضرورت پر زور دیا اور عرض کیا کہ "خصوصاً جب سے حضرت پیرومرشد کی بارگاہ عالی میں انگلش پرائیویٹ سکریٹری کا عہدہ قایم ہوا ہے اور جب تک وہ قایم ہے تب تک اس قسم کی احتیاطوں کی اور بھی ضرورت ہوگئی ہے۔ میں کرنل مارشل صاحب کی کوئی شکایت نہیں کرتا مگر یہ تو ایک صاف نظر آتی ہوئی سی بات ہے کہ ان کی ذاتی خواہش اسی میں ہوگی اور گورنمنٹ آف انڈیا کے نزدیک وہ اپنی نیک نامی اسی میں سمجھیں گے اور ریذیڈنٹ کے ساتھ (جو کوئی ریذیڈنٹ ہو) وہ اپنی دوستی کو اسی میں بڑھا سکیں گے کہ ہمیشہ اس بات کی کوشش کریں کہ جہاں تک ممکن ہو حضرت پیرومرشد معاملات میں بلاواسطہ مدارالمہام ریذیڈنٹ صاحب اور برٹش گورنمنٹ کے ساتھ خط وکتابت اور پیام وسلام اور وعدہ وعید فرماتے رہیں اور دیوان سے بہت سے راز مخفی رکھے جاویں

. . . . . . اس موقع پر حضرت پیرومرشد یہ بھی خیال فرما سکتے ہیں

---

[1] ۔ ۱۸۸۵ء میں جب سرحد ہند پر روسی برطانوی جنگ کا خطرہ تھا تو کرنل مارشل پرائیویٹ سکریٹری کی تحریک وصلاح سے بغیر مشورہ وزارت اعلیٰحضرت نے براہ راست (۶۰) لاکھ روپیہ جنگی اخراجات کے لئے پیش کیا اور لارڈ ڈفرن نے روپیہ کی جگہ ایک امپیریل سروس ٹروپس قایم کئے جانے کی تحریک کی۔

کہ جب حضرت پیر و مرشد کسی معاملہ کے متعلق گورنمنٹ آف انڈیا سے بذریعہ خط و کتابت یا بذریعہ پیغامات زبانی کارروائی فرماتے ہیں۔ تو دوسری طرف اس کے جواب دینے کے لئے ریذیڈنٹ اور فارن سکرٹری اور پرائیویٹ سکرٹری اور خود وائسرائے ہوتے ہیں۔ جن کی عمر کا بہت بڑا قیمتی حصہ نہایت اہم اور اعظم امور ملک داری میں صرف ہو چکا ہوتا ہے۔ اور اس کے علاوہ ایک کونسل ان کے پاس مشورہ دینے کے لئے موجود ہوتی ہے۔ ساٹھ لاکھ روپیہ کے آفر کا ایک معاملہ ہے جب کہ حضرت پیر و مرشد نے اپنی ذاتی خواہش اور ذاتی خوشی سے پیش کیا ہے تو تمام جاں نثاروں کی خوشی اسی میں ہے لیکن حضرت پیر و مرشد غور فرما سکتے ہیں کہ آفر کے صرف قبول کرنے میں جس کی نسبت میں سنتا ہوں کہ قبول کیا گیا ہے اور اگر روپیہ کی صورت میں نہیں تو فوج کی صورت میں وہ دینا پڑے گا۔ گورنمنٹ آف انڈیا کو اس قدر فکر کرنی پڑی اور ولایت تک ممبران کونسل اور تمام وزرا نے اس پر غور کیا جب لینے والوں کو اس قدر فکر کی ضرورت ہوتی ہے تو دینے والوں کو بدرجہ اولیٰ اس سے بہت زیادہ صلاح و مشورہ کی ضرورت تھی"۔

پھر اس سلسلہ میں وائسرائے ہند کی چند نظیریں پیش کیں کہ وہ کس طرح اپنی کونسل سے مشورہ کر کے جوابات دیتے ہیں اور معاملات کا تصفیہ کرتے ہیں۔

آخر عرضداشت میں اس مسئلہ پر یہ توجہ دلائی کہ

" خانہ زاد نے جیسا اوپر عرض کیا ہے۔ اب ساٹھ لاکھ کے آفر کے سلسلہ میں فوج کا سوال انگریزی گورنمنٹ کی طرف سے شروع ہوا ہے اور یہ وقت نہایت درجہ احتیاط اور غور و فکر سے کام کرنے کا ہے اصل یہ ہے کہ ہم کو کوئی عذر اس وقت فوجی مدد دینے میں نہیں ہے جب کہ درحقیقت مدد کی ضرورت ہو ہم جب دوستی کے الفاظ کو زبان اور قلم سے ادا کرتے ہیں تو ضرورت کے وقت تلوار سے بھی ضرور ادا کریں گے لیکن اس وقت جو فکر ہے وہ یہ ہے کہ خزانہ کی حالت درست نہیں ہے اکتیس لاکھ روپیہ نواب مختارالملک کے قرضہ کا سرکار عالی نے

اپنے اوپر عاید کرلیا ہے اور پرانے قرضوں کی کارروائی خانہ زاد کے لندن
سے آنے کے قبل کچھ ایسی ناوقت اور خلاف احتیاط طریقہ میں شروع کردی گئی
ہے کہ کچھ معلوم نہیں کہ اس کا انجام کیا ہو۔ دس کروڑ سے زیادہ کے دعاوی کمیشن
قرضہ میں پیش ہوئے ہیں خانہ زاد بہت فکر کررہا ہے کہ کس طرح اس خطرناک
طوفان سے ریاست کو محفوظ رکھا جائے بارش کی بھی امسال کچھ قلت رہی ہے
اور اس کا لازمی نتیجہ یہ ہے کہ ملک کے محاصل میں کمی ہوگی اور وہ تو حضرت پیر و مرشد
کا کچھ اقبال ہے جو ان چند برسوں میں کوئی قحط نہیں پڑا ورنہ بڑے بڑے انگریزی
منتظموں نے اس بات کو تسلیم کر رکھا ہے کہ ہر پانچ سال میں ایک سال قحط کا سمجھنا
چاہئے اور اگر خدانخواستہ کوئی اتفاق ہو تو کچھ معلوم نہیں کہ نتیجہ کیا ہوگا خدا ہی
اپنے ملک کو حفاظت میں رکھے ان سب ترددات میں فوج کی تیاری کا سوال بہت
مشکل سوال ہے دوسرا اندیشہ یہ ہے کہ اس سوال کی فرمائش سے کہیں ہمارا قابو
ہماری فوج کے کسی بڑے حصہ پر سے نہ جاتا رہے یہ فکر کچھ اس وجہ سے نہیں ہے کہ
آج ہم کو کوئی فوجی ضرورت پیش ہے بلکہ اس لئے کہ اگر کوئی ایسی کارروائی ہوئی
تو تمام ملک ہمارا ہم سے ناراض ہوجاویگا۔ سب کو بُرا معلوم ہوگا اور سرکار عالی کے
شاہی درجہ، اور عام وقعت اور عظمت میں فرق آجائے گا۔ ان مشکلات کے
لحاظ سے امید ہے کہ حضرت پیر و مرشد بلا واسطہ مدار الہام کوئی ایسا اقرار نہ فرمائیں گے
نہ کسی تحریر پر دستخط فرمائیں گے جس کے بعد پھر کوئی تدبیر نہ بن پڑے گی اور آج تو
یہ ہے کہ خانہ زاد احتیاط احتیاط سے جواب دے گا اور جب کوئی مشکل پیش آئے گی
تو کہدوں گا کہ حضرت پیر و مرشد سے عرض کرکے جواب دوں گا اور پھر جیسا مناسب
ہوگا اطمینان کے بعد جواب دیا جاوے گا اور اگر حضرت پیر و مرشد کے سامنے کوئی
اس مسئلہ کو پیش کرے تو حضرت پیر و مرشد ارشاد فرما سکتے ہیں کہ دیوان کے

ذریعہ سے پیش کیجئے کارروائی کے اس طرز میں غور کرنے کے لئے مہلت کافی طور سے ملتی ہے اور حضرت پیرو مرشد کا شاہانہ مرتبہ اور درجہ سب محفوظ رہتا ہے۔"

اصلاحات

نواب صاحب نے اِس عہدہ کا جائزہ لیتے ہی اعلیٰ درجہ کی بیدار مغزی اور قابلیت سے اصلاحات کیں اور جو خرابیاں عرصہ سے چلی آتی تھیں آزادانہ اور انصافانہ اصول کے ساتھ ان کو دور کیا۔

جاگیروں اور معافیوں کی تحقیقاتوں اور صوبہ تلنگانہ کے بندوبست میں جو اس صوبہ میں پہلا بندوبست تھا جس طرح راعی کے حقوق کی حفاظت کی اسی طرح رعایا کے حقوق کی وکالت اور ان کا تحفظ بھی رکھا انہوں نے بندوبست کے سلسلہ میں یہ اصول واضح کردیا کہ :۔

"مالگذاری کا انتظام جس کی تمام تر کامیابی صرف رعایا کی مرفعہ الحالی پر منحصر ہے ایک خاص قسم کا انتظام ہے اور اس لئے رعایا کے حق میں سرکار کی طرف سے کسی خاص رعایت کی پالیسی ہمیشہ ایک عمدہ سے عمدہ پالیسی سمجھی جاتی ہے" اور اسی اصول پر جدید بندوبست میں عمل کرایا گیا۔

انہوں نے تمام ایسے جابرانہ دستوروں اور نذرانوں کو جو رعایا پر بار تھے یکقلم موقوف کرایا لوکل فنڈ اور لوکل بورڈ کے طریقہ کو جاری کیا اور مقامی جماعتوں کو ان کی آمدنیوں کے خرچ کا پورا اختیار دیا کورٹ آف وارڈس کا ایک بہترین نظام قایم کیا۔

صنعت وحرفت کی تحقیقات کے لئے ایک کمیشن قایم کئے جانے کی تجویز پیش کی اور ملکی صنعت وحرفت کی سرپرستی کے لئے دفاتر سرکاری میں ملکی مصنوعات کے استعمال کی خاص ہدایت کی اور اُن کی نمایشوں کا سلسلہ وسیع کیا۔

یونانی شفاخانے اول بلدہ میں اور پھر مضافات میں قایم کرائے اور طبی تعلیم کے لئے ایک مدرسہ طبیہ بھی جاری ہوا۔

ملازمت سرکار عالی میں ملکی لوگوں کے حقوق محفوظ کئے اور جو ملازم کہ اصلی وجوہ یا ہیر پھیر کے طریقوں سے تخفیف ہو گئے تھے ان کی پریشان حالت پر وزارت کو خاص توجہ دلائی جو ناقابل خدمت تھے ان کو وظیفہ و انعام دیا گیا اور جو کام کرنے اور خدمت کے قابل تھے ان سب کو قابلیت کے لحاظ سے مقرر کرایا اور جب تک تمام تخفیف یافتہ مقرر نہ ہو گئے کوئی جدید تقرر عمل میں نہ آیا اور تاریخ تخفیف سے تاریخ ملازمت تک ان کو تنخواہیں ملتی رہیں۔ ماتحت ملازموں سے اعلیٰ عہدہ داروں تک کے مدارج مشاہرات اور ترقیوں کے اصول مقرر کئے۔ انہیں کی تجویز سے پردہ نشین خواتین کی قلم بندی بیانات کے لئے ایک زنانہ کمشنر کا تقرر عمل میں آیا۔

سابق دور وزارت کے بعض پیچیدہ معاملات اور ان کے فیصلے

عماد السلطنت کے دور وزارت میں بعض ایسے پیچیدہ مسائل جو پولیٹکل حیثیت کے تھے ناتمام رہ گئے تھے جن کے سلجھانے اور طے کرانے میں سر آسمان جاہ کی وزارت کو بہت سی دشواریوں کا مقابلہ کرنا پڑا اور ان کا سارا بار نواب انتصار جنگ پر تھا

(۱) ریلوے اسکیم

ان ہی معاملات میں ایک ریلوے اسکیم بھی تھی جس کو ہوم سکرٹری (سردار عبدالحق) نے پیش کیا تھا۔ اور ان فوائد کو دکھایا تھا جو اس اسکیم سے حکومت نظام کو حاصل ہوتے۔

نواب وقار الملک نے مبینہ اعداد و شمار سے ہی اس اسکیم کی غلطیاں ثابت کیں اور انہوں نے اس امر سے سخت اختلاف کیا کہ سرکار عالی اپنے علاقہ سے باہر بغیر کسی گارنٹی کے کوئی ریلوے لائن تیار کرے کیونکہ مجوزہ لائن بمقابلہ علاقہ نظام کے علاقہ انگریزی کے بڑے حصہ سے گزرتی تھی۔

اس کے بعد بجٹ کے سالانہ خسارے، قرضوں کی ذمہ داریوں اور خزانہ کی حالت

اور اہم اصلاحات کی ضرورت پر تبصرہ کر کے موجودہ حالات میں ایسی اسکیم کی قطعی مخالفت کی۔ انہوں نے اپنے اختلافی دلائل ایسی معقولیت اور اعداد و شمار کی قوت کے ساتھ پیش کئے کہ انجام کار بہت سے ماہرین فن کے مشوروں کے بعد یہ اسکیم مسترد ہوگئی

تنسیخ اجارہ معدنیات چند سال قبل رزیڈنسی اور گورنمنٹ آف انڈیا کے مشورہ سے معدنیات ملک محروسہ کے اجارہ کا معاہدہ لندن کے اجارہ داروں کے ساتھ مکمل ہوا تھا جس کی گفت و شنید سرسالار جنگ اول کے زمانہ سے ہی شروع ہوگئی تھی تمام معاملہ اسی وقت سے سردار عبدالحق ہوم سکرٹری کے ہاتھوں میں تھا اور ان ہی کی وساطت سے اب مکمل ہوا۔ لیکن اس معاہدہ میں حکومت نظام کے مقابلہ میں اجارہ داروں کے مفاد کا زیادہ لحاظ رکھا گیا تھا کیوں کہ سردار موصوف نے مخفی طور پر کمپنی سے اپنے حق المحنت کے طور پر ستر ہزار پونڈ کے حصے حاصل کئے تھے اور بعد تکمیل معاہدہ کے چند دن بعد اُنہیں حصوں کو نہایت چالاکی سے گورنمنٹ نظام کے ہاتھ فروخت کر دیا۔ اب نواب انتصار جنگ نے ایک تنقیح کے سلسلہ میں اِس معاہدہ پر غور کیا تو ان کو کچھ شکوک و شبہات پیدا ہوے اور انہوں نے نواب محسن الملک سے بیان کئے نواب محسن الملک نے ان تمام چالاکیوں کا جو اس اجارہ میں کی گئیں تھیں لندن کے ہی ایک ماہر مالیات (مسٹر فریون) کی مدد سے انکشاف کر لیا۔ سردار عبدالحق معزول کئے گئے اور یہ کُل معاملات اس زور و شور کے ساتھ انگلستان کی پبلک میں آئے کہ گورنمنٹ برطانیہ کو اس کی تحقیقات کے لئے ایک پارلیمنٹری کمیٹی قایم کرنی پڑی جس کے سامنے گورنمنٹ نظام، اجارہ دار اور سردار عبدالحق تین فریق تھے۔ نواب محسن الملک مشیران قانونی کے ساتھ گورنمنٹ نظام کی طرف سے پیروی کے لئے لندن بھیجے گئے۔

مہینوں تحقیقات کے بعد کمیٹی اس نتیجہ پر پہونچی کہ شرائط اجارہ پر کم غور کیا گیا

اور گورنمنٹ آف انڈیا سے بھی ان شرائط کے متعلق زیادہ موثر صلاح و مدد حاصل نہیں ہوئی۔ خریداری حصص کا معاملہ فسخ ہوا حکومت نظام نے جو روپیہ ان کی قیمت کا دیا تھا وہ اُس کو واپس مل گیا۔ رزیڈنٹ اور عہدہ داران سرکاری اور کمپنی کے نمایندوں میں بحث و مباحثہ اور گورنمنٹ ہند کی منظوری کے بعد بہت سے ضمنی مراحل طے ہوکر دوسرا صاف و صریح معاہدہ کیا گیا جس میں حکومت نظام کے حقوق کی پوری حفاظت تھی۔

جو حصص سردار عبدالحق نے حق المحنت کے طور پر لئے تھے ان کے متعلق دیوانی دعوے ہوے اور انجام کار مصالحت باہمی سے وہ حصص بحق حکومت نظام منتقل ہوگئے

اس معاملہ کے متعلق نواب انتصار جنگ پر بڑی اہم ذمہ واری تھی لندن کی کارروائیوں کی نگرانی پارلیمنٹری رپورٹ کے بعد اپنی گورنمنٹ کی طرف سے یادداشت کی تیاری گورنمنٹ آف انڈیا کے سکرٹریوں اور رزیڈنٹوں سے مباحث اور آخرالامر بغیر کسی اخلاقی و مادی نقصان کے حکومت نظام کے حقوق کا تحفظ ان کا زبردست کارنامہ ہے۔

مسٹر ہاول رزیڈنٹ کی مداخلت کا انسداد۔

ان اصول کے مطابق جو وزارت کی اولین عرضداشت میں ظاہر کئے گئے تھے اس دور کے آغاز سے ہی اس امر کی کوشش کی گئی کہ رزیڈنٹ کو اندرونی معاملات میں مداخلت کا موقع نہ دیا جائے مگر پہلی منزل پر ایک سخت تصادم ہوا۔

اکتوبر ۱۸۸۵ء میں حکومت نظام نے اپنی مصلحتوں سے ہوم سکرٹری کے عہدہ پر نواب مہدی[ا] حسن فتح نواز جنگ کو مقرر کرکے حسب ضابطہ جریدہ اعلامیہ (سرکاری گزٹ)

[ا] مولوی مہدی حسن فتح نواز جنگ یوپی کے رہنے والے اور اودھ میں منصف تھے۔ سالار جنگ اول کے عہد میں گورنمنٹ نظام کی سروس میں داخل ہوئے میر عدل (چیف جسٹس)

بقیہ صفحہ ثانی پر

میں شائع کیا۔ مسٹر ہاول رزیڈنٹ نے اُن پر چند الزام لگا کر ناپسندیدگی ظاہر کی اور اس حکم کی منسوخی پر زور دیا۔ نواب محسن الملک اور نواب فتح نواز جنگ کی باہمی مخالفت نے جو لندن سے شروع ہوئی تھی حیدر آباد میں دو زبردست متقابل پارٹیاں بنا دی تھیں اور ایک افسوس ناک فضا قایم ہوگئی تھی جس سے مسٹر ہاول کو بڑی امداد ملی اور انہوں نے اس مسئلہ کو ذاتی سوال بنا لیا۔

نواب وقار الملک اس تقرر کے نہایت سختی سے موئید تھے اور رزیڈنٹ کی اس مداخلت اور تنسیخ حکم کو وقار حکومت کے خلاف سمجھتے تھے۔

مسٹر ہاول کی کدو کاوش اس درجہ بڑھ گئی کہ وہ وزارت کے مخالف ہوگئے اور مُشیر معتمد کی قوت توڑنے کو ضروری سمجھنے لگے۔

معاملہ نے اس درجہ طوالت اختیار کی کہ خود لارڈ ڈلینسڈون وائسرائے ہند نے دخل دیا اگست ۱۸۸۹ء میں مسٹر ہاول تبدیل کئے گئے اور ان کی جگہ ایک نہایت ہی قابل دوراندیش مدبر سر ڈینس فٹز پیٹرک کو مامور کیا گیا۔ جنہوں نے اس فضا کو بدلا۔ نواب محسن الملک اور فتح نواز جنگ میں صلح کرا دی۔ وائسرائے نے صاف طور پر ایسے تقررات کو اندرونی معاملہ تسلیم کیا اور اکتوبر ۱۸۸۹ء میں جدید ہوم سکرٹری نے جائزہ لے لیا

ے بقیہ صفحہ اول۔ کے عہدہ تک ترقی پائی نہایت ذہین اور قابل آدمی تھے ۱۸۸۷ء میں بھسول رخصت انگلستان گئے۔ چوں کہ وہ نظام سروس کے ممتاز رکن تھے اور مشہور اخبارات میں اُن کے فاضلانہ مضامین شائع ہوتے رہتے تھے اس سبب سے طبقہ خواص میں اُن کی رسائی تھی وہ قابل مقرر بھی تھے اور اُن کی دلچسپ تقریریں جو پبلک دعوتوں کے موقع پر ہوئیں بڑی آب وتاب سے شائع ہوتی تھیں۔ قانونی قابلیت وتجربہ کے لحاظ سے ان کو بیرسٹری کی اعزازی سند بھی مل گئی تھی۔ اس زمانہ قیام میں ان کو حکم دیا گیا کہ ریلوے اور معدنیات کا تجربہ حاصل کریں اور جب نواب محسن الملک مقدمہ معدنیات کی پیروی کو گئے تو وہ ان کے جونیر بنائے گئے پھر نواب محسن الملک کی واپسی پر اس مقدمہ کے اختتام تک انہوں نے حکومت نظام کی نمایندگی کی۔

درخواست وظیفہ نواب انتصار جنگ کو جو اثر و اقتدار حکومت نظام میں حاصل تھا اور رزیڈنسی سے جس قسم کے خوش گوار تعلقات قایم تھے

ان سے حاسدوں کی جماعت میں جو ہر طبقہ کے عہدہ دار اور امرا وغیرہ سے مرکب تھی آتش حسد بھڑک اٹھی اور سازشوں کا ایک منظم سلسلہ قایم ہو گیا۔ خورشید جاہ[1] کی دولت، کوتوال کی قوت خود وزیر اور اعلیٰ حضرت کے معتمدین و مصاحبین کی ذہانت سب ایک نقطہ پر جمع تھیں۔ حیدرآباد میں اور حیدرآباد سے باہر مختلف طریقوں سے بُری شہرتیں پھیلائی جاتی تھیں۔ وزارت کو بدنام کرنے کے لئے انگلش پریس کی خدمات بھی معاوضہ پر حاصل کی گئیں تھیں۔ جو حیدرآبادی امرا اور مالکان پریس کے لئے ایک معمولی اور روایتی بات تھی۔ نواب انتصار جنگ نے ان باتوں کو ہمیشہ حقارت کے ساتھ نظر انداز کیا۔ مگر جب بعض اہم انتظامی معاملات میں عہدہ داروں کی وجہ سے مشکلات پیش آنے لگیں اور اصلاح حالات کی امید نہ رہی تو انھوں نے ستمبر ۱۸۹۰ء میں وظیفہ کی درخواست پیش کر دی اور ساتھ ہی پریس کو ایک بیان[2] ارسال کیا۔

---

[1] نواب سر خورشید جاہ امیر کبیر دزارت کے بڑے متمنی تھے لیکن ناکام ہی رہے۔

[2] افسوس ہے کہ یہ دلچسپ بیان نواب صاحب کی اصلی عبارت میں مہیا نہ ہو سکا۔ اس لئے علی گڑھ انسٹیٹیوٹ گزٹ سے جس نے دکن اسٹینڈرڈ مدراس سے ترجمہ کرکے شائع کیا تھا اس موقع پر نقل کیا جاتا ہے۔ بیان سے پہلے ایڈیٹر نے حسب ذیل نوٹ تحریر کیا تھا کہ (نوٹ) نواب انتصار جنگ کی خدمت کا تیسواں سال بروز دوشنبہ ۲۲ ستمبر سنہ رواں کو ختم ہوا ان کے لئے یہ ایک ایسا دن تھا جس کی نسبت لوگوں کو معلوم ہے کہ وہ بڑے اشتیاق اور فخر کے ساتھ کئی مہینہ اس کے منتظر تھے وہ اس بات کو باور کرتے ہیں اور اس کے باور کرنے میں ان پر کوئی اعتراض نہیں کر سکتا کہ ایسی طویل کامیابی کے ساتھ سی سالہ خدمت کے ملازم کے لئے بالکل کافی وجہ ہے کہ وہ اس دن کو جس کے اندر ملازمت مذکور پوری ہو اپنے کام سے سبکدوش ہو کسی خصوصیت سے متعلق کرے۔ نواب موصوف جیسی سمجھ اور ادراک والے شخص خود ستائی کے عادی نہیں ہوتے لیکن اس موقع پر ہم نے ان کو ایسے سنجیدہ الفاظ میں جس کے وہ عادی ہیں بیان کرتے سنا ہے

ایک دلچسپ بیان

"میرا جہاز دور دراز کے تیس سالہ سفر کے بعد آخر کار بصحت و سلامتی بندرگاہ میں پہنچ گیا، میرے لئے یہ ایک نہایت دلچسپ سفر تھا اور گو اس سفر کا روزنامچہ دُنیا کے ہاتھ میں تھا، تاہم وہ سنجیدہ اور دل خوش کُن واقعات سے خالی نہیں۔ بعض اوقات میری کشتی سمندر میں بڑے امن و امان سے بہتی ہوئی چلی گئی لیکن بعض اوقات اس کو سخت طوفان سے مقابلہ کرنا پڑا جہاں اوپر سوائے تیرہ و تار آسمان اور نیچے خوفناک سمندر کی لہروں، اور جانب راست لوہے سے جکڑے ہوئے کنارے اور بائیں جانب خطرناک جوش زن امواج کے شور و غوغا کے اور کچھ نہ تھا گویا چاروں طرف سے خوف و خطر نے گھیر لیا تھا اکثر اس کمزور جہاز کو دھوکہ کی امواج نے بہا کر قرب وجوار کی چٹانوں سے ٹکرانا چاہا، لیکن ہمیشہ ایک ہادی نمودار ہو گیا جس نے تباہ ہونے سے بچا لیا' ایک مرتبہ اس جہاز نے پوشیدہ ٹکراتی لہروں سے ٹکر کھائی جس کی وجہ سے چالیس مہینے تک جہاز اُتھلے پانی اور دلدل میں غوطے کھاتا رہا' جہاں سے سالار جنگ نامی جہاز نے اس کو بچایا' لیکن میرا جہاز ہمیشہ ایسا ٹکراتا ہوا نہیں رہا' مختلف اوقات میں وہ سمندر کی صاف سطح پر ان کناروں پر سے جہاں لوگ بکثرت خوشی کے ساتھ زندگی بسر کرتے ہیں اور ان مرغزاروں اور کناروں پر سے جہاں خوش نما پھول پھولے ہوئے اور شیریں پھلوں سے باغیچے بھرے ہوئے تھے گزرتا اور بہتا چلا گیا' بعض اوقات وہ دور کے سمندروں ایسے جزیروں کے روبرو سے گزرا ہے جن میں غریب اور سیدھے سادھے لوگ رہتے ہیں اور جو ڈکیتوں کے بے رحم ڈاکوؤں اور سخت دستورات کے ظلم سے تنگ ہیں۔ لیکن خدا کا شکر ہے کہ ایسے مواقع پر ہم جہاز کے ملاحوں نے اپنے بدبخت بھائیوں کو مدد دینے میں کوتاہی نہیں کی بلکہ حسب لیاقت ہر قسم کے

ظلم سے ان کو بچانے کی کوشش کی۔ بعض اوقات ہم کو اپنی خوش قسمتی سے ایسا موقع بھی دستیاب ہوا کہ ہم نے ڈوبتے ہوئے لوگوں اور بیٹھتے ہوئے جہاز کو سمندر کے طوفان سے بچایا اکثر ایسا ہوا ہے کہ ہماری رسد کم پڑگئی ہے اور ہم کو عرصہ تک کم خوراکی پر گزر اوقات کرنی پڑی ہے، بعض اوقات ہم کو گھری ہوئی آبنائے سے جہاں لوگوں کے فریق جان سے ہاتھ دھو کر لڑ رہے تھے، گزرنا پڑا ہے جہاں سے ہم بالکل صاف نہ بچ سکے لیکن بعض وقت ہم نے اپنے راستہ کو بالکل رُکا ہوا پایا اور ہم کو اپنی قسمت اس فرقہ کی تقدیر میں شریک کرنی پڑی جس کو ہم نے راستی و انصاف پر پایا اس وقت ہم کو کمربستہ ہو کر لڑنا اور جنگ کے نتیجہ پر قانع رہنا پڑا۔ بعض وقت ہمیشہ کی نگرانی اور افکار نے ہمارے جہاز راں کو بیمار ڈال دیا اور ہمارا جہاز خوف و خطر کی حالت میں رہ گیا۔ اکثر سمندر کی عجیب مخلوقات نے ہم کو بھی اپنی ہی جنس سمجھا، اور خیال کیا کہ ہم ان کے امن و امان کھونے یا ان کے ملک پر قبضہ کرنے کی غرض سے آئے ہیں پس انہوں نے ہماری کشتی کو بڑے خوفناک اور خونخوار حملہ سے ڈبانا چاہا۔ لیکن ہمارے پورے پورے مسلح جہاز کو ان کی ضعیف کوششیں صرف اسی قدر نقصان پہونچا سکیں کہ ہم کو اپنے جہاز کی رفتار تھوڑے عرصہ کے لئے کم کر دینی پڑی لیکن ان سب سے بڑھ کر دریائی افعی اور دوسرے حشرات الارض تھے جنہوں نے آفتاب کی روشنی سے بچ کر سمندر کی پناہ میں اکثر ہمارے جہاز کے پیندے پر حملہ کیا۔ لیکن اب ہمارا سفر طے ہو گیا۔ اُس کا اچھا اور بُرا موسم، اُس کا آندھی اور طوفان کا زمانہ سب خواب و خیال باتیں ہو گئیں منزل مقصود نہ صرف ہمارے سامنے ہے بلکہ ہم اس پر پہونچ گئے ہیں ہمارے ہوشیار رہبر کی جُرأت اور ہوشیاری نے ہم کو بہ امن و امان امن کی بندرگاہ یعنی آزادی وطن آسانی اور امن و امان کے مقام میں پہونچا دیا۔ وہ سامنے مخالف

قسم کی جھنڈیاں سر پر اڑائے ہوئے عرصہ دراز کے فراق دیدہ دوست ہم آوارہ گردوں کو استقبال کرکے گھرلے جانے کے لئے آرہے ہیں، پھر اچھی طرح دیکھو وہ سامنے مجمع میں علی گڑھ کے نوجوانوں کی کلاہ وگون نظر آتی ہے اور جیسے لنگر کا چرخ موڑ کر جہاز اخیر لنگر ڈالتا ہے ان نوجوانوں کے نعرہ ہائے خوشی سے کان گنگ ہوئے جاتے ہیں"

سرسید کا خط اور ایک نوٹ

جب یہ خبر اخبارات میں شائع ہوئی تو سرسید نے نواب صاحب کو ایک نصیحت آمیز طولانی خط بھیجا جس میں منجملہ اور باتوں کے یہ بھی لکھا تھا کہ :-

"میں نے آپ کی پنشن کی درخواست کی خبر "پانیر" میں پڑھی تھی مگر میں افواہ بے بنیاد سمجھتا تھا لیکن آپ کے خط سے اس کی تصدیق ہوگئی مجھے اس کا نہایت افسوس ہے اور آپ کے اس فعل کو گناہ بھی سمجھتا ہوں۔ اگرچہ مجھ کو یقین ہے کہ سر آسمان جاہ منظور نہ کریں گے اور اگر بالفرض منظور کریں تو بھی آپ کو ان جھگڑوں سے چھٹکارا نہیں ہوسکتا ضابطہ کی رو سے نہ پھنسئے پرائیویٹ طور پر پھنسئے بس حرکت بے نتیجہ سے کیا فائدہ۔ اب سُنئے کہ اس فعل سے آپ کو گناہ کیوں ہوا آپ کے خط سے معلوم ہوتا ہے کہ تمامہ اصلاح یا توقع عدم اصلاح ہے ایک مسلمانی ریاست ہے جس کی نسبت ایک مسلمان کو باوصف مایوسی اصلاح کے اس کی اصلاح میں کوشش سے باز نہ آنا چاہئے۔ آپ اس سے باز آتے ہیں۔ اور فی الحقیقت یہ ایک قومی اور اسلامی گناہ ہے نہ وہ[1] جس کو تم نے غلطی سے سمجھا تھا اور اس غلط فہمی سے درحقیقت قومی گناہ میں پڑے تھے۔

———— تمہاری پنشن سے افسوس اس بات کا ہے

---

[1] ۔ ٹرسٹیز بل سے اختلاف کی طرف اشارہ ہے جس کا بیان آیندہ اوراق میں ہے۔

کہ ایک دوست اعلیٰ منصب پر تھا وہ بھی قبل از وقت علیحدہ ہوتا ہے۔ گو وہ
کچھ نہ کرے تب بھی قومی فلاح کے کاموں میں اس سے تقویت ہے درحالیکہ
آپ نے قومی کام میں بھی بہت کچھ مدد کی ہے تو آپ کے علیحدہ ہونے کا زیادہ
افسوس ہے۔ ہر پہلو سے تمہاری درخواست پنشن ناواجب و قبل از وقت
ہے خود تم کو اس سے عذر کرنا اور درخواست کو واپس لینا چاہئے۔

مذکورہ بالا خط کے علاوہ ۷ اکتوبر کے انسٹیٹیوٹ گزٹ میں حسب ذیل نوٹ بھی شائع کیا:

ہم کو نہایت افسوس ہے کہ نواب انتصار جنگ کی نسبت نہایت غلط خبریں
مشہور ہوئی ہیں خود حضور نظام نے فرمایا کہ نواب انتصار جنگ سے حضور نظام
کی ناراضی کی افواہ غلط ہے اس میں کچھ شبہ نہیں ہے کہ تمام امور کے ذمہ دار
جن میں نواب انتصار جنگ کا استعفا منظور کرنا یا نہ کرنا بھی داخل ہے، سر آسمان جاہ
مدار المہام سلطنت ہیں، اور نواب انتصار جنگ کا استعفیٰ منظور کرنا یا نہ کرنا اور
ان کو پنشن دینا یا نہ دینا سر آسمان جاہ کی مرضی پر منحصر ہے مگر ہرگز امید نہیں کہ وہ
نواب انتصار جنگ کا علیحدہ ہو جانا پسند فرمائیں گے۔

کچھ عجب نہیں ہے کہ نواب انتصار جنگ کے استعفیٰ کا باعث کوئی امر انتظامی
امور سے ہو جس کا عملدرآمد اس طریقہ سے نہ ہوتا ہو، جس طرح پر کہ نواب انتصار جنگ
کی رائے یا خواہش ہو اور اس لئے انہوں نے اپنا علیحدہ ہو جانا زیادہ تر پسند
کیا ہو مگر یہ کوئی ایسا امر نہیں ہے جو حل نہ ہو سکے، اگرچہ نواب انتصار جنگ کو اپنی
رائے پر تریا ہٹ سے بھی زیادہ ہٹ ہوتی ہے اور ایک چھوٹی سی بات کو بہت
بڑھا دیتے ہیں، حیدر آباد کے انتظامی امور میں بڑے سر سالار جنگ مرحوم کے
زمانہ میں اس قدر اصلاحیں ہوئی ہیں جن کو سلسلہ وار غور کرنے سے تعجب
ہوتا ہے اور ہم انکار نہیں کر سکتے کہ اور بھی اصلاحیں ہونی چاہئیں، مگر کیوں نہیں

ہوتیں یا کیوں نہیں ہوسکتیں اس کا جواب ہم صرف اسی قدر دیں گے کہ ٹرکی میں
کیوں نہیں ہوتیں اور کیوں نہیں ہوسکتیں"

نتیجہ میں درخواست نامنظور ہوئی لیکن ان کا اصرار بدستور قایم رہا جس کی اصل وجہ وہی تھی جس کا اشارہ سرسید کے نوٹ میں ہے۔

خطاب

اس عرصہ میں نواب انتصار جنگ کے لئے دولائی و ملکی کے خطاب کی تجویز پیش ہوئی مگر جب ان کو علم ہوا تو انھوں نے اس سرفرازی سے بہ ایں وجہ معافی کی درخواست کی کہ ایسے خطاب کے لئے اس قدر فارغ البالی کی ضرورت ہے جس سے اُس کی عزت قایم رہ سکے نیز خطابوں کی کثرت سے خطاب یافتہ اشخاص کی وہ وقعت جو خطاب سے ہونی چاہیئے باقی نہیں رہتی اور وہ لوگ عدم استطاعت کی وجہ سے اپنا درجہ قایم نہیں رکھ سکتے اعلیٰ خطابوں کی کثرت سے رزیڈنٹ اور امپریل گورنمنٹ کی مداخلت کا بھی خیال اور رشک کے جذبات پیدا ہونے کا احتمال ہے اور اگر اور عہدہ داروں کو محروم رکھا گیا تو بددلی پھیلے گی مگر یہ درخواست قبول نہیں ہوئی اور ۲۶ ربیع الثانی ۱۳۰۸ھ کو تقریب دربار نوروز وقار الدولہ وقار الملک کے خطاب اور منصب و علم و نقارہ سے سرفرازی ہوئی۔

وزارت سے چند شرائط

نواب وقار الملک کے لئے یہ سرفرازیاں جو استعفیٰ کی نامنظوری کے بعد ہوئیں گو باعث عزت اور وجہ شکر گزاری تھیں لیکن دربار وزارت کے ماحول اور رفتار حالات سے ان کو اطمینان نہ تھا بعض اشخاص اور عہدہ دار مخفی طور پر کچھ ایسے معاملات طے کرا لیتے کہ جو انتظامی شہرت پر موثر ہوتے تھے۔ پھر خود نواب سر آسمان جاہ کی صحبت اور بعض خیالات میں بھی ایک نمایاں تبدیلی محسوس ہوئی ان وجوہ پر نواب وقار الملک نے سبکدوش

ہوجانا ہی مناسب سمجھا۔ متعدد مرتبہ وظیفہ کی درخواستیں پیش کیں اور اُن کی منظوری پر اصرار کیا۔

اِس اصرار اور برداشتہ خاطری کی ایک بڑی وجہ تھی جس کو انھوں نے صاف طور پر لکھ بھی دیا تھا کہ اس بات کے سوا کہ اپنی قابلیت و محنت سے نواب سر آسمان جاہ کی وزارت کے انتظام کو عمدہ شہرت اور ترقی دیں کوئی مجبوری اور کوئی ترغیب اب زیادہ ملازمت کی نہ تھی۔ ان کی سنی سالہ مدت ملازمت ختم ہوچکی تھی اور اب وہ اپنی زندگی آزادی و آرام کے ساتھ بسر کر سکتے تھے۔ اور موجودہ حالت میں تمام انتظامات کی ہر ایک برائی بھلائی کی ذمہ داری تو ان کی ذات پر تھی مگر اختیار و مداخلت میں ذمہ داری کا توازن نہ تھا

نواب صاحب نے ان وجوہ اور اسباب کو نہایت وضاحت و آزادی کے ساتھ اپنی درخواستوں میں ظاہر کیا اور آخرالامر چند شرائط کے ساتھ راضی ہوگئے۔ ان میں یہ دو شرطیں بہت اہم تھیں۔

(۱) دونوں کے مابین اختلاف رائے واقع ہونے کی صورت میں مشیر معتمد کو کوئی اصرار اپنی رائے کی منظوری پر نہ ہوگا بشرطیکہ اس سے کوئی خراب اثر انتظام پر مرتب نہ ہو۔ لیکن اہم معاملات میں جن کا اثر انتظام کی عمدگی پر پڑے گا اور اصرار قبول نہ کیا جائے گا تو مشیر معتمد کو دیا تا اپنے عہدہ سے علیحدگی کا حق حاصل ہوجائے گا۔

(۲) ایام مقررہ پر نواب سر آسمان جاہ لازماً اعلیٰ حضرت کے حضور میں حاضر ہوکر امور سلطنت کے متعلق ضروری معروضات پیش کریں گے۔

مددگاری وزارت

آغاز وزارت سے اس وقت تک نواب وقار الملک معتمد مالگزاری کے علاوہ بے ضابطہ طور پر کانفیڈنشل ایڈوائزر اور پرسنل اسسٹنٹ کی حیثیت سے کام کر رہے تھے اس کا علم اعلیٰ حضرت رزیڈنٹ

اور گورنمنٹ آف انڈیا کو بھی تھا - اب ان شرائط کے بعد اکتوبر ۱۸۹۱ء میں اُن فرائض وخدمات کا باضابطہ جریدہ اعلامیہ میں بھی اعلان کر دیا گیا اور اسی طرح نواب وقار الملک کو مملکت نظام کے ہر جزوی وکلی معاملات میں اقتدار کامل حاصل ہو گیا۔

عطائے مکان

اسی مہینہ میں اعلیٰ حضرت نے براہِ خسروانہ بذریعہ فرمان مصدرہ ۱۰ ربیع الاول ۱۳۰۹ھ (۱۴ اکتوبر ۱۸۹۱ء) فتح میدان کے قریب ایک نہایت عالی شان مکان اور اس کے فرنیچر کے لئے دس ہزار روپیہ مرحمت فرمایا۔

مقدمہ الماس اور غیر معمولی جریدہ

۱۸۹۱ء میں شملہ کے مسٹر جیکب تاجر جواہرات واشیاء نادرہ اعلیٰ درجہ کی سفارش کے ساتھ ایک الماس فروخت کرنے کے لئے حیدر آباد آئے اور درباری عہدہ داروں کی وساطت سے اعلیٰ حضرت کے حضور میں اس کی خریداری کا مسئلہ پیش کرایا تقریباً ۴۹ لاکھ روپیہ قیمت قرار پائی اور الماس لاکر پیش کرنے کی غرض سے بہ شرائط چند نصف رقم ان کو دیدی گئی۔

یہ الماس کچھ ہی مدت ہوئی تھی کہ کیمبرلے کی کان سے نکلا تھا اور اس وقت تک اپنی آب وتاب اور جسامت کے لحاظ سے اپنا ثانی نہ رکھتا تھا یورپ میں اس کی خاص شہرت تھی اور ہندوستان لاکر شملہ میں اس کی نمائش کی گئی تھی اس کی ندرت ومالیت کے لحاظ سے انتہائی حفاظت کی جاتی تھی۔

جس وقت کہ یہ معاملہ ہو رہا تھا نواب وقار الملک اپنی بیماری کی وجہ سے دھابلیشور پر تھے ان کو جب اس معاملت کی اطلاع ہوئی تو انہوں نے مدار المہام کو خط لکھا کہ اس کارروائی میں بینک کو دونوں طرف سے ضامن بنا دیا جائے مگر اس وقت تک مسٹر جیکب روپیہ لے کر حیدر آباد سے روانہ ہو چکے تھے۔

کسی ذریعہ سے سر ڈینس فٹز پیٹرک رزیڈنٹ کو بھی یہ واقعہ معلوم ہو گیا اور انھوں نے جب غور کیا تو اس میں دھوکہ نظر آیا۔ مشہور مقننین کے مشوروں سے کلکتہ کی عدالت فوجداری میں مقدمہ دائر ہونے کی نوبت پہونچی مسٹر جیکب گرفتار کئے گئے اور ابتدائی کارروائی کے بعد مقدمہ سشن سپرد ہو گیا مقدمہ کی اس نوبت پر عدالت کی رائے میں اعلیٰ حضرت کا بیان ضروری سمجھا گیا

جب یہ خبر عام طور پر شائع ہوئی تو اس سے ایک غیر معمولی ہیجان پیدا ہوا اور بہت سی درخواستیں پیش ہوئیں جن میں اس بیان پر رعایا کی ناپسندیدگی کا اظہار کیا گیا تھا کیوں کہ وہ شان حکومت اور رسم و رواجِ ملک کے برخلاف تھا۔

نواب وقار الملک نے کوشش کی کہ بیان کی نوبت نہ آئے اور معاملہ بہ صلح و صفائی فیصل ہو جائے لیکن ناکامی ہوئی اور کمیشن جاری ہو گیا اب کہ بیان میں صرف دو روز باقی تھے۔ اس وقت نواب صاحب کو ایک غیر معمولی جریدہ کا خیال پیدا ہوا جس کی صرف یہ غرض تھی کہ ایک طرف تو عامہ رعایا کو اطمینان حاصل ہو جائے اور اعلیٰ حضرت کے اظہار قلم بند ہوتے کو وہ ایک مسلمان بادشاہ کے درجہ کے خلاف نہ سمجھیں دوسری طرف اہل ملک کو جو کہ عدالتوں کو اکثر تحقیر کی نظر سے دیکھنے کے خوگر تھے، ایک نہایت مفید سبق ملے تیسری طرف دیگر اقطاع ملک اور گورنمنٹ آف انڈیا اور اخباروں میں جو یہ خیال ظاہر کیا جا رہا ہے کہ مسٹر جیکب کو ایک کثیر رقم بغیر کسی ضمانت کے حوالہ کر دی گئی اور اسی قسم کے دوسرے خیالات جو پیدا ہو گئے ہیں وہ سب دفعتاً ایسے خیالات کے ساتھ بدل جائیں کہ ہر طرف سے اعلیٰ حضرت کی نسبت تعریف ہی تعریف کے نعرے بلند ہوں۔

نواب صاحب کی اس رائے پر نواب سر آسمان جاہ، رزیڈنٹ اور اعلیٰ حضرت اور دیگر مقتدر اصحاب نے نہایت پسندیدگی ظاہر کی۔ چنانچہ انھوں نے ایک اعلان مرتب کیا جو اعلیٰ حضرت کے دستخط ثبت ہونے کے بعد ۲۸ صفر ۱۳۰۹ء کے جریدہ اعلامیہ میں شائع ہوا

اس اعلان میں چند تمہیدی امور کے بعد مقدمہ اور عدالتی شہادت کی وقعت کا تذکرہ کرکے لکھا تھا کہ :-

"یہ بھی کہا جاسکتا ہے کہ اس خیالی اور فرضی کسر شان سے محفوظ رہنے کے لئے نقصان گوارہ کرنا آسان تھا لیکن تھوڑے غور سے معلوم ہوجائے گا کہ اس قسم کی کارروائی کا نتیجہ اول تو یہ ہوتا کہ دوسرے لوگوں کو بھی مسٹر جیکب کے قدم بقدم چلنے کی ترغیب و تحریص ہوتی اور دوم یہ کہ میری رعایا اپنے فرماں روا کی اصلی عزت اور شان کے متعلق کبھی اُس غلطی سے نہ نکل سکتی جو عقائد اور سنتِ اسلام کے خلاف ان کے اذہان میں مرتکز ہوگئی تھی۔ خداوند تعالیٰ جل شانہٗ خود ارشاد فرماتا ہے کہ "ولا یاب الشھداء اذا ما دعوا" یعنی شاہدوں کو جب کہ ان سے شہادت چاہی جائے ادائے شہادت سے پہلوتہی کرنا نہیں چاہیئے مغرور سے مغرور اور جبار سے جبار مسلمان حاکم کی گردن بھی اس نظیر کے سامنے نیچی ہوجانی چاہیئے کہ حضرت علی کرم اللہ وجہہ خود اپنے زمانہ خلافت میں فریق مقدمہ کی حیثیت سے عدالت کے سامنے حاضر ہوئے اور حضرت امام حسن اور امام حسین علیہما السلام نے اسی مقدمہ میں عدالت میں حاضر ہوکر شہادت ادا کی۔ مجھ کو جو خداوند جل شانہ نے محض اپنے فضل و کرم سے سوا کروڑ رعایا کی فرماں روائی کا مرتبہ بخشا ہے میں ہرگز اس کی جرأت نہیں کرسکتا کہ اپنے درجہ کو اہل بیت نبوت کے درجہ سے فائق کرنا چاہوں جن کی غلامی بھی میرے لئے موجب عزت و افتخار ہے۔

آخر میں، میں چاہتا ہوں کہ میری محبوب رعایا کا ہر طبقہ امراء و جاگیردار و سپاہ اور دوسری عام رعایا جن کو میں اپنی اولاد سے زیادہ عزیز رکھتا ہوں بخوبی سمجھ لیں اور ہمیشہ کے لئے سمجھ لیں کہ سابق میں گو کچھ ہی رسم و رواج رہا ہو اور دوسرے فرماں رواؤں نے اپنے اختیار سے اپنے واسطے گو کیسے ہی حقوق

قرار دیے ہوں لیکن میں اپنی ذات خاص کے واسطے اس سے زیادہ کوئی حق
قایم کرنا نہیں چاہتا جس کو خدا نے اور اس کے رسول نے میرے واسطے مقرر کر دیا
ہے اور میں خدا کی درگاہ میں دعا کرتا ہوں کہ وہ میرے اس ارادہ پر آخر وقت
تک ثابت قدم رکھے"

الغرض تاریخ معینہ پر بیان ہوا اور مقدمہ کے نتیجہ میں وہ الماس نصف قیمت پر مل گیا۔

اس اعلان پر ہندوستان و انگلستان کے تمام اخباروں میں اعلیٰ حضرت کی تعریف کی گئی سر ڈینس نے اپنی چھٹی میں اعلیٰ حضرت کے وسیع اور فیاضانہ خیالات اور اعلیٰ درجہ کی آزادی طبع اور ان اصول پر جو اس جریدہ میں ظاہر کئے گئے تھے نہایت تحسین و آفریں کی اور دوسرے والیانِ ملک کے لئے ایک نظیر قرار دیا۔

رعایا کی جانب سے بھی اس سال تقریب سالگرہ کے موقع پر غیر معمولی جوش عقیدت کا اظہار کیا گیا۔

استرداد برار کی تیاری

مملکت نظام کے معاملات میں تفویض و استرداد برار کا معاملہ اس درجہ عام ہے کہ اس کے لئے کسی تمہید کی ضرورت نہیں لیکن اس قدر بیان[۵] ضروری ہے کہ سر سالار جنگ اول کی سب سے بڑی تمنا اور انتہائی کوشش استرداد برار کے متعلق تھی انہوں نے کوشش کا کوئی دقیقہ باقی نہیں رکھا انگلستان اور ہندوستان دونوں جگہ اس سوال کو اٹھایا۔ بڑے بڑے قابل انگریزوں

---

۵ - یہ تمام حالات نہایت وضاحت سے حیدرآباد افیرس مرتبہ نواب محسن الملک (مرحوم) میں درج ہیں

نوٹ - اس واقعہ کے دس سال بعد ۱۹۰۲ء میں جب کہ کرنل سر ڈیوڈ بار رزیڈنٹ تھے لارڈ کرزن کی گورنمنٹ نے دوامی پٹہ حاصل کرکے بظاہر ہمیشہ کے لئے معاملہ ختم کر دیا لیکن ہز اگزالٹڈ ہائی نس آصفجاہ سابع نے لارڈ ریڈنگ کے زمانہ میں پھر یہ سوال اٹھایا اور ابھی ۱۹۳۴ء تک فیڈریشن کے مباحث میں مسئلہ برار زیر بحث رہا۔

اور با اثر اخبار یت کی خدمات حاصل کیں۔ پارلیمنٹ کے ممبروں کو اپنا مؤید بنایا اور ہزاروں پونڈ اس کوشش میں صرف کر دئیے اسی مسئلہ کی وجہ سے بعض اوقات گورنمنٹ آف انڈیا اور رزیڈنسی سے شدید اختلاف کا سامنا ہوا اور انہوں نے اپنے عہدہ و منصب اور وقار تک کو خطرہ میں ڈال دیا مگر انجام کار اعلیٰ حضرت کے بلوغ و حکمرانی تک اس پر غور و خوض اور اس کا فیصلہ ملتوی رہا۔

جب یہ وقت آیا تو حالات ایسے نامساعد تھے کہ اس کو پیش کرنے کی نوبت نہ آئی نواب سر آسمان جاہ نے بھی اس خیال کو ترک نہیں کیا اور وہ موقع و وقت کے منتظر رہے چنانچہ جب مسٹر سیمارکے نے جو سر سالار جنگ کے لندنی ایجنٹ تھے بعض واجب الادا رقوم کا مطالبہ کیا اور مسئلہ برار چھیڑنے پر توجہ دلا کر اپنی خدمات پیش کیں تو وزارت سے ان کو جواب دیا گیا کہ :۔

"میں کبھی ہز ہائی نس کو مشورہ نہ دوں گا کہ اس معاملہ میں اس وقت تک کوئی کارروائی کریں اور نہ کسی اور شخص کو ان کی طرف سے اس معاملہ میں کارروائی کرنے کی اجازت دوں گا جب تک کہ بندگان عالی کو اس امر کا پورا اطمینان نہ ہو جائے کہ رزیڈنٹ اور ہز ایکسیلنسی ویسرائے مسئلہ برار شروع کئے جانے پر راضی ہیں"

پھر ان کے مطالبہ کا جواب دے کر لکھا کہ :۔

لیکن اسی کے ساتھ میں امید کرتا ہوں کہ اس ریاست کے دوست خواہ ہندوستان میں ہوں یا انگلستان میں اور جن میں آپ بھی شامل ہیں ان کو یاد رکھنا چاہئے کہ وقت بہت قریب ہے جب کہ گورنمنٹ اس مسئلہ کے شروع کرنے کی اجازت دے گی اس وقت ریاست کو ان کی دوستی کی بہت ضرورت ہوگی اور جو لوگ کہ بندگان عالی کو اپنے مشورہ اور اثر سے اس وقت مدد دیں گے وہ یقیناً الطاف شاہی کے مستحق ہوں گے"

نواب انتصار جنگ موقع مناسب پر اس کو نہایت صفائی اور باقاعدہ ذرائع کے ساتھ پیش کرنے کی تیاری میں مصروف تھے انہوں نے بڑی محنت و عرق ریزی کے ساتھ ایک یادداشت تیار کی اعلیٰ آن کو سر ڈینیس کی انصاف پسندی اور لارڈ لینسڈون کی گورنمنٹ پر پورا بھروسہ تھا اس لئے اس یادداشت کی تیاری کو انہوں نے سر ڈینیس سے مخفی بھی نہیں رکھا اور جب یادداشت تیار ہوگئی تو اعلیٰ حضرت کے ملاحظہ میں پیش کی۔ لیکن سر ڈینس کا تبادلہ ہوگیا اور ان کے جانشین سٹرچپلی پلوڈن کی پالیسیوں نے مہلت ہی نہ دی کہ مزید کارروائی شروع ہوتی۔

امپیرئل سروس ٹرپس کے متعلق چند شرائط

ایسے ہی سیاسی معاملات میں سب سے زیادہ پیچیدہ مسئلہ فوج اعانت شاہی (امپیرئل سروس ٹرپس) کے قیام کا تھا جس کا تذکرہ اس اہم یادداشت میں ہے جو جائزہ کے بعد ہی وزارت سے پیش ہوئی تھی اس کے علاوہ فنانشل حالت کے پردہ میں رزیڈنسی سے فوج بے قاعدہ کو کم کرانے کا سوال بھی پیش تھا۔

نواب انتصار جنگ نے ان تمام حالات پر غور کر کے یہ تجویز پیش کی کہ ریگلر (باقاعدہ) فوج سے امپیرئل ٹروپس مرتب کئے جائیں اور افواج بے قاعدہ سے مناسب تعداد کو جو ریاست کی ضروریات سے زائد ہو باقاعدہ فوج میں تبدیل کر دیا جائے افسری کے لئے امرائے حیدرآباد کے نوجوانوں کو سینڈ ہرسٹ کالج میں فوجی تعلیم دلائی جائے۔ رسالہ کے ساتھ ایک ماؤنٹین بیٹری (کوہی توپ خانہ) بھی قایم کی جائے جس کے لئے گورنمنٹ توپیں مہیا کرے اور اعلیٰ حضرت کے افریقن کور باڈی گارڈ کو بھی جدید قسم کے اسلحہ سے آراستہ کیا جائے اس انتظام کے متعلق ١٦ نومبر ١٨٩١ء کو ایک واضح و مدلل خط لکھا گیا لیکن عرصہ تک گورنمنٹ کا فارن آفس اس کی منظوری و نامنظوری کا فیصلہ نہ کر سکا۔ پھر اگست ١٨٩٢ء میں یاددہانی کی گئی اور اس میں اس امر پر بھی افسوس کیا کہ دوسری ریاستوں میں تو قسم

فوج منظم ہوگئی اور حیدر آباد میں جہاں سے کہ اس تحریک کی پیش قدمی ہوئی کچھ بھی نہیں ہوا

سیزدہ سالہ تختہ مداخل ومخارج

نواب وقارالملک اگرچہ وزارت کے مددگار اور مشیر معتمد تھے لیکن بہت سے صیغے جو مختلف معتمدین کے تفویض تھے اُن کے کاغذات براہ راست وزارت میں پیش ہوتے تھے عمائدِ ریاست اپنے معاملات کو اپڈیکانگوں کے ذریعہ خود پیش کیا کرتے تھے۔ البتہ ان کے معاملات میں بھی کبھی کبھی نواب وقارالملک کا مشورہ لیا جاتا تھا اور ان کو ایسے مواقع بھی پیش آتے تھے کہ معتمدین کی رائے سے اختلاف کرنا پڑتا تھا۔ ایسے ہی معاملات میں ایک اہم معاملہ اعلیٰ حضرت کے سفر یورپ کا تھا۔

اعلیٰ عہدہ داروں کی ایک جماعت کوشاں تھی کہ اعلیٰ حضرت یورپ کے سیر وسفر کو تشریف لے جائیں۔ اسی کوشش کے دوران میں مداخل ومخارج ریاست کا ایک سیزدہ سالہ تختہ تیار کیا گیا جس میں فائنل حالت کو نہایت ہی قابل اطمینان دکھایا گیا تھا جب یہ تختہ نواب سر آسمان جاہ کے سامنے اعلیٰ حضرت کے ملاحظہ کی غرض سے پیش ہوا تو انہوں نے نواب وقارالملک کو تنقید کے لئے دیا اور ان کی تنقید میں نتیجہ برعکس ثابت ہوا۔

چوں کہ رزیڈنٹ سرڈینس فٹزپیٹرک کے سامنے بھی دیگر ذرائع سے اس کا تذکرہ آچکا تھا نواب وقارالملک نے بھی اُن سے اپنی تنقید کا تذکرہ کردیا نیز اعلیٰ حضرت کے حضور میں بالمشافہ تمام واقعات بیان کردیئے۔

اس کے بعد سرڈینس نے یہ کُل کاغذات اپنے پاس طلب کئے اور اپنے دوران رخصت میں اس پر تنقید کی اور اس کو اعلیٰ حضرت کے پاس ایک دوستانہ خط کے ساتھ بھیجدیا جس میں مشورہ دیا گیا تھا کہ آیندہ انتظام ریاست میں کس قسم کی کفایت شعاری کی ضرورت ہے۔

اس طرح سفر یورپ کا جو پروگرام اُسی جماعت نے تیار کیا تھا سب درہم وبرہم ہوگیا

اور ریاست کی صحیح فائنشل حالت اعلیٰحضرت پر روشن ہوگئی ۔

صیغہ آبکاری کی جدید اسکیم

ممالکِ نظام میں محکمہ آبکاری بھی مالگزاری کا ایک اہم شعبہ ہے جس میں جملہ مسکرات شامل ہیں لیکن اس کا انتظام خالصہ وجاگیر میں منقسم تھا جس کی وجہ سے ریاست کو تقریباً نصف کروڑ کا نقصان برداشت کرنا پڑتا تھا اور جاگیردار علیحدہ خسارہ میں رہتے تھے نواب وقارالملک نے تمام واقعات اور اعداد شمار کا مطالعہ کرکے یہ رائے پیش کی کہ ملک کی پوری آبکاری کا انتظام حکومت کے ذریعہ سے کیا جائے اور اُس کا حصہ رسدی منافع خزانہ حکومت سے جاگیرداروں کو ملا کرے ۔ اور آیندہ اضافوں میں بھی ان کا حق قائم رہے سر ڈینس فٹز پیٹرک رزیڈنٹ وقت نے بھی اس وقت سکندرآباد وحوالی سکندرآباد کے انتظامات آبکاری پر غور کرتے وقت جو رائے اپنی تحریر کی وہ بھی اس انتظام کی موئد تھی ۔ لیکن اس عرصہ میں سٹرچیچلی پلوڈن رزیڈنسی پر آئے جن کی پالیسیوں کا سمجھنا ہر ایک کے لئے کوئی آسان کام نہ تھا اُن سے جب بعض جاگیرداروں نے بالمشافہ اس انتظام کا ذکر کیا تو انہوں نے کہا کہ آپ کو اپنی جاگیرات کے انتظام آبکاری کی نسبت جو آزاد اختیارات قدیم سے حاصل رہے ہیں آیندہ بھی آپ مستحق ہیں کہ آپ کی وہ آزادی باقی رہے ۔ بس پھر کیا تھا دیوانہ را ہوئے بس است ۔ ہر شخص نے یہی خیال کرلیا کہ ہمارے ساتھ کوئی بڑی ناانصافی ہورہی ہے اور کسی نے یہ نہ سمجھا کہ خود اس کا مالی نفع کس میں ہے ۔

انہوں نے متفقاً اُس تجویز کے خلاف سخت احتجاج کیا ۔ اعلیٰحضرت کو توجہ دلائی اور اخبارات میں بھی شور وغل مچایا ۔ نواب سر آسمان جاہ نے بہ صدارت معین المہام مالگزاری کی صدارت میں اس معاملہ پر غور کے لئے بڑے بڑے جاگیرداروں اور سرکاری عہدداروں کی ایک مجلس قائم کی ۔ نواب وقارالملک نے مجلس میں اپنی تجویز کی پورے طور پر توضیح کی اور آیندہ کے تمام حقوق کے متعلق اطمینان دلایا لیکن جاگیرداروں کے ایک خاص طبقہ میں ان کی ذاتی مخالفت شروع ہوگئی

باب سوم

سازشوں کی گرم بازاری استعفا اور وظیفہ

اس ترقی عہدہ اور مرحمت شاہانہ کے ساتھ ہی ساتھ مخالف پارٹیوں میں ایک زبردست جدوجہد شروع ہوگئی امرا کا وہ طبقہ جو ہر لمحہ وزارت کی تمناؤں میں محو رہتا تھا اور وہ بڑے بڑے جاگیردار جن کو بعض انتظامات سے ناراضی تھی وزارت اور مشیر معتمد کے زوال کی تدابیر میں مصروف و منہمک تھے ۔عہدہ داروں کے طبقہ میں بھی کچھ ایسے اصحاب تھے جن کو حسد نے نعل درآتش کر رکھا تھا غرض مخالفت اور دشمنی کے متعدد مرکز قایم ہوگئے ۔

قتل کی سازش

نواب صاحب کے متعلق وقتاً فوقتاً جو سازشیں ہوئیں اُن میں سب سے خطرناک سازش اُن کے قتل کی تھی جس کی پہلی اطلاع اُن کو ایک گُم نام خط کے ذریعہ سے ہوئی اور پھر خود اس سازشی جماعت کے ایک کارکن کی زبان سے اتفاقاً کسی موقعہ پر ایسے فقرات ادا ہوئے جن سے پورے طور پر یہ راز فاش ہوگیا تو اس سازش کی مخفی تفتیش کی گئی اور بالآخر انسپکٹر جنرل پولیس نے اس کے متعلق ایک مفصل رپورٹ پیش کی جس میں چند بڑے مرتبہ کے اشخاص کی شرکت بھی ثابت ہوئی ۔

لہ بالآخر دو سال بعد نواب وقارالملک کے جانشین مسٹر ڈنلاپ کے زمانہ میں کل ملک محروسہ کی آبکاری کا انتظام حکومت نے اپنی نگرانی میں لے لیا اور جاگیرداروں کو نقد معاوضہ دیا جانا منظور ہوا ۔

مولوی سید عبد المجید بی اے (مرحوم) نے جو نواب صاحب کے دفتر میں سپرنٹنڈنٹ تھے اس واقعہ کے متعلق مؤلف سے بیان کیا تھا کہ جس وقت وہ اس رپورٹ کو سنا رہے تھے اور دو چار ہی صفحہ باقی رہے ہوں گے کہ حیدرآباد کے مشہور کوتوال نواب اکبر جنگ ملنے کے لئے آئے جو نواب صاحب کے شدید ترین مخالف تھے اور جن کا نام اس رپورٹ میں موجود تھا لیکن نواب صاحب نے حسب معمول کمرے کے دروازہ پر ان کا استقبال کیا اور کشادہ پیشانی کے ساتھ ملاقات کی۔

کوتوال نہایت گھبرائے ہوئے تھے اُن کی صورت سے بے چینی اور پریشانی نمایاں تھی انھوں نے مختصر تمہید کے بعد اس سازش کا تذکرہ چھیڑا اور اپنی صفائی پیش کی مگر نواب صاحب نہایت استقلال کے ساتھ سب کچھ سنتے رہے اور بجز اس کے کہ "جی کچھ نہیں میں دیکھوں گا آپ مطمئن رہیں" اور کچھ جواب نہیں دیا اور جب کوتوال رخصت ہوئے تو اسی طرح ان کو کمرے کے دروازہ تک پہنچایا۔

اس کے بعد رپورٹ کا بقیہ حصہ سُن کر اس کو اپنے بکس میں رکھ لیا اور باوجودیکہ میں کئی گھنٹہ حاضر رہا لیکن اس ملاقات اور رپورٹ کے متعلق ایک لفظ بھی مجھ سے نہیں کہا اور نہ پھر یہ معلوم ہو سکا کہ وہ کیا مصالح اور اسباب تھے کہ اس واقعہ اور رپورٹ پر کوئی مزید کارروائی عمل میں نہیں لائی گئی لیکن قیاس یہ چاہتا ہے کہ اس وقت کے حالات کے لحاظ سے وہ کوئی ایسی فضا پیدا کرنا نہیں چاہتے تھے جس سے عام بے چینی پھیلتی

نواب صاحب کا خدا پر اعتماد اور طبیعت کا استقلال اس قدر قوی تھا کہ نہ تو اس سازش کو انھوں نے کوئی اہمیت دی اور نہ اپنی جان کی حفاظت کے لئے کوئی معمولی سی معمولی احتیاط کی ان کے دروازہ پر نہ تو فوجی پہرہ قایم ہوا اور نہ حفاظت جان کے لئے سی آئی ڈی کے سپاہی اور افسر تعینات ہوئے۔ وہ جس استقامت کے ساتھ روزمرہ کاموں میں منہمک رہتے تھے اسی طرح برابر منہمک رہے۔

چند اتہامات مگر مخالف جماعتوں کی خوش قسمتی سے اسی قریب زمانہ میں جیمس فٹز پیٹرک کا تبادلہ ہوگیا اور ان کے جانشین سر چیچلی پلوڈن تھے جو برٹش رزیڈنٹوں میں اپنی پالیسیوں اور کارروائیوں کے لحاظ سے ایک خاص شہرت رکھتے تھے انہوں نے جب رزیڈنسی کا چارج لیا تو تھوڑے ہی عرصہ میں وہ حیدرآباد کے مشہور امیر نواب وقارالامرا[۱] اور نواب سرور جنگ[۲] کے مربی بن گئے۔

اگرچہ نواب وقارالملک کے لئے رزیڈنسی میں خطرہ پیدا ہوگیا تھا مگر ان کی صاف اور ایماندارانہ پالیسی اور بے لوث کارروائیوں نے کسی کو مداخلت اور اعتراض کا موقع نہیں دیا تاہم رزیڈنسی سے سازشی جماعت کو جو قدرتی طور پر تائید ملی اس سے ان کے حوصلے بڑھ گئے جس کا اثر بالواسطہ نواب وقارالملک پر بھی مترتب ہونے لگا۔ پرسنل اسسٹنٹ کی خدمات پر مامور ہونے کے بعد پانچویں مہینہ نواب فتح نواز جنگ کے خلاف جن کو نواب وقارالملک نے ۱۸۸۸ء میں مسٹر ہاول رزیڈنٹ کے علی الرغم ہوم سکرٹری کے عہدہ پر مقرر کرایا تھا اور جن کی نواب سرور جنگ کے ساتھ سخت مخالفت تھی ایک پمفلٹ[۳] شائع کیا گیا

---

[۱] امیر کبیر کے چھوٹے صاحبزادے اور امیر کبیر سر خورشید جاہ کے بھائی تھے اس خاندان میں عرصہ سے وزارت کی تمنائیں وراثتاً چلی آتی تھیں۔ نواب وقارالملک کے آنے کے بعد نواب سر آسمان جاہ اور نواب محسن الملک کے خلاف ایک زبردست سازش ہوئی اور سر پلاوڈن نے انتہائی اصرار اور رزیڈنٹ کے عہدہ کی پوری قوت صرف کرکے ان دونوں کو استعفے پر اور اعلیٰ حضرت کو سر وقارالامرا کی وزارت پر مجبور کردیا

[۲] نواب سرور جنگ معتمد پیشی اور خورشید جاہی خاندان کے پروردہ تھے جنہوں نے بارہا اس خاندان میں وزارت کے لئے کوششیں کی تھیں۔ [۳] ان کی بیگم صاحبہ ایک اینگلو انڈین خاتون تھیں اور قیام لندن کے زمانہ میں لیڈی فتح نواز جنگ کی حیثیت سے ملکہ وکٹوریہ قیصر ہند کے دربار لیوی میں شریک ہوئی تھیں ان پر نہایت گندے الزام لگائے گئے اور یہ بیان کیا گیا کہ وہ ایک داشتہ عورت ہے اور لیوی میں اس کی شرکت سے ملکہ معظمہ کی اہانت ہوئی۔ یہ پمفلٹ ایک بنگالی کے نام سے شائع ہوا تھا مگر بڑی سازش کا پیداوار تھا جس کے بانی مبانی۔ بقیہ صفحہ دیگر

اعلیٰ حضرت نے بھی اس پر نوٹس لیا اور ان کو حکم دیا گیا کہ وہ اس کے متعلق جو تردیدی ثبوت ہوں پیش کریں۔ اس معاملہ کا کوئی تعلق نواب وقار الملک سے نہ تھا لیکن ان کو فتح نواز جنگ کی حمایت کے لئے خاص طور پر اور طرح طرح سے بدنام کیا گیا۔

اس کے علاوہ مقدمہ الماس میں اعلیٰ حضرت پر بہ حیثیت شاہد کے جو کچھ جرح ہوئی تھی اور اس میں بعض ایسے سوالات بھی کئے گئے تھے جو طبع شاہانہ پر گراں گزرے۔ اس کا ملال تازہ کرکے اس کو بھی نواب وقار الملک کی غلط تدبیر کا نتیجہ قرار دیا گیا حالانکہ اُن کا تعلق صرف اس اعلان سے تھا جو کمیشن جاری ہونے کے بعد انہوں نے مرتب کیا تھا۔ سیزدہ سالہ تختہ مداخل و مخارج پر جو سر ڈینس نے دوستانہ خط لکھا تھا اس کی نسبت کہا گیا کہ یہ بھی نواب وقار الملک کی کارروائی ہے اسی طرح بہت سی بے بنیاد اور بے سر و پا باتیں جن سے دور کی بھی نسبت نہ تھی بڑی ہوشیاری کے ساتھ ان کی طرف منسوب کی گئیں۔ اگرچہ سازشی گروہ نہایت حزم و احتیاط کے ساتھ اپنی کارروائیاں کرتا تھا تاہم نواب صاحب کو بھی علم ہو جاتا تھا اور بعض دوسرے عہدہ دار بھی جو اپنے ملک اور آقا کے حقیقی وفادار تھے واقف ہو جاتے تھے ان ہی میں نواب افتخار الملک شہاب جنگ معین المہام کوتوالی بھی تھے جو وقتاً فوقتاً ان سازشوں کی اطلاع اعلیٰ حضرت کے حضور میں بھی پیش کرتے رہتے تھے۔ مگر ان کارروائیوں کا مقابلہ بغیر اس کے ناممکن تھا کہ نواب صاحب بھی اپنے گرد و پیش پارٹیاں بنائیں اور جو وقت کہ خدمتِ ملک میں گزرنا چاہیئے اور جو طاقت اپنے مالک اور آقا کے فرائض ادا کرنے میں صرف ہونی چاہیئے اس کو سازشوں کے درہم و برہم کرنے اور مقابلہ و مدافعہ میں گزاریں

لہ صفحہ اول کا بقیہ۔ نواب سرور جنگ کہے جاتے تھے۔ نواب فتحنواز جنگ مجبور کئے گئے کہ وہ ازالہ حیثیت عرفی کا استغاثہ نہ کریں پیروی مقدمہ میں سرور جنگ نے پانی کی طرح روپیہ بہایا عرصہ تک عدالتی کارروائی جاری رہی آخر میں اس بنا پر استغاثہ خارج ہوا کہ ریذیڈنسی مجسٹریٹ مجاز سماعت نہیں

اور یہ باتیں اُن کے ضمیر اور اخلاق کے بھی خلاف تھیں اور پھر وہ یہ بھی محسوس کرنے لگے تھے کہ مخالفین کی کوششیں جو جدید سرفرازی کے بعد ہوئیں رفتہ رفتہ کامیاب ہو رہی ہیں اس لئے وہ اکثر و بیشتر متردد رہتے تھے اور اعلیٰ حضرت اور مدار المہام کے الطاف عنایت کا کوئی اثر اُن کی طمانیت خاطر پر نہ تھا۔

درخواست وظیفہ اس حالت میں ایک روز نواب صاحب کو معلوم ہوا کہ اعلیٰ حضرت نے کسی موقع پر یہ ارشاد کیا ہے کہ:۔

"آسمان جاہ تو اچھے ہیں مگر اُن کے مُشیر اچھے نہیں"

تو جس وقت یہ فقرہ اُن کے کان میں پڑا بلا تاخیر وظیفہ کی درخواست پیش کر دی اور خواہش کی کہ بعد منظوری میں فوراً اپنے وطن کو روانہ ہونا چاہتا ہوں لیکن نواب سر آسمان جاہ نے اُس کو اپنی عرضی مورخہ ۲۲ صفر ۱۳۱۰ھ کے ساتھ بارگاہ خسروی میں پیش کرتے ہوئے نواب صاحب کی صفائی اور اُن کے خلاف جو باتیں سمع اقدس تک پہنچائی گئی تھیں اُن کی پرزور طریقہ سے تردید کی۔

منظوری وظیفہ یہ معاملہ پورے مہینہ بھر اعلیٰ حضرت کے زیرِ غور رہا اور کبھی اُس کے متعلق تحریراً و تقریراً کوئی بات ارشاد نہیں کی۔ تاآں کہ ۲۴ ربیع الاول (۱۶ اکتوبر ۱۸۹۲ء) کو سر آسمان جاہ کی درخواست پر ایک طولانی تمہید کے ساتھ جس میں چند منسوبہ الزامات کا بھی بیان تھا توقیع شاہی نافذ ہوئی کہ:۔

"وقار الملک کی درخواست وظیفہ کی نسبت میں بالکل اُن کی رائے کا متفق ہوں۔ کہ جب اُن کی بدنامی اس قدر بڑھ گئی تو اُن کا قیام کسی طرح ممکن نہیں پس اُن کو فوراً یہاں سے روانہ ہونا چاہئیے بلکہ وہ چار روز میں چلے جائیں وظیفہ کی کارروائی رفتہ رفتہ ہوتی رہے گی اس کے واسطے اُن کا توقف ضروری نہیں"

لیکن ۲۴ ربیع الاول کا حکم ۲۸ ربیع الاول (۲۰ اکتوبر) کو وزارت میں موصول ہوا

اور چوتھا دن ختم ہونے سے پہلے نواب وقارالملک نے سترہ سال کی خدمات کے بعد حیدرآباد کو الوداع کہا۔

یہ تمام کارروائی ایسے رازدارانہ طریقہ سے تکمیل کو پہنچی کہ درباری عہدہ داروں کو بھی بہت بعد میں علم ہُوا چنانچہ ۵ نومبر کو لارڈ لینڈڈوں کی وزٹ کے موقع پر جو اسٹیٹ بینکوئٹ (سرکاری دعوت) قرار پائی تھی اس میں حسب معمول شرکت کا کارڈ نواب صاحب کے پاس بھی بھیجا گیا تھا۔

نواب صاحب نے خود ہی اس واقعہ کی اطلاع نواب افسر جنگ بہادر کو دی جس کے بعد عام طور پر اس کی شہرت ہوگئی۔

باوجود اس تکدر کے جس کو مخالف اور حریف گروہ نے طبع شاہانہ میں پیدا کر دیا تھا اعلیٰ حضرت نے نواب وقارالملک کی بے لوث اور ہمدردانہ و مخلصانہ خدمات کا اِس طرح اعتراف بھی فرمایا کہ بجائے چھ سو روپیہ ماہانہ کے تو روپیہ اور اضافہ فرما کر سات سو روپیہ ماہوار مقرر کئے اور ایک ہفتہ کے اندر ہی احکام جاری ہوگئے۔

یہ بھی ایک عجیب واقعہ ہے کہ جس وقت وہ حیدرآباد سے روانہ ہونے کو تھے تو باوجودیکہ ڈھائی ہزار روپیہ مشاہرہ کے عہدہ دار تھے ان کے پاس اس وقت اتنا روپیہ نہ تھا کہ اپنا سامان اور اپنی روانگی کا اطمینان سے بندوبست کر سکتے۔ نواب سر آسمان جاہ اس حالت سے واقف تھے اور انہوں نے اس تمام فرنیچر وغیرہ کو خرید کر جو عطائے مکان کے وقت خریدا گیا تھا اس مشکل کو حل کیا اور جب وہ ایک طویل مدت تک معزز اور بیش قرار ماہوار کی خدمات انجام دینے کے بعد وطن میں آکر رہے تو اس وقت معلوم ہوا کہ اُس حالت کے لحاظ سے اب وہ افلاس کی حالت میں ہیں۔

یہ حالت کیوں تھی اس کے متعلق ان ہی کے الفاظ یہ ہیں کہ:۔

"میری یہ حالت کچھ میری فضول خرچیوں کی وجہ سے نہ تھی بلکہ بڑی وجہ یں

اس کی دو تھیں ایک محمد احمد کی تعلیم وغیرہ کے متعلق معمولی وغیر معمولی مصارف انگلستان جس کی مقدار میری حیدرآبادی پوزیشن کے مناسب رہنی ضرور تھی اور دوسرے اپنے اہل خاندان اور اہلِ وطن کا افلاس جس سے اب اس زمانہ میں شاید بہت ہی کم کوئی شریف خاندان بچا ہوگا اور خصوصاً ان ممالک میں"

ایک سازش کا انکشاف

چند سال میں نواب وقارالملک پر جو الطاف خسروانہ مبذول ہوئے اور خصوصاً چند ہی ماہ پہلے ان کے مرتبہ و اعزاز میں جو اضافہ کیا گیا اور انعامات سے سرفرازی ہوئی ان سب کو دیکھتے ہوئے دور کا خیال بھی نہ ہوسکتا تھا کہ اعلیٰ حضرت کے مزاج میں اتنی جلد کوئی ایسا تغیر واقع ہوگا کہ جو ایسے انقلاب کا سبب بنے گا۔ مگر بہت سے واقعات دُنیا میں اکثر غیر متوقع طور پر ظہور پذیر ہوا ہی کرتے ہیں ایسے ہی واقعات میں یہ واقعہ بھی سمجھنا چاہیئے۔

نواب صاحب اگرچہ حیدرآباد سے نہایت کامیابی کے ساتھ اور تمام عمر کے لئے فکر معاش سے مستغنی ہو کر سبکدوش ہوئے تھے لیکن آخر دور میں اعلیٰ حضرت کے اعتماد زائل ہونے کے صدمہ نے ان کی روح کو ہمیشہ بے چین رکھا اور یہ بے چینی اِس لئے اور بھی سخت تھی کہ ان کو ازالہ اعتماد کا سبب معلوم نہ ہوسکا حتیٰ کہ اس کا پرتوہ اس حکم میں بھی جو استعفٰے پر صادر ہوا موجود نہ تھا۔ البتہ ۱۸۹۰ء میں نواب سرورجنگ[1] سے

---

[1] گزشتہ دہ سالہ سازشوں، امراء کی باہمی رقابتوں، وزرا اور اُن کے معتمدین کے عزل و نصب میں ایک درباری عہدہ دار نواب سرورجنگ کا ہاتھ اور نام نہایت قوت وطاقت اور شدومد کے ساتھ شامل رہا جو نواب سرآسمان جاہ اور نواب وقارالملک کے بھی شدید ترین مخالف تھے اور اس بساط پر انھوں نے زبردست کامیابی حاصل کی تھی۔

اُن کو اعلیٰ حضرت کی استادی کا شرف حاصل تھا اور نہایت رسوخ یافتہ تھے لیکن عرصہ تک سرپلوڈن کی مربیانہ شفقتوں سے بہرہ ور رہنے کے انہیں کی قہرمانی نظر کا شکار ہوئے اور

بقیہ صفحہ دیگر۔

جو اب حیدر آباد سے علٰحدہ کر دئیے گئے تھے اتفاقیہ ملاقات ہونے پر معلوم ہوا کہ ناراضی کی اصل وجہ سیزدہ سالہ تختہ مداخل و مخارج تھا جس پر سر ڈینس فٹز پیٹرک نے تنقید کرکے اعلیٰ حضرت کو ایک دوستانہ خط لکھا تھا

اس تختہ کے متعلق باور کرایا گیا کہ اس کی تیاری کا مدعا یہ تھا کہ اعلیٰ حضرت کی فضول خرچیاں اور خزانہ کی نازک حالت دکھا کر شاہی اختیار و اقتدار کو کم کیا جائے اور اس کا سارا الزام نواب وقار الملک پر ڈالا گیا۔

جب یہ سبب ان کے علم میں آیا تو انہوں نے ایک مفصل خط سر ڈینس کو لکھا جو اس وقت انڈیا کونسل کے ممبر تھے اور اس میں مذکورہ بالا تختہ کی ترتیب و تیاری سے جو دوسروں کا مقصد تھا اِس پر روشنی ڈالتے ہوئے آخر میں تحریر کیا کہ۔

"مجھ کو اس قدر اور بھی عرض کر دینا ضرور ہے کہ یہ جو کچھ میں نے عرض کیا ہے یہ صرف وہ ہے جہاں تک کہ میری ذاتی معلومات، ذاتی رائے اور ذاتی کارروائی کا تعلق ہے اور اگر آپ کے علم میں اِس سے زیادہ کچھ اور بھی ہے جو کہ مجھ سے بالا بالا وقوع میں آیا ہو اور جس کا مجھ کو کوئی علم نہیں ہے تو اس کی ذمہ داری سے میں ہر طرح بری ہوں اور آپ کے سامنے میرے یہ عرض کرنے کی کوئی ضرورت نہیں ہے کہ ایک شخص کی تسکین خاطر کے لئے جس کی میری سی پوزیشن رہی ہو صرف اس قدر کافی نہیں ہوتا کہ روٹی اور کپڑے کی طرف سے اِس کو بے فکری ہو جائے میرے لئے سب سے قیمتی چیز جو میں نے تیس سالہ سروس میں حاصل کی تھی وہ اعتماد تھا جو کہ ہز ہائی نس میری نسبت فرماتے تھے۔ اور بغیر میرے کسی قصور کے اس کا اس طرح پر

صفحہ اول کا بقیہ حاشیہ۔ اور ۱۸۹۶ء میں حیدر آباد سے ان کے تعلقات منقطع کرائے گئے عرصہ تک لکھنؤ و اجمیر میں مقیم رہ کر مستقل سکونت علی گڑھ میں اختیار کی ۱۹۳۲ء میں بعمر ۸۴ سال انتقال کیا

آخر عمر میں مجھ سے چھن جانا اور برخلاف اس کے نمک حرامی کے الزام کا
مجھ سے منسوب ہونا یہ میری ہر ایک خوشی اور مقصد کے لئے جو اس دنیا میں
حاصل ہو سکتے ہیں ایک موت ہے جو طبعی موت سے میرے لئے کہیں زیادہ
تلخ ہے اور اس تلخی سے مجبور ہو کر میں نے مذکورہ بالا حالات کا آپ کے
نوٹس میں لانا مناسب سمجھا اور جو تکلیف اس کی وجہ سے جناب عالی کو ہو گی
اُس کی میں نہایت ادب سے معافی چاہتا ہوں ۔

حیدر آباد کی ملازمت کی ہوس تو میرے دل سے اُسی وقت نکل گئی
تھی جب کہ میری مدت ملازمت پینشن کی حد کو پہنچ گئی تھی اور اب بھی اور
کوئی آرزو مجھ کو حیدر آباد کے معاملات کے متعلق اس کے سوا باقی نہیں ہے
کہ ہز ہائی نس کے دل میں جو بے اعتمادی میری طرف سے پیدا ہو گئی ہے
وہ رفع ہو جائے تا کہ بغیر ان تکلیف دہ اور تلخ خیالات کے میری روح اِس
دُنیا سے کوچ کرے اور میرا نام اِس دُنیا میں آیندہ بُرائی کے ساتھ یاد نہ کیا جائے
خدا کے ہاں مجھ کو اس معاملہ کے متعلق کوئی خوف نہیں ہے کیونکہ وہ
سب طرح دانا بینا ہے اور اُس کے ہاں اس قسم کی غلط فہمیاں نہیں ہو سکتیں

لیکن جب سر ڈینس نے کسی مصلحت سے جواب نہیں دیا تو نواب وقار الملک نے
چھ سات ماہ انتظار کر کے اعلیٰ حضرت کے حضور میں ان تمام واقعات کے متعلق جو
بصورت الزام پیش کئے گئے تھے ایک مفصل عریضہ گذران کر اپنے دل اور اپنی
روح کو کچھ تسکین دے لی ۔

نواب سرور جنگ کا ایک بیان

لیکن مولف تذکرہ جب کہ ۱۹۱۸ء میں مفصل سوانح عمری کا مواد جمع کر رہا تھا
لکھنؤ میں مولوی ظفر الملک علوی ایڈیٹر الناظر کی معیت میں نواب سرور جنگ سے

ملا اور اُن سے بعض حالات اور بالخصوص اعلیٰ حضرت کی ناراضی کے اسباب دریافت کئے تو نواب صاحب موصوف نے جو کچھ بیان کیا وہ یہ تھا کہ :۔

" جب مولوی مشتاق حسین نے وزیر اعظم کی وساطت سے اپنا استعفیٰ بھیجا تو حضور نظام نے مطلقاً کسی کو اس کی اطلاع نہیں دی لیکن جب امپیریل سروس ٹرپس کا معاملہ پیش ہوا تو خود اعلیٰ حضرت نے اس عرضداشت کا جس کے ساتھ درخواست پیش ہوئی تھی ایک نہایت طولانی جواب لکھا جو نہایت سخت تھا۔

امپیریل سروس ٹرپس کا مسئلہ گورنمنٹ آف انڈیا اور گورنمنٹ نظام کے مابین درپیش تھا۔ مولوی مشتاق حسین صاحب نے اس مسئلہ کے متعلق جو کچھ تجویزیں وقتاً فوقتاً سرکار انگریزی کو بھیجیں ان میں اگرچہ اس امر کا برابر اعتراف کیا کہ نظام گورنمنٹ امپیریل سروس ٹرپس دے گی مگر کچھ ایسی پیچیدگیاں پیدا کی تھیں کہ یہ مسئلہ طے نہیں ہوتا تھا۔

جب لارڈ ڈلہنسڈون حیدرآباد کی وزٹ کے لئے روانہ ہوئے اور پونا تک پہنچ چکے تو میں نے حضور نظام سے عرض کیا کہ اس مسئلہ کا تصفیہ لارڈ ڈلینسڈون کے آنے سے قبل ہو جائے تاکہ ان کو اس بارہ میں کہنے کا موقع نہ ملے حضور نے کہا کہ پہلے رزیڈنٹ سے دریافت کرو کہ لارڈ ڈلینسڈون جو حیدرآباد آرہے ہیں اس مسئلہ کو تو نہ چھیڑیں گے مگر دریافت کرنے پر رزیڈنٹ نے کہا کہ وہ تو خاص اسی مسئلہ کو طے کرنے کے لئے آرہے ہیں حضور نے یہ سُن کر مِثل طلب کی اور مجھ سے دیکھنے کے لئے کہا میں نے اس کو دیکھ کر عرض کیا کہ اس میں ہر جگہ ٹرپس دیئے جانے کا وعدہ ہے لیکن مولوی مشتاق حسین نے پیچیدگیاں بہت ڈال دی ہیں اِس اطلاع سے حضور برافروختہ ہوئے اور انہوں نے طے کیا کہ سولہ سو ۱۶۰۰ سوار

دیے جاویں گے اور رزیڈنٹ کو بھی بُلاکر اطلاع کردی ......

.... اُس کے بعد

وقارالامرا کو لکھا گیا کہ مولوی مُشتاق حسین سے جواب طلب کرکے
پیش کریں مگر قبل اِس کے جواب پیش ہو حضور نے یہ خیال کرکے کہ لارڈ
لینسڈون آرہے ہیں اور ممکن ہے کہ سکریٹریوں سے بلاکر گفتگو کریں رات
کو حکم دیا کہ مولوی مشتاق حسین لارڈ لینسڈون کے آنے سے قبل ہی
بلدہ سے روانہ ہو جائیں "

اِس بیان کی تائید یوں بھی ہوتی ہے کہ ۱۸ اگست ۱۸۹۲ء تک گورنمنٹ
سے کوئی مختتم جواب نہیں آیا تھا اور وزارت سے یاد دہانی بھی کی گئی تھی
علاوہ ازیں جب اول ہفتہ نومبر میں ویسرائے نے حیدرآباد آئے تو سرکاری
دعوت کی تقریر میں بھی اِس مسئلہ پر اظہارِ خیال کیا اور اس کے بعد ہی
رزیڈنسی یا امپیریل گورنمنٹ کی منشاء کے مطابق کل معاملات طے ہوگئے۔

خدماتِ حیدرآباد پر تبصرہ

نواب وقارالملک نے جس وفاداری و دیانت صداقتِ ضمیر، ہمدردیٔ رعایا قابلیت و دانائی اور کامل انہماک سے سترہ سال حیدرآباد کی خدمات کیں وہ برطانوی ہند اور ریاستوں کے عہدہ داروں کے لئے بلاشبہ ایک نمونہ ہو سکتی ہیں۔

اب رہا ان کی حیدرآبادی زندگی کا یہ انقلاب تو وہ کوئی عجیب بات
نہیں کیونکہ شخصی حکومتوں میں ایسے تغیرات وانقلابات غیرمعمولی واقعات
نہیں ہوتے پھر ہندوستانی ریاستیں تو شخصی طرزِ حکومت کا ایک ایسا عجیب
نمونہ ہیں کہ بعض اوقات اُن کے حکمرانوں کی پوری قوتِ فرمانروائی اور پورے
اقتدارِ حکومت پر دوسرے اقتدار اور دوسری قوت کا اتنا زبردست غلبہ

ہو جاتا ہے کہ حکمراں کی اعلیٰ شخصیت اپنی حکومت کے منافع اور اپنے جذباتِ عالیہ تک کی قربانی پر مجبور رہو جاتی ہے۔

علاوہ بریں اکثر اوقات وہ رسوخ یافتہ اشخاص جو اپنے اغراض کی کامیابی کے لئے ہر ناروا کام کرنے میں باک نہیں کرتے اور اپنی خطرناک ذہانت کو ہر اُس شخص کے خلاف جس کو وہ اپنا سدِ راہ سمجھتے ہیں استعمال کرنے سے نہیں چوکتے کامیاب ہو جاتے ہیں اور اُن کی کوششوں کے نتیجہ میں اکثر غیر متوقع طور پر بڑی بڑی قابلِ احترام ہستیوں اور مقتدر شخصیتوں کا اقتدار و احترام کاَنْ لَمْ یَکُنْ ہو جاتا ہے یہی صورت نواب وقار الملک کے دورِ آخر میں نظر آتی ہے۔

وظیفہ سے چند سال پہلے ان کو وہ سب کچھ نظر آرہا تھا جو بعد کو واقعہ کی صورت میں پیش آیا اور اسی لئے بار بار وظیفہ پر اصرار کرتے تھے مگر نواب سر آسمان جاہ کے ذاتی تعلقات زیادہ تر ان کے اصرار پر غالب آجاتے اور جب وہ اس کو قبول کر لیتے تو نڈر ہو کر کام کرتے تھے ان کو اُس صراطِ مستقیم پر چلنے سے جس کی تعبیر صداقت و آزادی سے تھی ہر ہر قدم پر مشکلات پیش آتی تھیں اور ان میں اعلیٰ حضرت کی پیشی وزارت اور رزیڈنسی کے تعلقات اور انگریز عہدداروں سے برتاؤ یہ چند بہت نازک مقام تھے اور پھر جس ملک کی خدمت ان کے تفویض تھی اس کے حقوق کی نگہداشت اور ان کا دیانت سے ادا کرنا سب سے زیادہ اہم مرحلہ تھا۔

اعلیٰ حضرت کی پیشی

اعلیٰ حضرت کی پیشی میں حاضری اور کاغذات پیش کرنے کے متعلق ان کا جو اصول کار تھا اس کو وہ خود ایک عریضہ میں جو اعلیٰ حضرت ہی کے حضور میں پیش کیا تھا اس طرح بیان کرتے ہیں کہ

" سب سے زیادہ نازک حالت فدوی کی اُس وقت ہوتی تھی جبکہ فدوی

حضرت خداوندی کے جناب اقدس میں نواب مدارالمہام کی کوئی ایسی
درخواست لے کر حاضر ہوتا تھا جو فدوی کی رائے کے خلاف ہوتی تھی اور
نواب صاحب کے اصرار کی وجہ سے فدوی کو اُن کے ایمار کے مطابق کام
کرنا پڑتا تھا یا جب کہ اس قسم کی عرضداشت کا مسودہ فدوی کو مرتب کرنا
پڑتا تھا اور اگرچہ ایسے موقع کو فدوی نے حتی الامکان اور اکثر ٹالا تاہم
بعض اوقات ایسا کرنا ہی پڑا۔ چونکہ فدوی اکثر قیاساً دریافت کرسکتا تھا کہ
حضرت ظل سبحانی اُن میں سے کن تجویزوں کو پسند فرماتے ہیں اور کن کو
ناپسند، لہٰذا اِس وقت فدوی کو بخوبی اس بات کا موقع حاصل تھا کہ اپنی
ناچیز رائے کو بھی فدوی حضرت ظل سبحانی میں ظاہر کرکے اپنی ذاتی سرخروئی
حاصل کرلیتا۔ لیکن اس سخت امتحان کے موقع پر فدوی نے ہمیشہ اپنے دل کو
یہ سمجھا کر اپنے قابو میں رکھا کہ اگر مجھ سے بھی ایسا ہی وقوع میں آوے اور
مدارالمہام کی طرف سے سفارت کے فرائض ادا کرتے وقت مشتاق حسین بھی
اپنے ذاتی فوائد کو مدنظر رکھے تو آیندہ کون آقا اپنے کسی ملازم پر اعتماد
کرے گا مگر اسی کے ساتھ یہ بھی ہرگز نہ تھا کہ جس بات کو فدوی غلط سمجھتا
اُس کو حضرت ظل سبحانی میں بطور اپنی رائے کے صحیح قرار دے کر عرض کرتا
کیونکہ ایسا کرنا بھی فدوی کے نزدیک کفر کے قریب ہی قریب مضمون تھا
اور اس لئے فدوی کی کارروائی کا طرز ہمیشہ یہ رہا کہ جو گذارش جن دلائل
کے ساتھ مدارالمہام کی طرف سے فدوی کے سپرد ہوتی تھی اس کو فدوی
بجنسہ عرض کردیتا تھا اور جب تک فدوی کی ذاتی رائے کسی معاملہ کی
نسبت دریافت نہیں فرمائی جاتی تھی اس وقت تک فدوی اپنی طرف سے
اور کچھ عرض کرنے کی جرأت نہیں کرتا تھا اور یہ حضرت پیرومرشد کو خود

معلوم ہے کہ حضرت پیر و مرشد مدارالمہام کے معروضات کو سماعت فرماتے وقت فدوی کی ذاتی رائے بہت ہی کم کبھی دریافت فرماتے تھے۔

وزرا سے تعلقات

نواب وقارالملک نے سترہ سال تک تین وزرائے حکومت کے دور میں مختلف عہدوں کے فرائض انجام دیئے اور ہر دور میں انہوں نے صداقتِ ضمیر و آزادی رائے اور جرأت اخلاق کے ساتھ کام کیا اِن کو بعض مواقع پر وزرا سے شدید اختلافات کی نوبت آئی اور ان میں وہ استقامت دکھائی کہ اپنی ملازمت تک خطرہ میں ڈالدی۔ اور مطلق پروانہ کی کہ کل کتنی مشکلات سامنے آجائیں گی۔

سر سالارجنگ اول نے اپنی مربیانہ شفقت اور اپنے اعلیٰ درجہ کے کیرکٹر کی وجہ سے اُن کے صفات عالیہ کی قدر اور تربیت کی۔

نواب عمادالسلطنت سالارجنگ ثانی کے دور میں اگرچہ اِن کو وزارت سے بُعد ہو گیا تھا لیکن ان کی خدمات ملکی کا ہمیشہ اعتراف کیا گیا اور ان کے احترام و وقار اور منصب میں اضافہ کے ساتھ خطاب سے سرفرازی ہوئی۔

نواب سر آسمان جاہ کے ساتھ ابتدائے ملازمت سے ان کا تعلق شروع ہوا دونوں ہم عمر تھے اور دونوں کا مطمحِ نظر ایک ہی تھا اور دونوں پر سر سالارجنگ اول کو یکساں اعتماد تھا اِس لئے ان کے تعلقات پر بہت جلد ذاتی دوستی کا رنگ چڑھ گیا اور اگرچہ درمیان میں چند سال یہ سرکاری تعلق منقطع رہا لیکن ذاتی تعلق بدستور قایم تھا تا آں کہ آسمان جاہی دور آیا جس میں نواب وقارالملک کی معتمدی بجائے خود وزارت بن گئی لیکن ہر ایک مرحلہ پر وہی صداقت و آزادی اور جرأت اخلاق نمایاں تھی اور چونکہ فرائضِ خدمات کے ساتھ ذاتی دوستی بھی شامل تھی اس لئے وہ صداقت و آزادی اور جرأت

زیادہ تیزی کے ساتھ نمایاں ہوتی تھی۔

سنہ ۱۸۹۰ء میں جبکہ نواب وقارالملک اپنا سی سالہ زمانہ ملازمت ختم کرکے وظیفہ کے لئے اصرار کر رہے تھے اور نواب سر آسمان جاہ کو اُن کی جُدائی گوارہ نہ تھی تو انھوں نے اپنی توسیعِ ملازمت پر اظہار رضامندی کرتے ہوئے بعض ایسے امور کے متعلق توجہ دلائی جن سے پائیگاہ اور دیوانی کے معاملات مخلوط ہو گئے تھے اور اسٹاف کے مشاہرات دیوانی سے ادا ہوتے تھے۔

اگرچہ یہ امور رواج اور سابق دستور کے مطابق تھے لیکن نواب وقارالملک کے نزدیک ان کا جواز نہ تھا۔ اس کے متعلق جو عریضہ لکھا اس کا آخری فقرہ یہ تھا کہ "سرکارِ عالی کو دیانت بالمقابلہ مقصود ہے یا دیانت اصلی۔ اگر اصلی مقصود ہے تو یہ باتیں اس کے خلاف ہیں اور اگر میں رہا تو ان میں سے کچھ بھی نہیں ہونے دوں گا اگر مجھ کو رکھنا ہے تو یہ سمجھ کر رکھنا چاہئے"

نواب سر آسمان جاہ ایک نہایت فیاض طبع اور بامروت امیر تھے جس سے ان کے گرد و پیش متعدد بندگان اغراض کو بھی جمع ہو جانے کا موقع مل گیا تھا اور جو ان کی فیاضی و مروت سے بعض اوقات ناجائز فائدے حاصل کرتے رہتے تھے اور بعض اوقات ناخوش گواری اور تکلیفیں پیدا ہوتی تھیں

نواب وقارالملک نے اس کمزوری پر بھی آزادی کے ساتھ متوجہ کیا کہ:۔

"جن کو چور اور دشمن سمجھتے ہیں ان کو بھی خدمتوں پر رکھا جاتا ہے یہ اعلیٰ درجہ کی کریم النفسی ہے یا یہ کہ ان کی خوشامدوں پر خیال کیا جاتا ہے یا یہ طبیعت کی کمزوری ہے لیکن اس کا نتیجہ یہ ہے کہ

(۱) قوت اور انتظام ضعیف ہوتا ہے۔

(۲) انٹریگ بڑھتی ہے۔

(۳) دوسرے عہدہ داروں پر بُرا اثر پڑتا ہے اور ایک غلط طرزِ حکومت ہے اور انصاف کے خلاف ہے"

مذکورہ بالا جماعت نے اس بات میں بھی کوئی کسر نہ چھوڑی کہ نواب سر آسمان جاہ کے دل میں اپنے مشیرِ معتمد کی طرف سے کدورت پیدا ہو جائے۔ اور خود نواب وقارالملک کو بھی اس کا احساس تھا لیکن وہ کبھی صراطِ مستقیم سے نہ ہٹے اور وہی رائے پیش کی جو ملک اور مالک کے حق میں مفید سمجھی۔

اِس دور میں اُن کا طریقِ عمل یہ تھا جیسا کہ خود انھوں نے تحریر کیا ہے کہ:۔

جو کارروائیاں ایسی ہوتی تھیں جن سے لوگ زیادہ مشکور ہوتے تھے گو کہ وہ فدوی کی رائے بلکہ کوشش کا نتیجہ ہوتی تھیں تو بھی فدوی نے لوگوں سے اُن کی نسبت یہ ہی بیان کیا ہوگا کہ وہ تجویزیں نواب مدارالمہام بہادر کی اپنی ایجاد ہیں جن کو اپنے ملک اور اہلِ ملک کی بہتری کا خود ہر وقت سب سے زیادہ خیال ہے اور جو باتیں اتفاق سے ایسی ہو جاتی تھیں جن کی نسبت لوگ شاکی ہونے لگتے تھے اور گو کہ وہ فدوی کی رائے کے صریح مخالف ہی ہوتی تھیں تو بھی جب کہ کوئی شکایت ان تجویزوں کے متعلق میرے سامنے پیش ہوتی تھی تو میں ہمیشہ ان تجویزوں کی تاویل ہی کیا کرتا تھا کہ خلایق کے دل میں اپنے مدارالمہام کی طرف سے بددلی پیدا نہ ہو دوسری طرف بدقسمتی سے بعض عہدہ داروں کا یہ حال تھا کہ وہ عام پسند اور عام دل خوش کن تجویزوں کو اپنی کوششوں سے منسوب کیا کرتے تھے گو کہ اُن سے اُن کا کچھ بھی تعلق نہ ہوا ہو اور جن تجویزوں کی نسبت وہ لوگوں کو شاکی پاتے تھے ان کو وہ مشتاق حسین کے سر رکھ دیا کرتے تھے گو کہ وہ تجویزات خود ان ہی کی ایجاد سے ہوئی تھیں اور اس کا جو کچھ نتیجہ ہو سکتا تھا وہ ظاہر ہے

اور اس کا کوئی علاج فدوی کے ہاتھ میں نہیں تھا اور اس ہمت نے جو
انسان میں اپنے فرائض کو ایمانداری کے ساتھ انجام دینے سے پیدا ہوتی ہے
فدوی کو کسی ایسے علاج کی طرف چنداں راغب بھی نہ ہونے دیا اور ہمیشہ
فدوی نے اِس کو ایک حقارت کی نگاہ سے دیکھا۔

نواب وقارالملک کو ذاتی دوستی کے لحاظ سے کبھی کبھی ایسے خانگی امور
و معاملات میں بھی رائے دینے کی ناگریز ضرورت ہو جاتی تھی کہ جس کا اثر بالواسطہ
سرکاری حیثیت اور وزارت کے مرتبہ پر مترتب ہوتا تھا۔

لیکن یہ حقیقتِ نفس الامری ہے کہ نواب سر آسمان جاہ بھی اُن تمام اعتراضوں
اور مشوروں کو اُسی صدق دلی کے ساتھ سُنتے تھے جس صداقت ضمیر کے ساتھ وہ
پیش کئے جاتے تھے اور باوجودیکہ ایک حاضر باش جماعت منظم طریقہ سے تکدر پیدا کرانے
میں ہر قسم کی قوت و اثر استعمال کرتی تھی مگر نتیجہ میں ناکام ہوتی تھی۔ اور جو اعتماد کہ
نواب وقارالملک پر تھا اس میں آخری وقت تک کوئی کمی نہ آئی حتیٰ کہ منظوری وظیفہ
کے بعد جب دس بجے شب کو روانگی کے وقت ٹیلیفون پر نواب سر آسمان جاہ کو
خداحافظ کہا تو انہوں نے اس وقت بھی اپنی پوری ذمہ داری پر انتہائی اصرار کیا
کہ "ابھی ارادہ ملتوی کر دیا جائے" لیکن ایسے اصرار پر نواب وقارالملک کا جواب
صرف یہ تھا کہ "تعمیل تو اعلیٰ حضرت کے ہی حکم کی ہوگی"

ان دونوں میں جو تعلقات تھے اور ان میں جو جوش و خلوص اور اعتماد تھا
اور نواب وقارالملک نے جس درجہ وفاداری کی اس کا اندازہ کرنے کے لئے
ہم نواب عمادالملک مولوی سید حسین بلگرامی (مرحوم) کے ایک خط سے جو انہوں نے
نواب وقارالملک کی یادگار کے سلسلہ میں لکھا تھا یہ فقرہ نقل کر دینا کافی
سمجھتے ہیں کہ:۔

"نواب سر آسمان جاہ مرحوم پر مولوی مشتاق حسین مرحوم کے ایسے احسانات ہیں کہ اگر اُن کے ورثا لاکھ روپیہ بھی دے دیں تو تھوڑا ہے"

ادائے فرائض میں محنت

نواب صاحب کو اپنے عہدہ کے اصلی فرائض کے علاوہ اور بھی بہت سے کام کرنے پڑتے تھے لیکن انہوں نے ہمیشہ غیر معمولی اوقات میں اپنی راحت و آسائش کو قربان کر کے متعلقہ کاموں کو پورا کیا اس کے متعلق ایک موقع پر لکھتے ہیں کہ :-

"گو میرا کیسا ہی بڑا وقت میرے عہدہ کے کاموں کے علاوہ صرف ہوتا ہو، لیکن اگر میرے عہدے کا کام کسی وقت رُک گیا تو اس کی بدنامی سے میں کسی طرح یہ کہہ کر اپنے کو نہ بچا سکوں گا کہ میرا وقت دوسرے کاموں میں بہت کچھ صرف ہوا تھا مع ہذا خلائق کی تکلیف کی بھی حتی الامکان مجھ سے برداشت نہ ہو سکی۔ اور یہی وجہ تھی کہ اکثر اُن دنوں میں بھی جبکہ میں دن کا ایک بڑا حصہ اپنے اس عہدہ سے غیر متعلقہ کاموں میں صرف کر کے تھک تھک گیا ہوں، اور نو نو بجے بلکہ دس دس بجے رات تک کچہری میں بیٹھ کر اپنے عہدہ کے کام کو انجام دیا"

نواب سر آسمان جاہ پر اس محنت کا گہرا اثر تھا ایک سلسلہ میں انہوں نے لکھا تھا کہ :-

"جس قدر آپ محنت کرتے ہیں میں گواہ ہوں کہ کوئی اور اِس قدر نہیں کر سکتا"

اِن کے بعض احباب اس محنت کو صحت کے لئے اندیشہ ناک تصور کر کے بار بار آرام و اعتدال پر توجہ دلاتے رہتے تھے۔ چنانچہ ایک موقع پر نواب شہاب جنگ معین الہام کوتوالی نے نہایت لطیف پیرایہ میں تحریر کیا تھا کہ

" بہرحال جناب راخود توجہ برصحتِ خود ضرور است کہ ایں احتیاطِ
جناب ہم کم تراز عبادت نیست "

رزیڈنسی سے تعلقات

نواب وقار الملک کا اپنے فرائض عہدہ کے لحاظ سے رزیڈنٹ کے ساتھ گہرا تعلق تھا اور اس تعلق میں بارہا ایسے مواقع آئے کہ اغراض و حقوق ملکی کے مفاد میں رزیڈنٹ کی راؤں اور مشوروں سے اختلاف کیا اور اس کی ناروا مداخلت کو روکنے میں پوری اور کھلی کوشش کی اور کامیابی بھی حاصل کی لیکن رزیڈنٹ کے مرتبہ اس کی عظمت و قوت کو بھی ملحوظ رکھا۔

انھوں نے ذاتی مفاد کے لئے کبھی رزیڈنسی کا سہارا نہیں ڈھونڈا اور اسی قدر واسطہ رکھا جو مفاد ملکی کے لحاظ سے ایک ایسے عہدہ دار کے لئے ضروری تھا۔

اس پالیسی اور طرزِ عمل کا نتیجہ تھا کہ خواہ کسی رزیڈنٹ سے کیسا ہی اختلاف رائے ہو لیکن اس کے دل میں نواب صاحب کی عزت اور اعلیٰ کیرکٹر کا گہرا نقش قایم ہوتا تھا اور جب آخری مرتبہ اپنا زمانہ ملازمت ختم کرنے کا عزم مصمم کر لیا تو اُس دن سے سرکاری کاموں کے لئے بھی اُدھر کا رُخ نہیں کیا اگرچہ ملازمت سے علٰحدہ ہونے کے بعد اُن کو اخلاقاً رزیڈنٹ سے آخری ملاقات کرنا ضرور تھا لیکن انھوں نے ایسے اخلاق پر احتیاط کو ترجیح دی مگر رزیڈنٹ نے اس واقعہ کی اطلاع پاکر خود ہی حسب ذیل الوداعی چٹھی لکھی جس میں اُسی احتیاط کی طرف اشارہ بھی کیا ہے۔

" رزیڈنسی حیدرآباد۔

مائی ڈیر سر، اگرچہ مجھ کو آپ سے ملنے اور بذات خود آپ کو

خدا حافظ کہنے سے بہت مسرت ہوتی لیکن میں اس امر کو بخوبی سمجھ سکتا ہوں کہ آپ کوئی ایسی بات کرنی پسند نہیں کرتے جو موجودہ حالت میں موجب غلط فہمی ہوتی۔

مجھ کو امید ہے کہ آپ کو بہت برسوں تک اپنے نئے وطن اور نئے لوگوں میں وہ آسائش نصیب ہوگی جو آپ نے ایک بامشقت اور مفید زندگی سے واجبی طور پر حاصل کی ہے۔

آپ کی بہبودی کے واسطے بہت بہت خواہشمند

آپ کا دوست

چچلی پلوڈن

اس سلسلہ میں ہز آنر سر ڈینس فٹز پیٹرک کا جو اس وقت پنجاب میں لفٹنٹ گورنر تھے وہ تعارفی خط بھی قابل اندراج ہے جو انھوں نے ہز آنر سر چارلس کراستھویٹ لفٹنٹ گورنر ممالک مغربی و شمالی و اودھ کے نام لکھا تھا اور جس میں نواب وقار الملک کے اس دور آخر پر ایک پُرمعنی تبصرہ ہے۔ تعارفی خط حسب ذیل ہے۔

میرے پیارے کراستھویٹ، مولوی مشاق حسین رئیس امروہہ یا نواب وقار الملک نے جیسا کہ اُن کو حیدرآباد سے خطاب ملا ہے مجھ سے درخواست[1] کی ہے (میں ان کا خط ملفوف کرتا ہوں) کہ میں اُن کو آپ سے ملنے کے لئے ایک تعارفی چھٹی دوں۔ میں خیال کرتا ہوں

[1] نواب وقار الملک نے سر ڈینس سے اس لئے تعارفی خط کی خواہش کی تھی کہ پولیٹکل معاملات میں ان سے ہی زیادہ تعلق رہا تھا اور مسٹر پلاوڈن کو اس وقت تک صرف ۱۱ مہینے گذرے تھے۔

کہ اس قسم کا خط ٹر یور چیو ڈن کے پاس سے آتا تو زیادہ مناسب تھا جو کہ حیدرآباد میں میرے جانشین ہوئے اور جن کا اس وقت تک کا علم مجھ سے زیادہ ہے۔ لیکن میرے حیدرآباد کے زمانہ میں چونکہ مشتاق حسین وزیر کے دست راست تھے اور وہ وہی شخص تھے جن سے میرا اکثر کام پڑتا تھا اور چونکہ میں نے حیدرآباد میں کافی مدت رہ کر اُن کے کیرکٹر کا اندازہ کر لیا ہے لہذا میں جانتا ہوں کہ اپنے اس رائے کا اظہار کرنے سے جو میں نے ان کے کیرکٹر کی نسبت قایم کی تھی انکار کرنا معقول نہیں ہے۔

آپ واقف ہیں کہ حیدرآباد کی حالت برٹش انڈیا کی سی نہیں ہے وہاں وزیر کی ہمیشہ شدید اور تلخ مخالفت رہتی ہے اور جو اس مخالفت کا نتیجہ ہوتا ہے۔ آپ یہ ہرگز امید نہیں کر سکتے کہ وزیر کا معتبر ترین معتمد ٹھیک وہی طریقہ اختیار کرے گا جو ایک اعلیٰ افسر برٹش انڈیا میں کرتا ہے، خاص حد تک اس کو اپنے خاص خاص مددگار معاون سے بہ عنایت اور اپنے خاص خاص مخالفین سے بہ ناراضی پیش آنا ضرور ہو گا اس کام کی تہمت مشتاق حسین پر بھی لگائی جاتی تھی اور اگرچہ جو کچھ اس موقع پر کہا جاتا (میں اپنے ہی زمانہ کی بابت کہتا ہوں) اس میں بہت مبالغہ ہوتا تھا اور جیسا کہ خیال کیا جا سکتا ہے اس میں کسی قدر سچ بھی تھا۔ لیکن ان خیالات کے علاوہ جو کہ ایک حد تک قابلِ معافی ہیں۔ میں مشتاق حسین کے چال چلن کو جب تک میں حیدرآباد میں تھا ہر طرح سے قابلِ تعریف سمجھتا رہا۔

میں نے اُن کے بدترین دشمن کو بھی اس کے سوا اور کچھ کہتے نہ سُنا کہ اُن کا دامن بُرائی سے بالکل پاک ہے، اس ملک کے لوگوں میں جن سے مجھے واسطہ پڑا ہے وہ سب سے زیادہ ایماندار اور کارگزار ہیں اور اُن کی

وہ دانائی جو انہوں نے وزیر نظام اور رزیڈنٹ کے تعلقات درست رکھنے میں کی ہے تعریف سے باہر ہے۔

مجھکو اس قدر اور اضافہ کرنا ہے کہ اگرچہ وہ نہایت ہی گہرے مذہبی مسلمان ہیں لیکن اپنی رائے میں اور دوسرے مذہب کے لوگوں سے تعلقات رکھنے میں وہ نہایت آزاد اور وسیع الخیال ہیں۔

جب میں اس قدر لکھ چکا تھا مجھے خیال ہوا کہ قبل[۱] اس کے کہ میں یہ خط آپ کے پاس بھیجوں مسٹر پلوڈن کے ملاحظہ کے لئے بھیجدینا چاہیئے چنانچہ مسٹر پلوڈن کا جو خط اس کے ساتھ آیا ہے وہ بھی ملفوف کرتا ہوں"

آپ کا نہایت صادق دوست

ڈی فٹز پیٹرک"

انگریز عہدہ داروں کے ساتھ برتاؤ

ریاستوں میں جہاں انگریز عہدہ داروں کے تقرر سے اکثر فوائد حاصل ہوتے ہیں اور نظم ونسق میں خوبی و ترقی پیدا ہوتی ہے وہاں بعض اوقات ایسے نقصانات بھی پہنچ جاتے ہیں جن کی تلافی امکان سے باہر ہو جاتی ہے۔ اگر حکومت کی طرف سے کچھ کمزوری دکھائی جائے یا رعایات کی جائیں تو ان کے اختیارات کی وسعت و قوت فرمانروا کے اختیارات پر بھی غالب آجاتی ہے اور ان کی سزا و جزا تو حکومت کے اختیارات سے قطعی طور پر خارج ہی ہوتی ہے۔

رزیڈنسی اور ایجنسی کی اور کبھی کبھی گورنمنٹ آف انڈیا کی حمایت اور پھر ان کی قومیت کی عظمت انگلش پریس کی تائید خواص و عوام میں ہی نہیں بلکہ مساوی درجہ

---

[۱] رزیڈنسی میں ریاست کے کسی عہدہ دار کے کیرکٹر کے متعلق کوئی ریمارک کرنے کے لئے یہ انتہائی احتیاط ہے۔

کے عہدہ داروں حتیٰ کہ ما فوق افسروں کی نظروں میں ان کو آقا کا درجہ دے دیتی ہے اگر یہ عہدہ دار درباری سازشوں اور پارٹیوں میں شامل ہو جائیں تو اکثر و بیشتر ان کی ہی تدبیروں اور پارٹی کو کامیابی حاصل ہوتی ہے۔

حیدر آباد میں بھی اس قسم کے چند انگریز ماتحت عہدہ دار تھے اور رزیڈنسی وزارت پر ان کا کافی اثر و نفوذ تھا ان سب میں کرنل مارشل بہت مقتدر تھے جن کی وجہ سے حکومتِ نظام کو بھی مشکلات کا سامنا ہوا تھا جیسا کہ اڈلین عرضداشت میں تذکرہ ہے۔

نواب وقار الملک انہیں وجوہ سے انگریزوں کا اعلیٰ عہدوں پر زیادہ تقرر مناسب نہیں سمجھتے تھے چنانچہ انہیں کی حکمتِ عملی تھی کہ ایک سال کے اندر ۱۸۸۸ء میں کرنل مارشل کی واپسی عمل میں آئی لیکن جن صیغوں میں ان کی خدمات کی ضرورت تصور کی جاتی اُن سے استفادہ میں کوئی تعصّب یا عُذر نہ ہوتا اور سرکاری و سماجی تعلقات میں نہایت وسیع القلبی سے کام لیتے لیکن حدود و اختیارات کا لحاظ بدرجہ اتم رہتا۔

مسٹر ڈنلاپ سی۔آئی۔ای جو عرصہ تک ان کے ماتحت رہے اور بعد کو معتمد مالگذاری کے عہدہ پر سرفراز ہوئے (اپنے خط مورخہ ۲۷ ستمبر ۱۹۲۰ء موسومہ مولف میں) نواب صاحب کے کیرکٹر اور اپنے تعلقات کی نسبت لکھتے ہیں کہ:۔

"جس زمانہ میں کہ نواب وقار الملک ریونیو سکرٹری تھے اس وقت کے وزیر اعظم سر آسمان جاہ بہادر ان کی بہت عزّت کرتے تھے اور فی الحقیقت وہ ریاست کے تمام معاملات میں وزیر اعظم کے مشیر خاص تھے اور اسی وجہ سے ان کے ذمہ مختلف اقسام کے کام کا اس قدر بار تھا جو ایک عہدہ دار نہیں کر سکتا ہے۔

لیکن وہ نہایت جفاکش، اعلیٰ اصول کے بے حد پابند، ایماندار پبلک کے ہمدرد اور ریاست کے ایک قابل قدر ملازم تھے، ان کے ساتھ میرے تعلقات ۱۸۸۵ء سے شروع ہوئے تھے اور اُن کی واپسی کے وقت تک جو خوش اسلوبی کے ساتھ عمل میں آئی قایم رہے اگرچہ ہمیشہ وہ انتظامی تجاویز کو میرے نقطۂ خیال سے نہیں دیکھتے تھے لیکن اس اختلاف رائے سے میرے دوستانہ تعلقات میں کبھی فرق نہ آیا وہ ہر وقت کُل تجاویز کے موافق و مخالف دلائل سُننے کے لئے تیار رہتے تھے اور معقول دلائل تسلیم کر لیتے تھے اور میں یہ بات اس زمانہ کے متعلق کہتا ہوں جب میں اضلاع تلنگانہ میں بندوبست کرنے کے متعلق قواعد تیار کر رہا تھا اور اس کام میں نواب وقارالملک بہادر نے میری بہت کچھ اعانت وتائید کی تھی"۔

ماتحت عہدہ داروں کی عقیدت

حیدرآباد میں ان کی واپسی اور رحلت کے بعد بہت سے ایسے عہدہ دار تھے جو اُن کے ماتحت اور رفیق کار رہے تھے اور بلا استثنا سب ہی ان کی محنت و قابلیت اور عظمت کے بیان میں رطب اللسان تھے۔

مؤلف سوانح نے فراہمی مواد کے زمانہ میں اکثر ایسے اصحاب سے واقعات حاصل کرنے کے لئے ملاقات کی جن کو نواب صاحب کی ماتحتی میں کام کرنے کے مواقع حاصل ہوئے تھے اور سب ہی نے عجیب جوش وعقیدت کے ساتھ حالات بیان کئے اور نوٹ کرائے۔

ان بزرگوں میں مولوی ابوالحسن صاحب بدایونی، مولوی عبدالمجید صاحب بی اے میرٹھی، نواب عزیز جنگ حیدرآبادی اور نواب لطیف یار جنگ وظیفہ یاب صدر مہتمم آبکاری کے نام خاص طور پر قابل الذکر ہیں جن کے قلوب نواب صاحب کی

محبت وعظمت سے معمور ولبریز تھے۔

نواب سر فریدون الدولہ فریدون جنگ بہادر کے سی۔ ایس۔ آئی جنہوں نے ایک بڑے عہدہ دار کی حیثیت سے عرصہ تک ان کے ساتھ کام کیا ہے اور مولف کو ان کی لائف کا مواد فراہم کرنے میں قابلِ شکر گذاری امداد دی۔ اپنے خط مورخہ ۲۹ اپریل ۱۹۲۰ء میں لکھتے ہیں کہ:-

"میرے دل میں ان کی بہت بڑی عظمت و وقعت تھی وہ جفاکش ضمیر کے پابند اور نہایت ایماندار عہدہ دار تھے ان میں قوت عمل اعلیٰ درجہ کی تھی اور پندرہ سولہ گھنٹہ روزانہ کام کرنے کو کچھ نہیں سمجھتے تھے۔

سب سے زیادہ واضح اور دلچسپ وہ بیان ہے جو مولوی بشیرالدین احمد صاحب دہلوی تعلقدار وظیفہ یاب (خلف ڈاکٹر مولوی حافظ نذیر احمد صاحب مرحوم) نے نواب صاحب کی وفات کے بعد اخبارات میں شائع کیا تھا جس میں اپنی ذاتی معلومات سے نواب صاحب کے عہد صوبہ داری و معتمدی پر پوری روشنی ڈالی تھی ہم بھی اس حصہ زندگی کے خاتمہ پر اس کے اہم اقتباسات درج کرتے ہیں۔

یوں تو سالار جنگ کے چنے ہوئے لوگ سب ہی چوٹی کے تھے ایک سے ایک بڑھ چڑھ کر لیکن مولوی مشتاق حسین کی بات ہی کچھ اور تھی۔ ان جامعیت کا آدمی دیکھنے میں نہیں آیا۔ باوجود کہ وہ فقیر منش، نہایت منکسر المزاج متواضع اور بے انتہا خلیق اور ہمدرد تھے لیکن پھر بھی ان کی خودداری، ان کا رعب داب، دیکھنے سے تعلق رکھتا تھا جس نے وہ آن بان اور وہ شان وشوکت دیکھی ہے وہ ہی اس کا کچھ اندازہ کر سکتا ہے ان کا دربار ہر کہہ ومہ کے واسطے ہر وقت کھلا ہوا تھا کسی وقت کی روک ٹوک کسی ادنیٰ سے ادنیٰ ملازم کے واسطے بھی نہ تھی ہر شخص ان تک بہ آسانی

پہنچ کر اپنا درد دُکھ کہہ سکتا تھا اور یہی وجہ تھی کہ ان کی کوٹھی کا وسیع کمپاؤنڈ
صبح سے گیارہ بجے رات تک گاڑیوں اور اہل غرض کے ہجوم سے بھرا رہتا تھا
لیکن وہ فرداً فرداً سب سے ہی ملتے تھے اور کبھی ان کا دل اُکتا تا نہ تھا۔
اکثر ملنے والوں کو وہ کمرے کے دروازے سے لیتے اور وہیں تک پہنچاتے
تھے سب کی بات نہایت غور اور توجہ سے سُنتے تھے اور فوراً دو ٹوک
جواب ہست نیست کا دے دیتے تھے وہ کسی کو بھول کر بھی جھوٹی اُمید
نہ دلاتے تھے۔ بعض ناعاقبت اندیش ان کی اس صاف گوئی سے ملول بھی
ہو جاتے تھے مگر "سخی سے سوم بھلا جو جلدی دے جواب"
حیدرآباد کی امیدواری میں لوگوں کی عمریں بسر ہوگئی ہیں یہی مالگذاری
عمر گذاری مشہور تھی۔ لیکن مولوی صاحب کے عہد میں "کار امروز بہ فردا مگذار"
کا اصول تھا اگرچہ وہ خُلق مجسم اور بالکل ہندوستانی وضع کے سر گھٹے مُلّا تھے
اور نہیں چاہتے تھے کہ کسی کا دل دُکھے مگر پھر بھی حق بات کہنے میں مطلقاً
پس و پیش نہ کرتے تھے۔ آجکل کے زمانہ میں بھلا اس پرانی طرز کے آدمی کا
کیا رعب ہو سکتا ہے مگر اللہ اکبر اُن کا رعب داب کہ ان کے سامنے جاتے کلیجہ
کانپ جاتا تھا اور کبھی کسی کو جھوٹی خوشامد یا غیر مستحق اِدّعا کرنے کی جُرات نہ ہوتی
تھی۔ ان کی "ہاں" اور "نہیں" پتھر کی لکیر تھی وہ بے جا خاطر و مروت
کی آڑ میں کبھی دفع الوقتی کے طور پر کوئی بات زبان سے نکالنا اخلاقی
جرم سمجھتے تھے۔ فلاں کے فلاں ہونا یا سفارش ان کے نزدیک کچھ بھی وقعت
نہ رکھتی تھی بلکہ سفارش سے اور چڑ جاتے تھے جو انصاف اور خالص انصاف
ہوتا تھا وہ ہی کرتے تھے ان کے پاس دوا دوش بالکل بیکار تھی جس کا
حق ہوتا تھا اُسے گھر بیٹھے بے منت پہنچتا تھا ان کے زمانہ میں ملازموں کے

حقوق ان کی ترقیاں کبھی سعی و سفارش خاطر مروت سے نہیں ہوئیں بلکہ محض استحقاق اور لیاقتِ ذاتی سے۔

انہوں نے یہ بھی التزام رکھا تھا کہ کسی بڑے عہدہ پر ایک دم کسی کو مامور نہ کرتے تھے جس سے حکامِ تحت کی حق تلفی اور حرمان ترقی لازم آتی تھی بلکہ چھوٹے سے چھوٹے درجہ سے سلسلہ شروع کرتے تھے اور اس طرح ایک خالی شدہ جائداد کے سلسلہ میں بعض وقت پچاس پچاس آدمیوں کو ترقی ملی ہے اور اس طرح سب کی حق رسی اور اشک شوئی کرتے تھے۔ ان کے اس بے لوث طرزِ عمل نے لوگوں کے دلوں میں یہ خیال راسخ کر دیا تھا کہ اگر ہم دیانت کے ساتھ دل دہی سے اچھا کام کریں گے تو ہماری قدر ہوگی۔ خائن لوگوں نے کچھ ڈر سے اور کچھ مصلحتِ وقت سے اپنی طرز روش بدل دی اگر کسی کو باوجود گریڈ کے ترقی نہیں دی جاتی تھی تو فوراً اسے صیغہ راز سے اطلاع بھی دی جاتی تھی کہ تمہاری نسبت فلاں امر سدِ راہ ہے جبتک اس عیب کو رفع نہ کروگے ترقی سے محروم رہوگے اپنے قول کے ایسے پکے تھے کہ دنیا اِدھر کی اُدھر ہو جائے مگر ان کا وعدہ کبھی خلاف نہیں ہوتا تھا۔ اگر احیاناً غلطی واقعات کی بنا پر کوئی غلط حکم نکل چکا ہو تو سمجھانے سے اپنے حکم کو فوراً معذرت کے ساتھ واپس بھی لے لیتے تھے۔

میں نے عموماً یہ دیکھا ہے کہ بڑے بڑے عہدہ دار بڑے بڑے عہدہ داروں کے حال سے واقف رہتے ہیں کیونکہ انہیں کی رسائی ان تک ہے مگر چھوٹے چھوٹے ملازموں کی انہیں کچھ خبر نہیں رہتی حتیٰ کہ تحصیلدار اور پیشکار تحصیل کو بھی نہیں جانتے اور جانیں کیسے جب ان بیچاروں کے پر وہاں جاتے ہوئے جلتے ہوں۔ مگر ہماری کچھ سمجھ میں

نہیں آتا کہ مرحوم نے کون سا ڈپٹی کلکٹور کھا تھا کہ تحصیلدار تو ایک بڑا عہدہ دار ہے
بلا مبالغہ و خوف تردید میں کہہ سکتا ہوں کہ وہ مفصلات کے دس دس اور
بیس بیس روپے کے عملوں کے حالات سے ایسی ذاتی واقفیت تامہ رکھتے تھے
کہ ہم رات دن کے ملنے والوں کو خبر نہ تھی وہ اپنے ماتحتوں کی پرائیوٹ لائف
اور طرز روش کے سخت نگراں تھے اور اس وجہ سے بد روش اشخاص سے سخت
متنفر تھے وہ اکثر خانگی معاملات میں بھی دخل دیتے تھے اور نہ صرف دخل دیتے تھے
بلکہ سرکاری طور پر اسے ڈانٹتے تھے میں نے دیکھا ہے کہ وہ اپنے قلم خاص سے
صیغہ راز میں اس طرح کہ ان کے اور مکتوب الیہ کے سوا کانوں کان خبر نہ ہو مشفقانہ
اور بزرگانہ تنبیہ کرتے تھے اور موقع دیتے تھے کہ فلاں عادتِ بد چھوڑی جائے
اور فلاں بات کی اصلاح کر کے مجھے مطمئن کیجئے ورنہ میں سرکاری طور پر نوٹس
لینے پر مجبور رہوں گا۔ ایسی عام اور زبردست نگرانی اور باخبری کی وجہ سے
لوگوں کے دلوں میں ایک ایسی دہشت بیٹھ گئی تھی کہ وہ راتوں کو چونک چونک
پڑتے تھے۔ اور ہر شخص یہ سمجھتا تھا کہ مشتاق حسین ہر دو میں کا تیسرا موجود ہے
ایسا نہ ہو کہ خبر ہو جائے تو بس شامت آئی دھری ہے۔

غریب رعایا سے انہیں ہمدردی نہیں عشق تھا دورے کے زمانہ میں
سب سے پہلے وہ چماروں کی جھونپڑیوں، بڑھئی، لوہار، دھوبی معمولی سے
معمولی کاشتکاروں کے مکانوں میں بہ نفس نفیس جاتے اور وہاں ان کی
ٹوٹی کھٹیا، یا کمبل یا بوریئے پر بیٹھ کر گھنٹوں ان کے حالات پوچھ کر نوٹ کرتے
کہیں بیگار تو مفت نہیں لی گئی۔ بنیوں پر عہدہ داروں کا ظلم تو نہیں سامان
رسد کے دام برابر خوش خریدی دیے جاتے ہیں یا حکومت کے دباؤ سے
کام نکلتا ہے رعایا کے ساتھ عہدہ داروں کا سلوک کیا ہے۔ جہاں کہیں

شکایت ہوئی بس جان کو آجاتے تھے یہاں تک کہ انہوں نے کئی ملازموں کو ایسی ہی شکایت پر موقوف کر دیا۔ ایک دوم تعلقدار (جائنٹ مجسٹریٹ) کو محض اس بات پر برخاست کیا کہ وہ رعایا کے ساتھ سختی کا برتاؤ کرتے تھے اور صاف کہہ دیا "کہ سرکار ایسے درندہ خصلت عُہدہ داروں سے اپنی سروس کو پاک کرنا چاہتے ہیں" ایک سوم تعلقدار (ڈپٹی کلکٹر) کو دورے کے غلط اور فرضی مقامات لکھنے میں موقوف کیا ایک اہلکار کو جس کی تنخواہ صرف دس بارہ روپئے تھی سُنا کہ اس نے کوئی طوائف رکھی ہے اور سواری کے لئے ایک ٹٹوانی بھی رکھی ہے موقوف کر دیا۔..........................

اکثر حیدرآباد میں بڑے بڑے اُمرائے کے صاحبزادے اور خود مُرشد زادے ملازم ہیں اور بعض ان میں سے وسائل کے گھمنڈ میں بہت آزادی برتتے ہیں مگر مولوی صاحب کے زمانہ میں شیر بکری ایک گھاٹ پانی پیتے تھے اور دودھ کا دودھ اور پانی کا پانی ہوتا تھا جس کی ہزاروں مثالیں موجود ہیں۔

....

خود میری نسبت ایک مرتبہ صوبہ داری (کمشنری) سے تبادلہ کی تحریک محض مولوی چراغ علی کی خاطر سے ان کے بھائی ولایت علی صاحب کے خوش کرنے کو کی گئی اور وجہ یہ لکھی گئی کہ سنگاریڈی کی آب وہوا ناقص ہے اور بیدر کی آب وہوا بہ لحاظ عمدگی مشہور ہے بیدر سے سنگاریڈی ولایت علی صاحب کے ساتھ بدل دیا جائے مرحوم نے اس کا جواب یہ دیا کہ ولایت علی صاحب نے ایسی کیا کارگذاری کی ہے کہ وہ ایک خوش آب وہوا مقام پر بدلے جائیں اور بشیر الدین احمد نے ایسا کیا قصور کیا ہے کہ وہ بے وجہ اپنے مقام سے ہٹائے جائیں۔ سرکار کے نزدیک دونوں عُہدہ دار برابر ہیں۔ یہ ترجیح بلا مرجح کیوں

جب تک بشیرالدین احمد کی ترقی نہ ہو (جو عنقریب ہونے والی ہے) وہ بیدر سے ہٹائے نہیں جا سکتے۔

اسی طرح ایک تعلقدار صاحب (کلکٹر ضلع) اور صوبہ دار صاحب سے کسی بات پر شکر رنجی ہو گئی۔ تعلقدار بڑے طنطنہ کے آدمی تھے گرم دیکھا نہ سرد جھٹ استعفیٰ ہی دھر گھسیٹا۔ مولوی صاحب نے تعلقدار کو تو یہ لکھا کہ "آپ کا استعفیٰ پہنچا اسے دیکھ کر مجھے افسوس ہوا لیکن قبل اس کے کہ "میں آپ کے استعفٰے کو سرکار کے ملاحظہ میں پیش کروں میں مناسب سمجھتا ہوں کہ آپ کی خدمت میں عرض کروں کہ سرکار کو آپ کے استعفٰے کے منظور کرنے میں غالباً کچھ بھی تامل نہ ہوگا۔ سرکار کو بہتر سے بہتر تعلقہ دار ہر وقت مل سکتا ہے لیکن آپ کو براہ مہربانی غور کر لینا چاہیے کہ آپ کو بھی تعلقہ داری کہیں اور مل سکے گی یا نہیں اور اسی طرح صوبہ دار صاحب کو بھی چشم نمائی کی کہ تعلقہ دار ضلع کے عہدہ کی وقعت کا خیال آپ کو ہمیشہ مدنظر رکھنا چاہیے تعلقہ دار کا عہدہ ایسا نہیں ہے کہ محض صوبہ دار کی مرضی پر وہ ہٹا یا جا سکے بالا دستوں کا فرض ہے کہ وہ اپنے ماتحتوں سے حُسنِ سلوک سے پیش آئیں اور پھر لطف یہ کہ ایک کو دوسرے کی خبر نہیں کہ کیا لکھا گیا۔ نتیجہ یہ کہ دونوں حد اعتدال پر آگئے اور معاملہ رفع دفع ہو گیا۔

خلاصہ یہ کہ دکن میں اس سطوت و جبروت اس دیانت و راستبازی اور مستقل مزاجی کا عہدہ دار دیکھنے میں نہیں آیا اور گو برسوں ان کو دکن چھوڑے ہوئے ہوئے مگر ان کا زمانہ ہر اعتبار سے اب تک ضرب المثل ہے اور مدتوں رہے گا۔"

الفضل ما شہدت بہ الاعدا | مذکورہ بالا بیانات تو اُن اصحاب کے ہیں

جن کو نواب وقار الملک کے ساتھ خلوص و عقیدت کا تعلق تھا لیکن ذیل میں ہم نواب سرور جنگ کی کتاب "کارنامہ سروری"[۵۱] سے ایک اقتباس نقل کرتے ہیں جو باوجود تعریض کے الفضل ما شہدت بہ الاعدا کے لحاظ سے نہایت اہم اور وقیع بیان اور ان کے اعلیٰ کیرکٹر کا کامل اعتراف ہے۔

" مولوی مشتاق حسین میں سوائے ضد اور ہٹ کے اور کوئی عیب نہ تھا ریاست کے خیر خواہ وزارت کے بہی خواہ متدین متقی و پرہیزگار محنت وجفاکشی میں تیلی کا بیل شب و روز قلم و دوات کاغذ سے سروکار۔ مگرچوں کہ بڑے مولوی تھے بلند پروازی میں کبھی ایک منزل کوٹھے سے زیادہ نہ اُڑسکے یہ سمجھ کر کہ ہر طرف سے سازش کا سدّ باب ہوگیا ریاست کی گاڑی کو ریل گاڑی کی رفتار پر دھوم دھام سے چلانے لگے اور حق یہ ہے کہ مولوی مشتاق حسین کی محنت وجفاکشی اور سید حسین[۵۲] صاحب کی رفاقت نے ریاست کو رونق خاص بخشدی ان کی خوش قسمتی سے سر ڈینس فٹنز پیٹرک[۵۳] سا سن رسیدہ نامور رکن حکومت انگریزی رزیڈنٹ بن کر حیدرآباد گئے اور وہ کمال قوت سے ان حضرات کے حامی ہوگئے۔

---

[۵۱] یہ کتاب نواب سرور جنگ نے حیدرآباد سے واپسی کے بعد "مائی لائف" کے نام سے شائع کی اور اب تقریباً تیس سال بعد ۱۹۳۴ء میں اردو میں شائع ہوئی۔ کتاب کا بڑا حصہ حیدرآباد کے سازشی واقعات سے معمور ہے جن کے بیان میں خود ستائی اور دوسروں کی تنقیص کا ایک خاص طرز اختیار کیا گیا ہے بہت ہی کم عہدہ دار ایسے خوش قسمت ہیں جو سرور جنگی قلم کا نشانہ نہیں بنے۔

[۵۲] نواب عماد الملک رحلت ۱۹۲۶ء

[۵۳] رزیڈنٹ ۱۶ اگست ۱۸۸۹ء تا ۱۱ نومبر ۱۸۹۱ء۔

باب چہارم

زمانہ حیدرآباد میں ایم اے او کالج کی امداد

باوجودیکہ حیدرآباد میں منصبی فرائض کے باعث انتہائی عدیم الفرصتی تھی۔ لیکن کالج کے معاملات میں ہمیشہ اور پوری مستعدی کے ساتھ حصہ لیتے رہے اور اپنے اثر سے گرانقدر فوائد پہونچائے۔

۱۸۸۸ء میں جب سر آسمان جاہ نے علی گڑھ میں چند گھنٹے قیام کیا تو ڈھائی سو روپیہ سالانہ کا گرانٹ میں اضافہ کرایا اس کے علاوہ بھی ان کی جیب خاص سے گرانقدر عطیات دلوائے، اور آسمان منزل کی تعمیر کے لئے اہالیان حیدرآباد سے کثیر چندہ بھی وصول کرایا۔

مسودۂ قانون ٹرسٹیز بل سے اختلاف

ابھی تک کالج کی عام نگرانی کے لئے مجلس خزینۃ البضاعت (ایم اے او کالج فنڈ کمیٹی) قائم تھی جس کے قواعد رجسٹری شدہ تھے اور تمام کاروبار ان ہی قواعد کے تحت ہوتا تھا لیکن اب کالج کی ترقی خاص حالات اور موثر مشوروں کے لحاظ سے جدید قانون و قواعد وضع کرنے کی ضرورت پیش آئی۔

چنانچہ ۱۸۸۹ء میں سرسید نے مسٹر اسٹریچی بیرسٹرایٹ لاء آنریبل سید محمود اور مسٹر تھیوڈر بیک کے مشورہ سے یہ قواعد و قوانین مرتب کرائے لیکن اس جدید وضع و ترتیب میں سرسید کے یورپین دوستوں کی یہ صلاح زیادہ موثر تھی کہ کالج کی بہتری کے لئے یورپین اسٹاف کی کافی طمانیت ہو اور اسکے لئے آنریبل

سید محمود کی جانشینی کا فیصلہ نہایت ضروری اور اہم ہے ساتھ ہی اس خیال و یقین سے کہ یہ کالج جس مقصد اور پالیسی سے قایم کیا گیا ہے سید محمود اس کے متعلق عام صلاح ومشورہ میں شریک غالب رہے ہیں اور اب تمام اہم کام انھیں کی امداد ومشورہ سے انجام پاتے ہیں اور سوائے ان کے اور کوئی شخص کالج کو اس کے مقاصد کے لحاظ سے نہیں چلا سکتا۔ تجویز کیا گیا کہ بالفعل سید محمود جائنٹ سکریٹری ہوں اور بعد کو لائف آنریری سکریٹری ہوجائیں۔ اس کے علاوہ گورنمنٹ کے اختیارات بھی رکھے گئے۔ اور پرنسپل کو بھی نہایت وسیع اختیارات دئے گئے اور بورڈنگ ہاؤس کی نگرانی بھی کُلیتہً تفویض ہوئی اس مسودہ کے شائع ہوتے ہی اکثر ذمہ دار ٹرسٹیوں نے بعض امور کے متعلق ناپسندیدگی ظاہر کی اور بالخصوص پرنسپل کے اختیارات اور آیندہ جانشینی کا معاملہ اہم ترین اختلافی مسئلہ بن گیا۔ ٹرسٹیوں میں دو زبردست فریق قایم ہو گئے۔ مخالف فریق کے قائد مولوی سمیع اللہ خاں سی۔ ایم۔ جی تھے جو کالج کی بنا و قیام میں سرسید کے برابر شریک کار تھے۔

دوسرا فریق خود سرسید کا تھا جس نے اس مسودہ کی زبردست تائید کی۔ دونوں طرف سے تائیدی واختلافی مضامین شائع ہوے اور اس اختلاف نے ناگوار صورت اختیار کر لی۔

نواب صاحب بھی سرسید کی اس کارروائی سے متفق نہ تھے اُنھوں نے نہایت ادب سے اوّلاً خطوط کے ذریعہ سمجھایا اور رخصت لے کر آنے اور اصلاح اور قواعد کو جدید اصول پر وضع کرنے کا ارادہ ظاہر کیا لیکن معاملہ نے اِس قدر طوالت اختیار کر لی تھی کہ سرسید اپنی رائے کے خلاف ایک لفظ سُننا بھی پسند نہ کرتے تھے انھوں نے نواب صاحب کو ایک طولانی خط لکھا جس کے چند فقرات ذیل سے

اندازہ ہوگا کہ معاملہ کس نوبت پر تھا۔

"سب سے اوّل مجھ کو یہ بات صاف صاف کہدینی چاہئے کہ جانشینی کا معاملہ اب اس حد سے گزر گیا ہے کہ اس میں ترمیم ہو سکے اب وہ ملتوی نہیں رہ سکتا ادھر یا اُدھر آپ اس سے اختلاف کریں مجھ کو بلا شبہہ افسوس ہوگا مگر آپ کی نسبت اور کوئی خیال بجز اس کے کہ آپ کی یہی رائے تھی میں ہرگز نہیں کر سکنے کا اس کا نتیجہ یہ ہوگا کہ جب ووٹ گنے جاویں گے آپ کا ووٹ بھی مخالف جانب رکھ دیا جاوے گا۔

ذرا مجھ کو یہ بات سمجھا تو دو کہ سید محمود کا تقرر خواہ ضروری تھا یا نہ تھا یا قبل از وقت تھا مولوی سمیع اللہ خاں کو اس قدر شورش کرنے کی کیا وجہ ہے۔

مولوی سمیع اللہ خاں صاحب نے جو کچھ سید محمود کے نسبت لکھا ہے بلا شبہہ آپ کے دل کو تکلیف ہوئی ہوگی جیسا کہ آپ نے لکھا ہے، مگر اب کیا آپ اس کو قبول کریں گے کہ عملی طور پر ان کی تحریر کی تصدیق کریں۔

یورپین اسٹاف کی نسبت ان کی طمانیت کے لیے جو آپ قواعد بنانا چاہتے ہیں۔ سید محمود کا تقرر ان کا مانع نہیں ہے معہذا قواعد سے کام نہیں چلتا کام آپس کے سلوک سے چلتا ہی قواعد حقوق کا فیصلہ کر سکتے ہیں روز مرّہ کا کام نہیں چلا سکتے۔ قواعد جو بنائے گئے ہیں اس میں پرنسپل کو کوئی ایسے اختیارات نہیں دئے گئے جن کی نسبت مولوی سمیع اللہ خاں کہتے ہیں کہ کون ممبر ہے جو اس بات کو پسند کو کرے گا کہ بورڈنگ ہاؤس ایک عیسائی کے ہاتھ میں رہے مولوی سمیع اللہ خاں کا ایک ایک لفظ شرارت اور خبث طینت سے بھرا ہوا ہے۔ میں ان کا ذکر نا یا ان کی نسبت کچھ لکھنا نہیں چاہتا لیکن اگر آپ کا یہ خیال ہو کہ کسی طرح مسئلہ جانشینی

سید محمود کو چھوڑ دیا جائے تو اس خیال کو دور کر دیجئے اگر ووٹ کثرت سے
برخلاف اس کے فرض کرو ہوں تو میں مدرسہ کو چھوڑ دوں گا ایک کام کیا
تھا نہ چل سکا۔

آپ کا یہ خیال کہ آپ رخصت لے کر آئیں اور کچھ اصلاح کریں بالکل
غلط خیال ہے میں نے مولوی سمیع اللہ کے ساتھ وہ برتاؤ کیا کہ شاید کوئی
شخص جس میں ذرا بھی نفسِ انسانی ہو نہیں کر سکتا۔ لیکن اب مجھ سے
نہیں ہو سکتا۔ اگر کسی مجلس میں وہ اور میں جمع ہو جاویں گے تو آپ سُن
لیں گے کہ وہ معاملات پیش آئے جو پاجی سے پاجی اور شہدوں میں بھی
نہیں ہوتے اور کیا عجب ہے کہ دونوں فوجداری کی حوالات میں تشریف
لے جاویں۔

میں قبول کروں گا کہ تمام نالائقی میری ہے بہتر ہے، میں نالائق، پاجی،
جو کچھ کہو، سو سہی، آپ کو میری طبیعت کا حال معلوم ہو گیا ہو گا بس آپ کو اگر
مسودہ مرتبہ کو بجنسہ منظور کرنا ہے کیجئے نہ منظور کرنا ہے نہ کیجئے زیادہ تحریر سے
مجھے رنج پہنچانا ضرور نہیں، اس وقت میرا دل نہیں چاہتا کہ نسبت چندہ
آسمان منزل کے آپ کی تحریر کا جواب لکھوں پھر کسی وقت اس کی نسبت
لکھوں گا۔[1]

اس معاملہ میں سرسید نے اپنی رائے پر استقامت کی انتہا کر دی اور یہاں تک
دھمکی دی کہ اگر رائے دینے والے اتفاق نہ کریں گے تو وہ صرف سکرٹری کے عہدہ
سے ہی استعفا نہ دیدیں گے بلکہ جو کچھ مدرسہ کے متعلق اس وقت تک ہوا ہے اس کو
ملیامیٹ کر دیں گے لیکن نواب وقار الملک نہ سرسید کی عظمت و احترام سے
مرعوب ہوئے اور نہ ان کے خطوط[1] سے اثر لیا اور نہ سرسید کی عنایت و محبت

[1] یہ متعدد خطوط مجموعۂ خطوط میں شائع ہو چکے ہیں

سے متاثر ہوئے جب کہ بہت سے ذی مرتبہ اور بالخصوص حیدر آباد کے بعض ثقا اور ہم سر اصحاب نے محض ان ہی اثرات سے اپنی رائے کے برخلاف سرسید کی تائید کی۔

اُنہوں نے نہایت جرات و آزادی سے اپنی رائے لکھی اور طبع کرا کے خزینۃ البضاعت کے ممبروں کے پاس بھیجی اور جس مجبوری سے یہ اختلاف کیا اس کو بھی ظاہر کر دیا جو اِن ہی کے الفاظ میں یہ تھی کہ

"میری خود کبھی ہمّت نہ پڑتی کہ میں اس آزادی سے اپنی رائے لکھتا اگر مجھ کو یہ خوف نہ ہوتا کہ ایک دن مرنا ہے اور خدا کے سامنے اپنے اعمال کا جواب بھی دینا ہے اگر ایک خدا کا گناہ ہو جائے تو ممکن ہے کہ اس سے توبہ کریں اور وہ اپنی رحیمی سے بخش دے انسان کے متعلق اگر ایک دو کی نسبت کچھ خطا ہو جائے تو ان سے معذرت کر کے صفائی حاصل کر سکتے ہیں لیکن قوم اور مُلک کا گنہگار کس کس سے اور کہاں کہاں تک اپنا گناہ بخشوا تا پھرے گا تمام عمر بھی اگر صرف ہو جائے تو عہدہ برآ نہیں ہو سکتا۔"

سرسید کو مستقبل کے افکار میں ایک غلط فہمی یہ تھی کہ "قوم میں وہ کون کون افراد ہیں جن کے بھروسہ پر مدرسہ کی آیندہ قسمت کا فیصلہ منحصر کیا جائے اور اُن کے بھروسہ پر انتظام نہ کیا جائے۔" نواب صاحب نے اس غلط فہمی کو رفع کرنے کے لئے لکھا کہ "معلوم ہوتا ہے کہ آپ خدا سے لڑنا چاہتے ہیں (گو کہ کچھ شک نہیں کہ آپ ایسا نہیں چاہتے) مگر نتیجہ اسی قسم کا نکلتا ہے۔ حضور اب تو بُرے ہیں یا بھلے ہیں۔ یہی لوگ ہیں ؎

چہ تواں کرد مرد ماں اینند ‌ ‌ ‌ ‌ با ہمیں مرد ماں بباید ساخت

پیغمبر خدا صلی اللہ علیہ وسلم نے بھی رحلت فرمائی تو ان کا سا کوئی بھی باقی

نہ تھا مگر چلانے والوں نے آخر چلایا ہی جیسا کچھ بھی چلا سکے یہی کیفیت آپ کے مدرسہ کی ہے "

اختلاف کا خاتمہ نتیجہ سرسید کی ہی رائے کے مطابق نکلا ، مولوی سمیع اللہ خاں اور ان کی جماعت کے اکثر اصحاب نے کالج سے اپنا تعلق منقطع کر لیا ، لیکن نواب صاحب نے مجارٹی کے فیصلہ پر سر تسلیم خم کر دیا اور بقول مولانا حالی پہلے سے بھی زیادہ مددگار بن گئے ۔

سرسید کو بلاشبہ اس اختلاف سے جو ان کے نزدیک غیر متوقع تھا اور جس نے مخالف فریق کو قوت دیدی تھی بہت رنج ہوا جو ان کے خطوط میں نمایاں ہے لیکن با ایں ہمہ اِس اختلاف کو کبھی ذاتیات پر محمول نہیں کیا اور جو کچھ سمجھا وہ ان ہی کی عبارت میں یہ تھا کہ " میں کامل یقین کرتا ہوں اور پورے ایمان سے کہتا ہوں کہ تم نے غلطی کی قیامت میں خدا کے سامنے رسول کے سامنے کہوں گا کہ اے میرے دادا رسول خدا میں نے بغیر کسی غرض دینی و دنیوی کے تیری اُمت کی بھلائی کی کوشش میں کوئی دقیقہ باقی نہیں رکھا تھا جن لوگوں نے اس کو برباد کرنا چاہا من جملہ ان کے ایک یہ نواب انتصار جنگ ہیں آپ کہیئے گا کہ میں نے نہایت نیک نیتی سے کیا تھا خدا یقینی آپ کو معاف کرے گا گو میری اور میرے دادا کی تشفی نہو گی باللہ باللہ نہ ہوگی ثم باللہ نہوگی یہ میری رائے ہے آپ کی نسبت ۔ اس وقت تک آپ نے جو کچھ کیا نہ مجھکو یہ یقین ہے کہ آپ نے مولوی سمیع اللہ خاں کے سبب سے کیا اور یہ کسی طرح میری سمجھ میں نہیں آتا کہ آپ نے میرے ساتھ کوئی کینہ دیرینہ نکالا ہے بجز غلطی ناعاقبت اندیشی اور غلط دینداری کے اور کوئی سبب نہیں ہے "

اس معاملہ کے متعلق جو مضامین پمفلٹ اور اخبارات میں شائع ہوتے رہتے تھے

ان میں نواب صاحب کو بھی لپیٹ لیا جاتا تھا لیکن ان پر کسی رنج کا مطلق اثر نہ ہوتا تھا چنانچہ انہوں نے سرسید کو ایک خط میں لکھا کہ "میں آپ کو یقین دلاتا ہوں کہ حیدرآباد کی نوکری نے جس میں ہمیشہ اخباروں کی گالیاں پڑی ہیں ہم لوگوں کو ایسا پاک بے حیا بنا دیا ہے کہ جو اخبار ملک میں کچھ اثر رکھتے ہیں ان کے لکھنے کی بھی یہاں کچھ پروا نہیں ہوتی اور آپ نے تو کچھ بھی نہیں لکھا اور آپ ضرور وہ سب کچھ لکھئے جس سے آپ سمجھتے ہوں کہ پبلک سے کسی غلط فہمی کو آپ رفع کر سکیں گے آپ کا حق ہے کہ آپ ایسا لکھیں .... بہت سے مضامین اسی عرصہ میں اس بحث کے متعلق مشتہر ہوئے ہیں اور جو کوئی مضمون بھی میری نگاہ سے گذرا میں نے اس کو پورا پڑھ لیا ہے مگر کسی مضمون نے بھی (جس میں ایسے بڑے بڑے لکھنے والے بھی تھے جیسے مولوی الطاف حسین صاحب حالی مولوی نذیر احمد صاحب مولوی محمد اور سب سے بڑھ کر خود آپ) مگر خدا شاہد ہے جو میرے دل پر ان کا اتنا بھی اثر ہوا ہو جیسے کہ کان پر جوں رینگتی ہے" لیکن خان صاحب میر ولایت حسین صاحب بی اے سابق سکنڈ ماسٹر کالجیٹ اسکول بیان کرتے ہیں کہ اسی زمانہ میں کالج اسٹاف کے ایک یوروپین ممبر نے کسی انگریزی اخبار (غالباً پانیر) میں یہ شائع کیا کہ مشتاق حسین انگریزوں کو پسند نہیں کرتے تو البتہ نواب صاحب نے ان کو نوٹس دیا اور نتیجہ میں صاحب بہادر کو معافی شائع کرنی پڑی۔

نواب صاحب کے اختلاف سے مخالف پارٹی کو نہایت قوت پہونچ گئی تھی اور پورا یقین تھا کہ وہ نہ صرف اپنی امداد سے دست کش ہو جائیں گے بلکہ حیدرآباد کی امداد میں بھی رکاوٹ پیدا کر دیں گے لیکن یہ صرف خیال ہی خیال تھا انہوں نے اسی سلسلہ میں

سرسید کو لکھا تھا کہ

"ہاں مدرسہ کے چندہ کی نسبت اطمینان رکھئے ان کارروائیوں کا اگر کچھ اثر اس پر پڑا ہے تو وہ یہی ہے کہ پہلے کی بہ نسبت مجکو زیادہ خیال ہو گیا ہے"

نواب صاحب نے اس اختلاف کی ایک خاص اور نرالی قسم کی یادگار بھی تعمیر کیے جانے کی رائے دی اس کے متعلق اُنہوں نے اسی خط میں لکھا کہ "ان ہی تمام جھگڑوں کی وجہ سے ہماری سب کی جن سے آپ بھی مستثنےٰ نہیں ہیں بہت ہی بدنامی ہو گئی ہے مگر جہاں تک میں نے غور کیا ہے مدرسہ کو اب تک اس سے نقصان نہیں پہنچا ہے بلکہ یہ بہت ہی خلاف توقع بات ہی اور صرف آپ کا اقبال کہئے یا آپ کی تعلیم کا اثر ہے کہ باوجود اس سب جھگڑے بکھیڑے کے مدرسہ کی نسبت کسی کا خیال بُرا نہیں ہوا۔

عمدہ اثر قائم رکھنے کے لئے ضروری ہے کہ اس کو عملاً ثابت کیا جاے پس میرا خیال ہے کہ مدرسہ کے مکانات میں سے جن کی ضرورت ہو ایک کسی مکان کو خاص کیا جاے اور اس کے لئے ایک چندہ اس اختلاف کی یادگار میں کھولا جاے کہ باوجود ایسے شدید اختلاف کے ہر ایک فریق کی توجہ مدرسہ کی بہبود کی نسبت یکساں تھی چندہ کا نام اور اس مکان کا نام آپ عمدہ طور سے تجویز کر سکیں گے"

اسی خط میں اُنہوں نے پانچ ہزار کا تخمینہ کیا اور اس کی تعمیر وغیرہ پر اظہار خیال کرنے کے بعد لکھا کہ

"اور بہت زیادہ فائدہ جو اس سے ہوگا وہ یہ ہوگا کہ غیر لوگوں میں ہم اپنی عزت قائم رکھ سکیں گے ورنہ آج کل بہت بری حالت ہو گئی ہے اور اس پہلی عزت میں بہت فرق آتا جاتا ہے پبلک کی نگاہ میں بھی فرق آیا ہے اور یقیناً گورنمنٹ پر بھی اس کا کوئی اچھا اثر نہ ہوگا"

اس عمارت کی تجویز تو نہ ہوئی لیکن نواب حاجی محمد اسمٰعیل خاں صاحب رئیس دتاولی نے سید محمود کی یادگار بنانے کی ایک تجویز پیش کی مگر اس کو ایک قسم کا فتح نامہ بنا کر پیش کیا نواب صاحب نے تحریراً اعتراض کیا لیکن چونکہ تحریک بنفسہ مفید تھی اس کے ساتھ اتفاق کر کے اپنا چندہ ادا کر دیا اس کے علاوہ پہلے ہی سال ۱۸۹۰ء میں جب سر راجہ امیر حسن خان تعلقہ دار محمود آباد (اودھ) نے اپنی سالانہ امداد پانسو روپیہ بند کر لی جس سے بجٹ پر اثر پڑا تو نواب صاحب نے چند دوستوں کے ساتھ اس نقصان کو پورا کرنے میں کوشش کی اور اس کی تلافی کر دی۔

حیدر آباد کے یومیہ میں المضاعف المضاعفہ اور نظام میوزیم کا چندہ

۱۸۹۱ء میں کالج کی ترقی کے لحاظ سے لا کلاس کا قایم ہونا نہایت ضروری تھا اور سرسید اخراجات کی طرف سے بہت پریشان تھے اُنھوں نے نواب صاحب کو لکھا کہ گورنمنٹ نظام کی امداد دوگنی ہو جائے اور نظام میوزیم کی تعمیر کے لئے معقول رقم فراہم ہو جائے تو یہ سب پریشانیاں دور ہوں۔

نواب صاحب نے فوراً کوشش شروع کی کہ سرسید ایک ڈپوٹیشن لے کر آئیں اور اعلیٰ حضرت اڈریس قبول فرمائیں چنانچہ یہ کوشش کامیاب ہوئی۔ سرسید کو اطلاع دی گئی اور ستمبر ۱۸۹۱ء میں وہ ایک ڈپوٹیشن لے کر حیدر آباد گئے نواب وقار الملک نے اڈریس کی ترتیب کاسکٹ کی تیاری اور دیگر ضروری مراتب کا خود سر انجام کیا اعلیٰ حضرت نے ۱۰ ستمبر کو اڈریس قبول فرمایا اور اس کا حوصلہ افزا جواب دیا اور ۱۲ ستمبر کو ایک ہزار روپیہ ماہانہ اضافہ کا حکم سرسید کے ہاتوں میں پہونچ گیا سرسید کی پارٹی اسپیشل ٹرین کے ذریعہ سے نواب صاحب کے ساتھ ورنگل بھی گئی اور چند گھنٹوں میں عمائد ورنگل نے نظام میوزیم کے لئے چوبیس ہزار

پانسو روپے پیش کر دیئے ۔

سرسید کا شکریہ

اس ڈپوٹیشن کو جو غیر متوقع کامیابی ہوئی اس نے سرسید کے دل پر ایک خاص اثر کیا چنانچہ ۴؍ ستمبر کے خط میں لکھتے ہیں کہ :۔

"حیدر آباد میں جو کچھ ہوا وہ صرف آپ کی عنایت، آپ کی کوشش آپ کی سعی، آپ کی توجہ، مختصراً یہ کہ آپ کی ذات سے ہوا۔ اس کا شکریہ کسی طرح ادا نہیں ہو سکتا"۔

ذاتی امدادیں

نواب صاحب نے ابتدا سے علاوہ دماغی و جسمانی امداد وہ خدمت کے اپنی استطاعت کے تناسب سے ہمیشہ فیاضی کے ساتھ مالی امدادیں بھی کیں ۔ چاہ اخوان الصفا، سٹڈنس، یونین کلب یادگار سید ظہور حسین، محمود منزل، تعمیر عام، خام بورڈنگ ہاوس، پختہ بورڈنگ ہاوس، سالار منزل، اورنٹیل اسکول کلاسز، دیوار احاطۂ کالج اسٹریچی ہال، نظام میوزیم، آسمان منزل، محمود منزل میں سینکڑوں سے ہزاروں تک کی رقمیں دیں ۔ لاکلاس میں ماہانہ چندہ دیا ۱۸۹۱ و ۹۲ء کے بجٹ میں جو کمی آئی اس کے پورا کرنے میں حصہ لیا ۔ دینیات کے وظائف وانعامات کی خاص تحریک کی اور پہلا چندہ تین سو روپیہ کا اپنے پاس سے دیا انٹرمیڈیٹ میں فیل شدہ طلباء جو بوجہ عدم استطاعت فیس ادا کر کے تعلیم جاری نہیں رکھ سکتے تھے ان کی امداد کے لیئے فنڈ کھلوایا اور پانسو روپیہ کے قریب خود امداد دی سرسید جب حیدر آباد گئے ہیں تو بتقریب دورہ ایک ہزار اور معاوضہ دعوت میں پانچسو روپیہ پیش کیئے ۔

سرسید بعض اوقات ان کی طرف سے کسی فنڈ میں خود رقم چندہ

معیّن کرکے یا کسی طالب علم کا وظیفہ مقرر کرکے صرف اطلاع[۵۱] دے دیا کرتے تھے اور وہ رقوم ادا ہوتی رہتی تھیں۔ اسی پر اکتفا نہیں تھا بلکہ دوسرے پر چندہ قائم کرکے ان کی تحویل میں دکھایا جاتا اور ان کا فرض تھا کہ خود ادا کریں یا جس کا چندہ ہے اُس سے وصول کرائیں۔

سرسید نے محمد بن سعد کاتب الواقدی کی تاریخ کے ایک باب کا ترجمہ اُردو فارسی میں کرایا تھا اس کتاب میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے ان فرامین و عہد ناموں کا ذکر ہے جو لوگوں یا قوموں اور والیان ملک کو تحریر فرمائے گئے تھے۔ اور ان وفود کا حال ہے جو آنحضرت صلعم کے حضور میں قوموں کی طرف سے حاضر ہوئے نواب صاحب نے ان تراجم کو متن کے ساتھ طلبہ کی مذہبی تعلیم کے لئے اپنے صرف سے طبع کرا کے تمام کتابیں کالج کو ہدیتاً دیدیں۔

کالج کے علاوہ بھی سرسید بعض غریبوں کی ذاتی امداد کے لئے وقتاً فوقتاً سفارش کرتے نواب صاحب ہمیشہ اس کو خوشی کے ساتھ منظور کرتے تھے۔

نواب صاحب کا معمول تھا کہ جب ان کا اضافہ ہوتا تو ایک ماہ کا اضافہ کالج کے نذر کیا کرتے تھے، غرض ان کی بیش قرار امدادوں سے متاثر ہو کر ۹ ؍ نومبر ۱۸۹۰ء کے انسٹی ٹیوٹ گزٹ میں سرسید نے ایک خاص مضمون بہ عنوان فیاضی نواب انتصار جنگ مولوی مشتاق حسین سپرد قلم کیا تھا جس میں تقریباً مذکورہ بالا فیاضیوں اور اضافوں کا تذکرہ تھا۔ اور بطور تمہید لکھا تھا کہ "ہم دوستوں میں باہم یہ معاہدہ تھا کہ جب کبھی جس دوست کی تنخواہ میں کسی وجہ سے اضافہ ہو تو اُس کو لازم ہے کہ پہلا اضافہ جو ملے وہ مدرستہ العلوم کو دیدے اس بیس برس کے عرصہ میں بہت سے

---

۵۱ ملاحظہ ہوں خطوط سرسید صفحہ ۱۰۹ تا ۱۵۵۔

دوستوں کی تنخواہوں میں وقتاً فوقتاً اضافہ ہوا مگر اس وعدہ کا ایفا بہت ہی کم ہوا ہم کو اس بات کے بیان کرنے سے نہایت خوشی ہے کہ نواب انتصار جنگ بہادر نے اس وعدہ کو پورا کیا ہے حال میں جو ان کی تنخواہ میں پانسو روپیہ ماہوار کا اضافہ ہوا ہے تو اُنہوں نے پہلے مہینہ کی تنخواہ کا اضافہ بہ تعداد پانسو روپیہ کے ہمارے پاس بھیجدیا ہے "الکریم اذا وعد وفا" کو اپنے عمل سے پورا کرکے اپنے آپ کو کریم ثابت کیا ہے جزاہ اللہ خیر الجزا۔

شکریہ خدمات میں ایک یادگار پھر ۱۸۹۱ء میں نواب صاحب کی قومی ہمدردی اور بیش بہا خدمات کے شکریہ میں ان کی یادگار قائم کرنے کی تحریک کرتے ہوئے کہا کہ :-

نواب وقار الملک مولوی مشتاق حسین نے بہ لحاظ قومی ہمدردی کے جو بیش بہا خدمات کالج کی کی ہیں وہ سب صاحبوں کو معلوم ہیں انہوں نے اپنی جیب خاص سے متعدد مرتبہ زر کثیر بطور سبکرپشن کے کالج کو عطا کیا ہے۔ ان کے خاص عطا کئے ہوئے روپیہ سے ایک پختہ بورڈنگ ہاؤس کالج کی عمارتوں میں بنایا گیا ہے۔ اسکول کا بڑا ہال اور مسجد مدرستہ العلوم جس قدر کہ اب تک تیار ہوئی ہے جو نواب بشیر الدولہ سر آسمان جاہ کی بے نظیر فیاضی کی یادگار ہے اس میں بھی اور نیز آسمان منزل کے چندہ فراہم ہونے میں مولوی محمد مشتاق حسین صاحب کی سعی و کوشش کا بہت بڑا حصہ ہے۔

حال میں جو ڈپوٹیشن حیدر آباد میں گیا اس کے تمام اغراض و مطالب کو مولوی محمد مشتاق حسین نے بہ احسن وجوہ بحضور عالی ہز ہائینس نظام اور ہز اکسلنسی سر آسمان جاہ مدار المہام کی خدمت میں پہنچایا جس کا نتیجہ ایسی

فیاضی کی صورت میں ظاہر ہوا جس کی نظیر مسلمانوں کی فلاح و بہتری کے کاموں میں نہیں پائی جاتی۔

علاوہ اس کے ان کی ذاتی جسمانی محنت جو انھوں نے مدرسۃ العلوم میں کی کسی طرح فراموش ہونے کے قابل نہیں ہے.... پس ان کے یہ تمام احسانات اس قابل ہیں کہ ان کی ایک مستقل یادگار مدرسۃ العلوم میں قایم کی جائے۔

اس کے بعد سر سیّد نے عمارات کا تذکرہ کر کے کہا کہ

پس میں تحریک کرتا ہوں کہ بیادگار احسانات مولوی محمد مشتاق حسین یہ عمارت ان کے نام سے موسوم ہو اور مشتاق منزل[له] کہلائے۔"

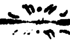
مختلف قومی امدادیں اور مناصب

کالج کے علاوہ اور بعض قومی کاموں میں بھی نواب صاحب اخلاقی اور مالی امدادیں کرتے رہتے تھے اُن کو مدرسہ دیوبند کے استحکام و ترقی کا خاص خیال تھا چنانچہ جب نواب سر آسمان جاہ شملہ گئے ہیں اور وہ بھی ہمراہ تھے تو باوجود اہم مصروفیتوں کے اسٹیشن دیوبند پر مدرسہ کے وفد کی عرضی اور سپاسنامہ پیش کرنے کی منظوری حاصل کی اور جب باریابی کے بعد یہ وفد رخصت ہونے لگا تو سرکار عالی کی جانب سے بارہ سو روپیہ سالانہ کی امداد کا اعلان کیا۔

له۔ یہ عمارت اسٹریچی ہال کے سلسلہ عمارات میں جانب غرب مسجد کے ملحق واقع ہے لیکن ہنوز اس پر کوئی کتبہ نہیں لگایا گیا ہے جس سے معلوم ہو سکے کہ "یہ مشتاق منزل ہے"۔ اس کے مغربی برآمدہ میں چوکھٹ کواڑ لگا کر ریاست نابھہ کے ایک فیاض معطی کی یادگار میں جس کا چندہ ال صحاب خود اسی نے دیا تھا کمرہ قرآن خوانی بنا دیا گیا اور اس طرح ذمہ دار اراکین نے عمارت کے دو حصے کر دیئے۔

لورپول میں مسٹر عبداللہ کیوئلم نے مسلمان ہونے کے بعد تبلیغ و اشاعت اسلام کا مشن قائم کیا تھا تو اُس کی امداد میں خود چندہ دیا اور ایک اپیل شائع کی جس میں ہاں کی ضرورتوں کو بیان کرکے قرآن مجید کے مستند ترجمہ پر زیادہ زور دیا۔ نواب وقارالامرا کی صدارت میں ایک کمیٹی قائم کرائی جس نے معقول رقم فراہم کرکے لورپول بھیجی۔ حجاز ریلوے کے چندے کی جو تحریک شروع ہوئی تھی اُس کو بھی اخلاقی و مالی امداد دی۔

بعض ایسے علما کے جو متوکل تھے اور مذہبی درس وتدریس کا مشغلہ رکھتے تھے مناصب مقرر کرائے۔ اسی ضمن میں مولانا خواجہ الطاف حسین حالؔی کا بھی منصب کرادیا۔ تاکہ وہ سکون واطمینان کے ساتھ علمی کاموں میں مشغول رہیں۔



باب پنجم

وطن کا قیام خانگی ترددات مصروفیتیں اور قومی و ملکی خدمات

حیدر آباد کی پرمشقت زندگی ختم کرنے کے بعد نواب وقار الملک نے اپنے وطن امروہہ میں قیام کیا، مکان محلہ کی گنجان آبادی میں تھا جس میں ضروریات کے لحاظ سے ترمیم کرالی تھی ان کی ذات اعزا کے ساتھ صلہ رحم ہمسایوں کے ساتھ شفقت اور اہل وطن کے ساتھ سلوک کا مجسمہ تھی اب آتے ہی سب کا مرجع بن گئی تمام فرقوں کے ساتھ ان کے دوستانہ تعلقات تھے اور ان تعلقات میں وہی آداب ولحاظ رکھتے تھے جو کسی زمانہ میں ہندوستانی شرفا کا مابہ الامتیاز تھا، اطراف وجوانب میں بعض پیشہ ور قوموں کی بھی آبادی تھی جن کو عرف عام میں اجلاف کہا جاتا ہے ان کے ساتھ بھی اخلاق اور برتاؤ میں نہایت فیاض تھے۔ اور اکثر مختلف قسم کی امداد کرتے رہتے دو ایک دفعہ ایسا موقع بھی آیا کہ ایسے ہی ہمسایوں نے حق آسایش پر بھی دست برد کرلی لیکن نواب صاحب نے ان کی آسایش کو اپنی آسایش اور اپنے حق پر بھی ترجیح دے کر دست برداری کرلی۔

اعزا کی امداد و برادری کی تمدنی اصلاح نواب صاحب کو اگرچہ حیدر آباد میں ڈھائی ہزار روپیہ ماہانہ تک مشاہرہ ملا لیکن ان کی زندگی کفایت شعاری کا نمونہ رہی اور اس کی بڑی وجہ یہ تھی کہ عزیزوں غریبوں محتاجوں اور معذوروں کی حاجتوں اور تکلیفوں سے وہ بے چین رہتے تھے اور اپنی تنخواہ میں ان کو شریک سمجھتے تھے

اور کبھی کسی کو صحیح اندازہ نہوا کہ وہ کتنا حصّہ ان پر خرچ کرتے تھے لیکن اب امروہہ کے قیام میں ان کی آمدنی بہت محدود تھی اور اکثر پریشان و متفکر رہتے تھے، بعض مجبوریوں سے قرض بھی ہو گیا تھا اور حیدر آباد کا مکان فروخت کرنے کی تجویز کر رہے تھے اس سلسلہ میں انہوں نے ایک خط غالباً نواب سر آسمان جاہ کو لکھا ہے جس سے ان کی اس امداد کے جذبہ کا اندازہ ہوتا ہے وہ لکھتے ہیں کہ

دوسرا خرچ جو اپنے مفلس اور واجب الرحم اہل خاندان اور بعض اہل وطن کا اور جس میں میری تنخواہ کا معتدبہ حصّہ صرف ہوتا رہتا تھا اس کی فہرست میں جہاں تک ممکن تھا فدوی نے اس عرصہ میں تخفیف کی، لیکن تاہم اس کی تعداد ڈھائی سو روپیہ ماہوار کلدار یا تین سو حالی کے قریب ہوتی ہے اور اس خرچ سے صرف اسی وقت سبکدوشی ہو سکتی ہے جب کہ میں اپنا دل بالکل پتھر کا بنالوں بلکہ اس سے بھی زیادہ سخت تاکہ بچوں اور بوڑھوں اور بیواؤں کو بے در، بے پَر اور بھوکا ننگا بیمار اور مرتا ہوا دیکھوں اور کچھ پروا نہ کروں۔

میرے اسی وطن امروہہ میں ابھی چند سال قبل ایک نہایت لائق طبیب گزرے ہیں حکیم نثار علی صاحب مرحوم، حکیم صاحب صرف طبیب ہی نہ تھے بلکہ درحقیقت ایک بڑے دانا اور حکیم اور ایک ولی منش کے شخص تھے وہ فرمایا کرتے تھے کہ

روپیہ بغیر مہر شقاوت کے جمع نہیں ہو سکتا۔

پس اگر میں بھی اپنے روپیہ پر مہر شقاوت ثبت نہ کر سکا اور اس لئے مفلس رہا تو مجھ کو کوئی افسوس اپنی اس مفلسی پر نہیں ہے،،

لیکن ایسی ہزاروں رقوم بھی ایک کنبہ برادری کی مصیبت دُور

نہیں کرسکتیں جب تک وہی مصیبت زدہ خود ان کے دور کرنے پر آمادہ نہ ہوں، اس لئے اُنہوں نے اپنے کنبہ اور برادری میں ایک تجویز پیش کی کہ صرف شادی کی چند تقریبات کے مصرف کو بدل کر اس کا روپیہ غریبوں کی امداد میں صرف کیا جائے۔ سب سے پہلے آپ اس پر عمل کیا اپنے قریبی اعزا سے عمل کرایا اور اپنی برادری میں اس طریقہ کو رائج کیا جو ابھی تک کچھ کچھ رائج ہے اور اس میں شک نہیں کہ اس کے نتائج و فوائد بھی نمایاں ہوتے ہیں۔

خانگی افکار و تردّدات

نواب صاحب کا یہ زمانہ نہایت ابتلا اور آزمائش کا تھا عنفوان شباب میں ان کی شادی اپنے قریب ترین خاندان میں ہوئی تھی اور نہایت خوشگوار زندگی تھی خدا نے اولاد کی نعمت بھی عطا کی تھی ایک فرزند محمد احمد تھے اور تین لڑکیاں تھیں محمد احمد کی ابتدائی تعلیم انٹرنس تک علی گڑھ میں ہوئی تھی پھر وہ بیرسٹری کی تعلیم کے لیے انگلستان بھیجے گئے جہاں ۱۸۹۱ء میں تکمیل تعلیم کے بعد ایک انگلش دوشیزہ "مامس شارلٹ فچ" سے عقد کرلیا،[۵]

عقد سے پہلے اُنہوں نے اپنے والدین کو اس ارادہ کی اطلاع کی اور ایک طویل مراسلت کے بعد ان کو اجازت مل گئی، اب نواب صاحب نے ان کو مشورہ دیا کہ مراجعت سے پہلے ممالک یورپ اور ٹرکی کی بھی سیاحت کرلیں چنانچہ وہ سیاحت کرنے کے بعد واپس آئے ایک سال حیدرآباد قیام کرکے مدراس

---

[۵] غالباً اس وقت تک ایسے ازدواج کا یہ پہلا واقعہ تھا اور اسی واقعہ سے متاثر ہو کر سرسید نے کانفرنس کے اجلاس ۱۸۹۲ء میں ایسی شادیوں پر اظہار ناپسندیدگی کا رزولیوشن پیش کیا تھا اور پھر لسان العصر اکبر الہ آبادی نے وہ مشہور نظم لکھی تھی جس کا پہلا شعر یہ ہے کہ ؎

اک بت سیمیں بدن سے کرلیا لندن میں عقد — سُن رہا ہوں دوستوں سے طعنہا دل خراش

میں پریکٹس شروع کی اور بعد ازاں بنگلور[۵۱] میں مستقل سکونت اختیار کرلی۔

نواب صاحب نے اگرچہ یہ اجازت بادلِ ناخواستہ دی لیکن چونکہ بیٹے کا فعل حدود شرع اور اختیار کے اندر تھا اس لئے انہوں نے کوئی ناگواری ظاہر نہیں کی محبت وخوشگواری کے ساتھ خاندانی تعلقات رہے۔

مسز محمد احمد بھی نہایت نیک مزاج اور خلیق وشریف خاتون تھیں انہوں نے باوجود مذہبی ومعاشرتی تباین کے رشتہ داری کے تعلقات کا پورا لحاظ رکھا اور چند ہی دن میں اجنبیت جاتی رہی لیکن بدقسمتی سے محمد احمد کو انگلستان میں شراب کی عادت پڑ گئی جب وہ واپس آئے اور نواب صاحب کو اس عادت کا علم ہوا تو، انہوں نے افہام وتفہیم اور پند ونصیحت سے کام لیا اور امید تھی کہ وہ ترک کردیں گے ہنوز پورا اطمینان نہوا تھا کہ حیدرآبادی انقلاب سے نواب صاحب وطن آ گئے اور محمد احمد بنگلور میں مقیم ہوئے یہاں سے ان کو جو اطلاعات ان کو پہنچیں اس سے بہت زیادہ صدمہ ہوا اور جب تمام تدابیر ناکام ہوئیں تو انہوں نے مسز محمد احمد کو بھی ایک خط[۵۲] لکھا جو اس قابل ہے کہ بطور یادگار ان اوراق میں بجنسہ نقل کردیا جائے۔

---

۵۱ محمد احمد نہایت ذہین اور ہمدرد تھے انہوں نے ٹرکی کے متعلق ۱۸۹۰ء میں لندن کی ایک سوسائٹی کے جلسہ میں نہایت معرکۃ الآرا لکچر دیا تھا جس میں ۱۴۵۳ء تا ۱۸۷۸ء تک کے واقعات تھے بنگلور میں وہ جلد ہی ہر دلعزیز ہو گئے اور بلدیہ اور مسلمانوں کے قیمتی خدمات انجام دیں مذہبی معاملات اور غربا کے مقدمات کی پیروی کی کبھی فیس نہیں لی۔

۵۲ نواب صاحب اردو میں لکھتے تھے اور اس کا ترجمہ عموماً ان کے عزیز وخویش مولوی صبغۃ اللہ صاحب بی اے (علیگ) کیا کرتے تھے، یہ اصل خط بھی اردو میں ہی ہے جس کا ترجمہ بھیجا گیا تھا۔

مائی ڈیر شارلی۔ اپنے خطوط مورخہ ۱۵ ار و ۱۸ اشہر رواں کا شکریہ قبول کیجئے ۱۵ ار کے خطوط کا جواب لکھنا ہی اس لئے ملتوی کر دیا تھا جو تفصیلی خطوط میں اس کے قبل لکھ چکا تھا ان کا جواب بھی آپ کے پاس سے آجائے جس کے آنے کی جلد امید تھی تو ایک ساتھ ہی دونوں خطوں کا جواب لکھوں اور سب سے پہلے بہ لحاظ اس عظیم خلجان اور تکلیف کو جو آپ کو اس معاملہ میں ہوئی میں آپ سے معافی کا خواستگار ہوں اور حقیقت میں میری تمام ہمدردی اس وقت آپ کے ساتھ ہی جبکہ تنہا آپ کو وہاں ان فکروں کی برداشت کرنی پڑی ہی اور اس کے بعد مجھے سب سے پہلے یہ ظاہر کر دینا چاہئے کہ میرا کسی وقت بھی یہ خیال نہیں رہا ہی کہ یہ خراب عادت محمد احمد میں آپ کے گھر والوں کی وجہ سے پیدا ہوئی۔ کیونکہ ہمارے لئے صرف آپ کی ذات ایک عمدہ نمونہ آپ کے تمام خاندانوں والوں کی طرف سے موجود ہی۔

میرا مطلب یہ صرف یہ تھا کہ جو کچھ ہوا انگلستان اور انگلش ناقص تعلیم کی وجہ سے ہوا۔ اور اب میں صرف یہ کہنا چاہتا ہوں کہ جو کچھ بھی ہی کل محمد احمد کی خراب طبیعت کی وجہ سے ہی اور اصل یہ ہی کہ جس قدر آپ نے محمد احمد کی سفارش میں لکھا ہی اس پر اگر ایک بلکہ دو صفر بھی اور بڑھا دئے جائیں جب بھی میرے دل کا اطمینان ایک ایسے شخص کی طرف سے نہیں ہو سکتا جو جنٹلمین کہلائے جانے کا خواہش مند ہو اور سچ بولنا اپنی نزدیک ضرور نہ سمجھتا ہو جس کا کہ آپ کو خود بہت برا تجربہ ہو چکا ہوگا اور جس نے میرا دل ان کی طرف سے کھٹا کر دیا ہی۔ محمد احمد کے چال چلن میں ارادہ اور وعدہ کا پورا کرنا ویسا ہی غیر ضروری رہا ہی جیسا کہ سچ بولنا۔ اور میرے نزدیک یہ تمام خرابی شراب کی وجہ سے ہی۔ اسی لئے ہمارے مذہب میں شراب کو ام الخبائث لکھا ہی یعنی تمام خباثتوں کی ماں انسان جب

نشہ میں ہے۔ تو وہ اپنی طبیعت پر قادر نہیں رہ سکتا اور جب طبیعت پہ قادر نہیں تو پھر کوئی چیز اسکے اختیار میں نہیں ہے یا کسی کسی وقت یا اکثر اوقات اس کا اپنے ہوش و حواس میں ہونا اس سے کوئی اطمینان حاصل نہیں ہو سکتا کیونکہ وہ اصل خواہش بدمستی اور سرور کی ہر وقت اس کی طبیعت پر غالب ہے اور کچھ معلوم نہیں اس کو کب اپنا مغلوب کرلے نشہ کے خوگر لوگوں کی مثال بالکل ایسی ہے جیسے کہ کسی کو باولا کتا کاٹ کھاتا ہے اور کچھ معلوم نہیں ہوتا کہ کس وقت اس کا زہر جوش پیدا کریگا۔ حیدرآباد میں جس روز میں نے ان کے نشہ کو اچھی طرح محسوس کیا وہ ایک ایسا وقت تھا جب وہ ریذیڈنسی کورٹ کو جانے والے تھے اور جب میں نے اُن کی یہ حالت دیکھی تو ان کو بہت سخت منع کیا کہ وہ عدالت کو نہ جاویں مگر ایک نشہ والا شخص اپنے آپ کو نشہ میں نہیں سمجھتا۔ لہذا میرا کہنا کارگر نہوا اور وہ یہ ثابت کرنے کے لئے کہ نشہ میں نہیں مجھ سے چھپ کر عدالت کو چلے گئے اور وہاں جاکر ان کا نشہ اور بھی چمکا اور اُس روز عدالت میں تمام لوگوں نے اس کی نوٹس لی اور بہت سوں نے مجھ سے تعجب اور حیرت کے ساتھ اس کا ذکر کیا۔

خلاصہ یہ ہے کہ جب تک مجھ کو یہ اطمینان نہ ہو کہ کلیتہً محمد احمدؐ نے اس سے اجتناب کیا ہے اور اب کبھی وہ اس خبیث چیز کے پاس نہ جائیں گے اُس وقت تک میرا جی ان کے دیکھنے یا ان سے ملنے کو نہ چاہے گا اور اب پھر مجھ کو یہ کہنا پڑتا ہے کہ جو شخص سچ نہ بولتا ہو اس کی نسبت ایسا اطمینان کیونکر ہو سکتا ہے میں نے درحقیقت ان کی اس قسم کی بیہودگیوں پہ اس قدر ضبط کیا کہ میری صحت پہ اس کی وجہ سے بعض اوقات بہت خراب اثر پہنچتا رہا مگر ہر چیز کی ایک حد ہوتی ہے۔ اب ضرور ہے کہ میں اس کو بھی سوچوں کہ ایک دن مجھ کو مرنا بھی ہے اور خدا کے سامنے جواب دینا ہوگا کہ کیوں میں نے ایک ایسے شخص سے باپ اور بیٹے کے تعلقات قائم رکھے

جس نے خدا کے مذہب کی پرواہ نہیں کی ہو آئندہ اس خرافات کو برداشت نہ کرسکونگا
اور جو کچھ میرے لئے باقی ہو وہ یہ ہو کہ اگر میں اور زیادہ اس باب میں ستایا گیا تو
اس راز کو جس کا ضبط اس دنیا میں میرے لئے مضر صحت اور بدنامی کا موجب
ہو اپنے تمام خاندان اور دوستوں وغیرہ پر ظاہر کردوں گا اور اس کے بعد مجھکو
وہ دشواری نہ رہیگی جس میں اب مبتلا ہوں۔ اس بات کا اعلان عام طور پر کہ
جس بیٹے نے اپنی خاندانی وضع اور مذہب کے خلاف حرکتیں اختیار کی تھیں
میرا اس سے کوئی تعلق نہیں رہا۔ میری اس عزت کی شاید کسی قدر حفاظت
کرسکے۔ جس کی خواہش مجھکو بہ نسبت اپنی زندگی کے اس وقت کے واسطے زیادہ
ہو جب کہ میں اس دنیا میں نہ ہوں گا۔ میں خوب جانتا ہوں کہ کوئی عاقل شخص
میرے اوپر یہ الزام نہ لگاوے گا کہ محمد احمد نے ایسی خراب عادت کیوں اختیار
کی لیکن اگر باوجود ان خراب عادتوں کے میں اپنے پدرانہ تعلقات انکے ساتھ
قائم رکھوں تو بلاشک عندالناس وعنداللہ میں ملزم قرار پاؤں گا۔
قرآن شریف میں آیا ہو کہ تمہارا مال۔ تمہاری اولاد۔ تمہارے لئے ایک
امتحان ہو میری دعا خدا سے یہ ہو کہ وہ اس امتحان میں مجھ کو فیل نہ ہونے دے
اور بہ نسبت معافی کے یہ حال ہو کہ محمد احمد نے جو گناہ کیا ہو وہ اول خدا کا گناہ
میرا درجہ تو اس کے بعد ہو۔ اگر ان کو معذرت کرنی ہے اور معافی کی خواستگاری
ہو تو اول خدا سے معافی چاہیں۔ وہ بلاشبہ غفور الرحیم ہو لیکن ایسی ابالوجی سے
کچھ فائدہ نہ ہوگا۔ جس کی نسبت ایک فارسی شاعر نے کیا خوب کہا ہے ؎

توبہ بر لب سبحہ بر کف دل پر از شوق گناہ
معصیت را خندہ می آید بہ استغفار ما

اگر توبہ کرنی ہے تو صدق دل سے توبہ کریں اور پھر کبھی بھولے سے

اس خبیث چیز کے پاس نہ جاویں اور سچ بولنے کی عادت کریں۔ جو وعدہ کریں مضبوطی کے ساتھ کریں۔ جو ارادہ کریں استقلال کے ساتھ کریں اور پھر اس کو پورا کریں۔ اگر ایسا ہو (اور آپ اس کی گواہی دیں کیونکہ محمد احمد کے بیان پر تو اب میں مطمئن نہیں ہوسکتا) تو مجھ کو بھی گذشتہ باتوں کے بھول جانے میں کوئی عذر نہ ہوگا۔ جن کو میں نے اکثر بھلا دیا۔ اور محمد احمد نے بار بار پھر اس کو یاد دلایا بغیر اس اطمینان کے تو محمد احمد کی موجودگی میں بنگلور کی طرف ایک قدم اُٹھانے کو جی نہیں چاہتا۔ باوجود اپنی بے انتہا مالی مشکلات کے میں خوشی خوشی بنگلور کے سفر کی تدبیروں میں اور خیال میں مصروف رہتا تھا۔ لیکن اس منحوس ۳۰ مارچ نے میرا تمام منصوبہ خراب کر دیا۔ "اے بسا آرزو کہ خاک شدہ"

مجھکو بہت زیادہ افسوس اس بات کا بھی ہے کہ جو خراب نمونہ محمد احمد نے دکھلایا اُس سے اس ملک کو اور خصوصاً مسلمانوں کو بہت زیادہ نقصان پہنچے گا۔ کون باپ ہوگا کہ جو ان حالات پر اطلاع پانے کے بعد پھر اپنے بیٹوں کو اس علی تعلیم کی غرض سے جو ان کو جہنم کے راستہ کی طرف لے جاوے انگلستان کو بھیجے گا۔ میرا ہی ارادہ جمیل احمد کے انگلستان بھیجنے کا تھا مگر اب توبہ کی اور یہ تمام الزام محمد احمد کی گردن پر ہی۔

مجھ کو بہت افسوس ہی کہ مجھ کو خاوند کے معائب بی بی کے سامنے بیان کرنے پڑتے ہیں لیکن اس موقع پر میرا اور اس کا پوزیشن یکساں ہی۔ یعنی جو کچھ کہ اس بات میں ہم دونوں بیان کریں وہ محمد احمد کی فائدہ کی غرض سے ہی اور اس لئے ہی آئندہ وہ ایک ایسے شخص بنیں جو اپنی بی بی اور بچوں اور ماں باپ اور خاندان و قوم کے لئے مسرت کا موجب ہوں نہ کہ باعث نفرت و مضرت۔

ایک واقعہ کا ذکر آپ کے خطوں میں ہے اور محمد احمد کے خطوں میں بھی بار بار ہوا ہے۔ یعنی بنگلور کے کسی مولوی صاحب یا مولوی صاحبوں کا یہ خیال کہ ایک انگلش لیڈی کے ساتھ شادی کرنا محمد احمد کو جائز نہ تھا اور یہ بطور کفارہ کسی مسلمان یتیم لڑکی سے شادی کریں۔ مجھ کو اس بڑے مضحکہ قصہ سے کچھ بھی تعجب نہیں ہوا۔ میں بخوبی واقف ہوں کہ ایسے دیوانے جن سے کسی مذہب کی سوسائٹی بھی خالی نہیں مسلمانوں میں بہت ہیں اور ہر جگہ ہیں اور جو کچھ وہ کہتے ہیں یا وہ محض ان کا تعصب ہے یا خود غرضی نفس اسلام کو اس سے ذرا بھی تعلق نہیں ہے ایسی کسی مولوی کی مثال بالکل انگلستان کے اُن پادریوں کی سی ہے جو اپنے کلیسا میں ایک مسلمان جنٹلمین اور انگلش لیڈی کے نکاح کو خدا کا گناہ سمجھتے تھے جب کہ ان کا علی مذہبی افسر ایک طرف اور مسلمانوں کی مذہبی سوسائٹی دوسری طرف (لورپول) کسی طرح کا عذر نہیں کرتے تھے۔ لیکن تمام مولوی تمام مشائخ ایک سے نہیں ہوتے اور میرا مطلب یہ کسی طرح نہیں ہوگا کہ بنگلور میں جس قسم کے بھی مولوی ہوں ان سے اِس کام میں مدد لی جائے ایسے جو فروش اور گندم نما عالم اور مشائخ ہمارے ہاں اخوان الشیاطین کہلاتے ہیں۔ میرا مطلب صرف یہ تھا اور اب بھی ہے کہ محمد احمد کسی اچھے مسلمان عالم اور مشائخ کی تلاش میں رہیں اور جب کوئی مل جائے تو اس کی صحبت اور نصائح سے فائدہ حاصل کریں اگرچہ ایسے لوگوں کا ملنا آسان نہیں ہے۔

آخر میں مجھ کو پھر اپنے ایک سابق بیان کا اعادہ کرنا چاہئے کہ جس قسم کی تقریر کا میں نے محمد احمد کے ساتھ اظہار کیا ہے اور تعلقات پدری کا خدانخواستہ مجبورانہ حالت میں ان سے منقطع کرنا کسی وقت ضروری ہو جائے۔ ان کا کوئی اثر آپ پر اور آپ کی اولاد پر نہیں ہوگا۔ تم کو ہر وقت میرے اور محمد احمد کی ولد

اور بہنوں کی نسبت یہ کامل یقین رکھنا چاہئے کہ ہندوستان میں بھی آپ کی
حقیقی ماں باپ اور بہنیں موجود ہیں اور حقیقت میں مجھ کو بہت زیادہ افسوس
اس بات کا ہی کہ آپ کے دل کو کس قدر صدمہ ان حالات کی وجہ سے ہوتا ہوگا
اور زیادہ اس لئے کہ وہاں تمھارے پاس ایک شخص بھی ایسا نہیں ہے
جس سے کوئی مدد یا مشورہ ایسے وقت میں لیا جائے اور صرف تمھاری تنہائی
ہمیں اس بات پر آمادہ کرتی ہی کہ ہم لوگوں کو چند مہینہ کے لئے بنگلور آنا چاہئے۔
گو کہ وہ مطلب ہمارے وہاں آنے سے بھی حاصل نہ ہوگا۔ کیونکہ ایک لفظ بھی
اس وقت تک آپ ہم لوگوں سے یا ہم لوگ آپ سے بیان نہیں کرسکتے جب تک
کوئی مترجم موجود نہ ہو۔ اور کچھ معلوم نہیں کہ کب تک آپ اس کو گوارا کریں گی
اس قدر اور بھی مجھ کو کہدینا چاہئے کہ اس وقت میرے اور صبغت اللہ کے
کے سوا اور کسی کو اس تمام خط وکتابت اور حالات میں سے ایک نقطہ کا بھی علم
حاصل نہیں ہوا ہی۔ گو کہ کچھ معلوم نہیں کہ آیندہ بدقسمتی عام طور پر افشائے راز پر
مجبور کرتی ہی یا خوش قسمتی اس سب کو نسیاً منسیاً کردے گی۔

مائی ڈیر شارلی۔ اس میں مطلق شک نہیں کہ مجھ کو اس حال کے موقع سے
جس قدر رنج پہونچا اور اس کی نسبت یہ تمیز بہت ہی مشکل ہی کہ محمد احمد کے مرنے
کی خبر اسی قدر رنج دیتی یا اس سے کچھ کم۔ مگر میں اس قدر ضدی بھی نہیں ہوں کہ
اگر درحقیقت آیندہ کے لئے کامل اطمینان اس بات کا ہو جائے کہ مطلقاً اسی
طرح کمبخت شراب سے اجتناب کیا گیا جیسا کہ ہمارے مذہب میں حکم ہے اور
کوئی وقت اور کوئی مقدار بھی مستثنیٰ نہیں کرسکتی تو بھی میں گذشتہ کو فراموش نہ کروں۔
جب خدا گناہ بخش دیتا ہی تو بندہ کو بھی اس کی اطاعت ضرور ہی۔

بیٹے کی موت۔ اس خط کے بعد غالباً محمد احمدؒ نے توبۃ النصوح کی کیوں کہ

پھر کوئی تحریر اس قسم کی نہیں ملی جس سے بیزاری کا اظہار ہو ۱۸۹۶ء میں محمد احمد علیل ہو گئے اور چند روزہ علالت کے بعد ۷ ستمبر مطابق ۱۰ ربیع الثانی ۱۳۱۴ھ کو بوقت شب ۲۸ سال کی عمر میں انتقال ہو گیا نواب صاحب دوران علالت ہی میں پہونچ گئے تھے اُنہوں نے تسلیم و رضا کے ساتھ صدمہ برداشت کیا۔

اس حادثہ پر بنگلور کے تمام مسلمانوں اور دوسرے فرقوں نے رنج والم کا اظہار کیا۔ صبح ہوتے ہوتے تمام معززین کوٹھی پر جمع ہو گئے جنازہ کی نماز مسجد جامع میں ہوئی اور گیارہ بجے وہاں کے مشہور قبرستان میں جہاں بڑے بڑے اکابر مشائخ اسلام کے مزار ہیں تدفین ہوئی۔ رزیڈنٹ میسور ہر ہائینس مہارانی ریجنٹ اور دیوان میسور نے مراسم تعزیت ادا کئے دو تین دن بعد نواب صاحب بیوہ بہو اور خورد سال پوتی حمید فاطمہ کو ہمراہ لے کر وطن آ گئے۔

پوتی کے مذہب کا مسئلہ

حمید فاطمہ کی عمر ہنوز پورے چار سال کی بھی نہ تھی مسز محمد احمد جوان اور مذہباً عیسائی تھیں ان کا ہندوستان میں رہنا بھی متیقن نہ تھا اس لئے نواب صاحب کو پوتی کے متعلق قدرتی طور پر تردد تھا۔ شرعاً دادا کا حق ولایت مگر عمر کے لحاظ سے ماں کا حق حضانت مسلم تھا محمد احمد کے انگلستان جانے کی صورت میں حمید فاطمہ کو جدا کرنے اور عیسائی ماں کی تربیت میں رکھنے سے مذہب کے لئے خطرہ تھا۔

اس کے متعلق نواب صاحب نے مولوی سمیع اللہ خاں صاحب سے مشورہ کیا جو مقنن بھی تھے اور فقیہہ و عالم بھی، انہوں نے بہ استحقاق ولایت نکاح کر دینے کا مشورہ دیا مگر نواب صاحب نے اس پر عمل نہیں کیا بلکہ نہایت شان کے ساتھ حمید فاطمہ کی بسم اللہ کی تقریب کی اور کنبہ برادری، دوست، عزیز قریب احباب سب کو مدعو کیا اس تقریب کا مقصد یہ تھا کہ پوتی کے مذہب کے متعلق پوری شہرت ہو جائے۔

صدمات کا تواتر ہنوز بیٹے کا صدمہ تازہ تھا کہ ۲۰ ستمبر ۱۸۹۷ء کو نواب صاحب کی رفیقۂ حیات نے رحلت کی اور دو مہینے پورے نہ ہوئے تھے کہ حمید فاطمہ کا بھی چار پانچ دن تخمہ میں مبتلا رہنے کے بعد انتقال ہو گیا۔

اب مسز محمدؐ احمد کے لئے ہندوستان میں کوئی دل بستگی باقی نہ رہی اُنہوں نے وطن جانے کی اجازت چاہی نواب صاحب بھی بمبئی پہنچانے گئے اور تختۂ جہاز پر خدا حافظ کہا اور کل مصارف سفر دئے۔

اگرچہ مسز محمدؐ احمدؐ کا مائکہ خوش حال اور ان کا کفیل تھا تاہم نواب صاحب ایک معقول رقم جیب خرچ کے لئے دیتے رہے پھر چونکہ ایک وصیت کی رو سے خود ان کو معقول ترکہ حاصل ہو گیا تو اُس وقت انتہائی اصرار کے باوجود انہوں نے معینہ ماہوار لینے سے معذرت کی۔

یہاں سے جانے کے بعد برابر خط و کتابت جاری رہی اور ان تمام خطوں میں ان ہی عزیزانہ تعلقات کی جھلک قایم تھی۔

نواب صاحب نے ایک نہایت شفقت آمیز خط میں ان کو نکاح ثانی کی بھی ترغیب دی اور لکھا کہ:۔

"اگر ایسی حالت آپ کی یہاں کی کسی بہن کی یعنی میری لڑکی کی ہوتی ان کو بھی میں یہ ہی مشورہ دیتا اور کوشش کرتا کہ میرے مشورہ کے مطابق عمل کیا جاوے۔ . . . .

اور سب سے بڑی بات جو مجھ کو اپنے مشورہ پر عمل ہوتا ہوا دیکھنے سے حاصل ہو گی وہ یہ ہوگی کہ اپنے دم واپسیں کے وقت مجھ کو آپ کی ناکامیوں کے رنج و خیال سے کوئی تکلیف نہ ہو گی اور میں اطمینان کے ساتھ اس دُنیا سے کوچ کر سکوں گا۔"

ابھی مشیت الٰہی کو ان کے صبر کی اور آزمائش کرنی تھی یعنی یکے بادیگرے دو جوان لڑکیوں نے انتقال کیا اور انہوں نے اِنَّا لِلّٰہِ وَاِنَّا اِلَیْہِ رَاجِعُوْن کہہ کر اس آزمائش میں بھی کامیابی حاصل کی۔

دوسرا عقد اور اولادیں — چند سال بعد اپنے کنبہ میں عقد کیا اور خداوند کریم نے اس عمر میں پھر مسرتِ اولاد بخشی ۱۹۰۶ء میں ان بیوی کا بھی انتقال ہو گیا اور خورد سال بچوں کی پرورش کا بار ان کی ذات پر پڑ گیا۔

نواب صاحب اوائل شباب سے خانگی زندگی کے عادی تھے اور اسی میں ان کو راحت ملتی تھی اب عمر کے اقتضا سے اور بھی ایسی راحت کی خواہش اور ضرورت تھی ایک سال تکلیف اُٹھا کر دوستوں کے مشورے سے برادری کے ایک معزز خاندان کی مطلقہ خاتون سے عقد کیا جو پانچ بچوں کی ماں تھیں ان کو عقد سے پہلے یقین دلایا گیا تھا کہ اِس اولاد کا کوئی بار ان پر نہ ہو گا لڑکے جوان تھے ایک لڑکی کی شادی ہو چکی تھی ایک قابل شادی تھی پدری خاندان آسودہ حال تھا لیکن حقیقت یہ ہے کہ نواب صاحب کے حصہ میں اب راحت اور سکون نہ تھا نفس واپسیں تک ان کی زندگی سخت کوفت اور تکلیف میں گذری مالی مشکلات بھی بڑھ گئیں اور بیوی کے پورے خاندان کی کفالت ان ہی کو کرنی پڑی۔

مگر یہ سب انگیز کیا اور کبھی کسی مخلص ترین دوست یا قریب ترعزیز کے سامنے بھی ایک لفظ شکایت زبان سے نہیں نکلا نہ کسی کو موقع دیا کہ وہ ان حالات پر ان سے گفتگو کرتا۔

امروہہ خاص کی خدمات — صوبہ متحدہ آگرہ اودھ میں امروہہ ایک بہت قدیم شہر تھا جس کی بڑی شاندار تاریخی روایات تھیں لیکن تغیرات زمانہ نے اس کو ایک قصبہ بنا دیا تاہم شرفا کی آبادی اور ان کی روایتیں ابھی قائم ہیں۔

مردم شماری کے لحاظ سے بھی اول درجہ کا قصبہ ہے۔

بدقسمتی سے ہندو مسلمانوں اور شیعہ سُنّی کے اختلافات و فسادات سے یہ قصبہ بھی محفوظ و مامون نہ رہا ۱۸۹۵ء میں شیعہ سُنّی میں سخت کشت و خون ہوا جس میں پولیس کو پوری قوت استعمال کرنی پھر ۱۹۰۲ء میں ہندو مسلم فساد نے نازک صورت اختیار کرلی نواب صاحب نے ان ہر دو موقعوں پر اپنے اثر سے بہت کچھ حالت سنبھالی اور چونکہ ہر طبقہ ان پر اعتماد رکھتا تھا اور ہر دل میں ان کا احترام موجود تھا اس لئے بہت جلد اصلاح ہوگئی اور بڑی حد تک یہ مختلف عناصر صلح و آشتی کے ساتھ زندگی بسر کرنے لگے۔

اُنھوں نے گورنمنٹ کو امروہہ میں تعلیم کی کمی پر توجہ دلائی اور ایک اسکول قائم کرایا اس کے مصارف کا ایک حصہ خود منظور کیا اور پبلک سے بھی امداد دلائی۔

گورنمنٹ نے اُن کی کوششوں کی قدردانی کی ۱۹۰۲ء میں ایک شاہی سند دی گئی جس میں مذہبی جھگڑوں کو طے کرنے کی امداد کا مخصوص اعتراف کیا گیا تھا۔ دربار تاجپوشی میں حکومت کی طرف سے مدعو کئے گئے۔ پھر ۱۹۰۴ء میں کلکٹر ضلع نے ان کو ہز آنر کے سامنے پیش کرتے ہوئے ان کی تعلیمی امداد و مساعی اور باشندگان امروہہ میں صلح و آشتی قائم کرنے کی کوششوں کا بیان کیا۔

ان ہی کی کوششوں سے ایک زنانہ شفاخانہ اور اخراجات پورے کرنے کی ذمہ داری پر ٹیلیگراف آفس قائم ہوا۔

جس وقت مرادآباد اور دہلی کے مابین ریلوے کا اجرا ہونے والا تھا تو امروہہ اس لائن سے علیحدہ ہو گیا تھا۔ نواب صاحب نے ریلوے کی مجوزہ لائن سے اختلاف کرکے لائن کا رخ بدلوایا اور اعداد و شمار سے ثابت کیا کہ لائن میں اس ترمیم سے زیادہ نفع ہوگا۔

سرکاری مدارس میں مذہبی تعلیم کے اجرا کی کوشش

۱۸۷۲ء میں نواب صاحب نے اپنے جواب مضمون میں سرکاری مدارس میں مذہبی تعلیم کے انتظام نہ ہونے سے جو اخلاقی برائیاں مسلمانوں میں پیدا ہو رہی تھیں اس پر کافی بحث کی تھی اس بیس سال کی مدت میں اس انتظام کی اور زیادہ ضرورت بڑھ گئی تھی چنانچہ اب پہلی فرصت میں اس سوال کو اولاً محمڈن ایجوکیشنل کانفرنس کے اجلاس ۱۸۹۲ء منعقدہ دہلی میں رزولیوشن کی صورت میں پیش کیا کہ :-

> ہر مقام کے مسلمانوں کا فرض ہے کہ جو مسلمان طالب علم گورنمنٹ کالجوں اور اسکولوں میں پڑھتے ہیں اُن کی مذہبی تعلیم کا کوئی مناسب اور مستحکم بندوبست کریں۔

اس پر بڑی بڑی بحثیں ہوئیں ضرورت سے کسی کو انکار نہ تھا سوال گورنمنٹ کی منظوری اور انتظام کا تھا۔ بہر حال رزولیوشن پاس ہوا اور نواب نے اس کے متعلق عملی کارروائی کی بذات خاص ہمت کی۔ انھوں نے مختلف اوقات میں گورنمنٹ کے اعلیٰ افسروں سے ملاقاتیں اور گفتگوئیں کیں اپنے دلائل پیش کئے انتظامی مشکلات کا حل بتایا پھر ایک مفصل اسکیم پیش کی اور اس کو بہ کثرت شایع کیا۔ سر چارلس کراسٹھویٹ (مستقل) کی گورنمنٹ نے افسران سے مفصل رائے طلب کی اور ان کے موصول ہونے کے بعد آنریبل کیڈل (قائمقام) لفٹنٹ گورنر نے نہایت ہمدردانہ توجہ کی اور امتحاناً مدرسہ امروہہ میں یہ اسکیم نافذ کی گئی جس کے مصارف خود نواب صاحب نے دئے اور چھ ماہ بعد جو رپورٹ پیش ہوئی اس میں اعتراف کیا گیا کہ اس انتظام سے کوئی کمی یا نقص عام تعلیم میں نہیں پیدا ہوا اور نہ وہ طلبا کے مختلف گروہوں میں کسی نزاع کا سبب بنا بالآخر تین سال کی کوششوں کے

بعد ۱۸۹۶ء میں سر انٹونی میکڈانلڈ کی گورنمنٹ نے عام طور پر منظوری صادر کر دی اور ۸ر دسمبر کو ڈائرکٹر پبلک انسٹرکشن نے بشرائط خاص سرکلر جاری کر دیا جس کی رو سے صوبہ متحدہ کے مدارس میں مقامی مسلمانوں کو اختیار دیا گیا کہ اسکولوں میں معمولی خواندگی شروع ہونے سے پہلے وہ ایک گھنٹہ مذہبی تعلیم کا انتظام کر سکیں۔

دیہاتی آبادی کی تعلیم اور طبی امداد پر یادداشتیں۔

نواب صاحب کو انگریزی اور حکومت نظام کی ملازمت میں بہت عرصہ تک دیہاتی آبادی کی ضروریات تکالیف کا صحیح و کامل اندازہ کرنے کا بڑا موقع ملا تھا۔ ان کا دل اور سینہ دیہاتیوں کی ہمدردی اور ان کی بہبودی و بہتری کے جذبات سے معمور تھا اور یہی اثر تھا کہ حیدرآباد میں اپنی پوری قوت و قابلیت سے اس طبقہ کی حالت کو بہتر بنانے کے لئے نہایت نتیجہ خیز کام انجام دئے۔ جن کی روایتیں، آج تک وہاں کے دیہات میں زبان زد ہیں۔

وہ جب وظیفہ یاب ہو کر آئے تو انھوں نے اپنی زمینداری کے دیہات میں دورہ کیا اور اپنی اثامیوں کی تمام بقایا معاف کر دی اور ایک فصل کا لگان انعام کے طور پر دے دیا پھر ان کے لئے اپنے مکان پر دواؤں کا انتظام کیا۔ ان کا معمول تھا کہ جب کوئی کاشتکار کسی کام سے امروہہ آتا تو اس کو اپنا مہمان بناتے اور فی کس چار آنے کے حساب سے خوراک دیتے بیگار اور تمام جابرانہ حقوق کا جو زمینداروں نے مقرر کر رکھے ہیں اُن کے یہاں نام و نشان نہ تھا۔

کاشتکاروں کو تقاوی دینے اور دلانے کے ساتھ ہی اگر اُن میں سے کوئی اپنی ناداری کی طرف سے مطمئن کر دیتا تو لگان معاف کر دیتے پولیس اور تحصیل کی زیادتیوں سے اُن کو محفوظ رکھنا اپنا فرض جانتے تھے۔

جب تک انتہائی مجبوری نہ ہوتی اور کاشتکار بالکل بے ایمانی پر نہ اُتر آتا

اُس وقت تک نالش نہ کرتے چنانچہ دس سال میں جس کا حساب مولف نے خود لگایا صرف دو نالشیں تھیں اور اُن میں بھی ڈگری کے باوجود ایک جزو کی معافی کے بعد تصفیہ باہمی ہو گیا تھا۔

ان کا یہ طرزِ عمل اس جذبہ ہمدردی پر مبنی تھا جو اس آبادی کی نسبت وہ رکھتے تھے لیکن اس کا فائدہ بہت ہی محدود تھا اب انہوں نے اس آبادی کی ایک سخت اور ایک اہم ضرورت پر صوبہ کی گورنمنٹ کو توجہ دلائی۔

(۱) باوجودیکہ ہندوستان میں حفظانِ صحت اور طبی انتظامات پر کروڑوں روپیہ دیہاتی آبادی کے گاڑھے پسینہ سے حاصل ہو کر خرچ کیا جاتا ہے لیکن اسی آبادی کو اُس سے اتنا کم فائدہ پہنچتا ہے۔ جو کچھ بھی نہ ہونے کے برابر ہے۔ نواب صاحب نے ۱۸۹۵ء میں اس حالت پر ایک طولانی اور پُر درد یادداشت لکھ کر گورنمنٹ میں بھیجی جس میں عام وبائی امراض کی مصیبت معالجہ کی مشکلات امداد طبی کی کمی و فقدان اور اُن کی اندوہناک حالت کا پورا نقشہ کھینچا تھا۔ اور اِس بات پر زیادہ زور دیا تھا کہ گشتی ڈسپنسریاں قایم کی جائیں تاکہ ہر گانوں میں مریضوں کے گھر پر امداد مِل سکے اُنہوں نے گورنمنٹ کی مالی مشکلات کو بھی ملحوظ رکھا تھا اور زیادہ تر مینوسپل اور لوکل فنڈ سے اس غرض کے لئے امداد دینے پر زور دیا تھا۔ لیکن یہ یادداشت ہمدردانہ غور کے ساتھ مالی مشکلات کے عذر پر ناقابلِ عمل تصور کی گئی۔

(۲) دوسری یادداشت دیہاتی تعلیم کی وسعت و عمومیت کے متعلق تھی۔ جس میں اس امر پر توجّہ دلائی تھی کہ ایسی تعلیم کا معیار صرف دیہاتی ضرورتوں کے مطابق رکھا جاے تاکہ دیہاتی باشندے پٹواریوں زمینداروں اور چالاک کارندوں سے اپنی حفاظت کر سکیں اور کم وقت اور کم صرفہ میں ان کو ضروری تعلیم حاصل ہو جاے اور اپنے پیشوں کے ساتھ بھی دلچسپی قائم رہے۔

اُنھوں نے موجودہ نصاب اور مدت تعلیم کی خرابیوں پر بھی بحث کی تھی جس سے دیہاتی زندگی میں ایک افسوس ناک تبدیلی پیدا ہو گئی ہے مگر یہ تحریک بھی ناقابل اعتنا ہی رہی۔

پولیس کمیشن میں شہادت چوں کہ نواب صاحب حیدر آباد میں ایسے عہدوں پر مامور رہے تھے جن میں پولیس کے انتظامات سے گہرا تعلق تھا اس لئے شاہی پولیس کمیشن کے اجلاس منعقدہ مراد آباد ۱۹۰۲ء میں بحیثیت گواہ طلب ہوئے گئے اور انھوں نے نہایت واضح اور مفصل بیان دیا یورپین افسروں کی موجودہ تعداد کو کافی اور ملازمان صیغہ کی تنخواہ کو بمقابلہ ذمہ داری کم ظاہر کرکے اُن کے اعزاز کی طرف توجہ دلائی، ٹریننگ اسکول کے فوائد تسلیم کرکے معیار تعلیم کے اضافہ اور عمدہ اخلاق اور فرائض خدمت کو عمدگی کے ساتھ انجام دینے کے متعلق لکچروں کے اضافہ پر زیادہ زور دیا۔ جرائم کی رپورٹوں کے اندراجات، اخفائے واردات اور تفتیشی کارروائیوں کے متعلق بحث کرکے صاحبان سپرنٹنڈنٹ تک بلا توسط نارسائی اور سوشل تعلقات نہ ہونے اور ان کی ملکی زبان سے ناواقفیت کی وجہ سے جو خرابیاں اور مشکلیں پیش آتی ہیں ان کو بیان کیا اور اپنے تجربہ کی بنا پر بتایا کہ حیدر آباد کی حالت یہاں کی حالت سے بہتر ہے وہاں پولیس کے سوشل تعلقات اور ذرائع آگاہی حالات زیادہ ہیں اور اسی وجہ سے وارداتوں کے اخفا یا تبدیلی نوعیت کی جرات نہیں ہوتی۔

اُنھوں نے سفارش کی کہ ہر ضلع میں ایک ایک ہندوستانی اسسٹنٹ سپرنٹنڈنٹ پولیس مقرر کیا جائے جو سپرنٹنڈنٹ کے درجہ تک ترقی کر سکے رپورٹوں کے درج کرانے کے طریقوں کے نقائص اور سہولتوں دیہاتی چوکیداروں کی کمی تعداد اور ... کے مواجب گھٹا دار کی دلالی، رشوت، تفتیش اور اس کی جانچ کے طریقوں پر

اظہار رائے کرکے سر انٹونی میکڈانلڈ کے اس عہم پر نکتہ چینی کہ جس میں اُنہوں نے ایک ہندوستانی مجسٹریٹ کو مجبور کو کیا تھا کہ وہ سپرنٹنڈنٹ ضلع کو آداب بجالانے کیلئے حاضر ہو جس سے ہندوستانی مجسٹریٹوں کا رعب زائل ہو رہا تھا اور اس امر پر بہت زور دیا کہ مجسٹریٹوں کا رعب پولیس پر ہونا چاہئے نہ کہ پولیس کا مجسٹریٹوں پر۔

ایجوکیشن کمیشن میں شہادت

۱۸۸۲ء کے ہنٹر کمیشن میں شہادت ادا کرنے کے بعد دوسری مرتبہ ۱۹۰۲ء کے اس مشہور تعلیمی کمیشن میں جو لارڈ کرزن کے زمانہ میں مقرر ہوا تھا نواب صاحب نے بھی شہادت دی جس میں اُنہوں نے تعلیم کو دماغ میں ٹھونسنے سے طلبا کی تندرستی اور مسلسل مطالعہ سے ان کے دماغ و بصارت پر جو خراب اثر پڑتا ہے اس کو نہایت وضاحت سے بیان کیا اور ایک مضمون میں فیل ہونے کی وجہ سے تمام مضامین میں فیل متصور کئے جانے اور ان میں دوبارہ امتحان کی سختی اور مضرتوں پر بحث کی اور سفارش کی کہ یہ امر طلبا کا اختیاری ہونا چاہئے کہ وہ خواہ مختلف مضامین میں ایک ہی ساتھ امتحان دیں یا بتدریج اور دوبارہ اسی مضمون میں امتحان لیا جائے جس میں وہ فیل ہوں، پھر تاریخ کے سوالات امتحان اور ریاضی کے کورس کی نامناسب وسعت اور انٹرنس کے امتحان میں سولہ سال کی قید عمر پر اظہار ناپسندیدگی کیا اور یونیورسٹی کی تعلیم کو چار سالوں پر تقسیم کرکے انٹرمیڈیٹ کا درجہ توڑ دینے کی رائے دی۔ قومی یونیورسٹیوں پر اظہار خیال کرتے ہوئے ریزیڈینشل یونیورسٹیوں کی تعریف کی لیکن حالات مُلک کے لحاظ سے باعث نقصان بتایا اور اور ایم اے او کالج کو یونیورسٹی کے درجہ تک لے جانے کی جو کوشش کہ جاری تھی اس کا تذکرہ کرکے اس کو الحاقی بنائے جانے کے متعلق خیال ظاہر کیا فیسوں کی زیادتی اور اخراجات تعلیمی کی کثرت پر بحث کرتے ہوئے بعض اعلیٰ حکام

کے اس غلط خیال کی تردید کی کہ ،، جو لوگ تعلیم کی فیس بھی ادا نہیں کر سکتے اُن کو اعلیٰ تعلیم کی ضرورت ہی نہیں" اُنہوں نے کہا کہ ہمارے ملک میں کلاسیفکشن نہیں دولت اور افلاس کے لحاظ سے یہاں اگر کچھ فرق ہو جاتا ہے تو محض پرائیوٹ طور پر نہ کہ پبلک طور پر، مثلاً کسی بیاہ شادی یا دوسری کسی عام تقریب میں کسی قوم کا ایک دولت مند اور ایک مفلس دونوں برابر سمجھے جاتے ہیں اور ان کے باہم رشتہ مندیاں ہوتی ہیں . . . . اس ملک میں اس بات کی سخت ضرورت ہے کہ تمام وہ ممکن تدابیر اور مراعات اختیار کی جائیں جن سے شریف نادار طلبا حتی الامکان اعلیٰ تعلیم حاصل کر سکیں جس کے بعد وہ بدستور اپنا اعلیٰ درجہ اپنی قوم میں محفوظ رکھ سکیں۔

اُنہوں نے اس امر پر بھی زور دیا کہ صوبہ کے ڈائرکٹروں کی مدد اور مشورہ کے لئے ان معاملات میں جو رعایا پر موثر ہوں ایک مشیر کمیٹی ہونی چاہیئے۔

طبیہ کالج اور ہندوستانی دواخانہ دہلی کی امداد

نواب صاحب کو طب یونانی کی اصلاح، و ترقی اور بالخصوص یونانی ادویہ کے عمدہ انتظام کی جانب خاص توجہ تھی انہوں نے ۱۸۶۹ء میں ایک یونانی دواخانہ علی گڑھ میں قائم کرایا تھا اور جب خدا نے ایک بڑا موقع دیا تو حیدرآباد میں اس کا باقاعدہ نظام قائم کر دیا اب دہلی کے طبیہ کالج کے جلسوں میں شرکت کر کے اس کی اخلاقی تائید کی اور حاذق الملک عبدالمجید خاں میموریل فنڈ میں معقول چندہ دیا۔

۱۹۱۰ء میں جب (مسیح الملک) حکیم محمد اجمل خاں نے ہندوستانی دواخانہ کمپنی کی صورت میں قائم کیا تو اس میں بہت دلچسپی لی امداد چندہ کے علاوہ اُس کے ڈائرکٹروں میں بھی شمولیت منظور کی

ندوہ کی تائید

مولانا محمد علی مرحوم بانی ندوہ کے ساتھ مخلصانہ تعلقات تھے اور جو کوشش وہ ندوہ کے متعلق کر رہے تھے نواب صاحب

اس میں ہر قسم کی مدد دیتے تھے جب کبھی موقع ملتا تو سالانہ جلسوں میں شرکت کرتے۔
سر انٹونی میکڈانلڈ کو ندوہ کے ساتھ تلخی بغض تھا اور وہ اس کو ایک خطرہ تصور کرنے لگے تھے سنہ ۱۹۰۱ء میں انہوں نے ایم اے او کالج میں بجواب ایڈریس جو تقریر کی تھی تو ندوہ کے متعلق بھی ایسے فقرے کہے جن سے سراسر ناپسندیدگی نمایاں تھی۔
لیکن نواب صاحب نے پبلک اور پرائیویٹ طریقوں سے ندوہ کی حمایت کی اور اس دور پریشانی میں جب کہ اراکین ندوہ پر خفیہ پولیس کی نگرانی بھی تھی اپنی اخلاقی امداد سے ان کی ہمت بندھائی۔
سنہ ۱۹۰۴ء میں جب کہ علی گڑھ میں حکومت کی جانب سے عربی تعلیم کی تحریک بڑے زور کے ساتھ پیش تھی تو اس وقت ندوہ کے لئے ایک اور خطرہ سامنے تھا اس موقع پر نواب صاحب نے مولانا شبلی مرحوم کو ایک خط لکھا کہ "علی گڑھ کے لئے گورنمنٹ نے منظور کیا ہے کہ ایک یوروپین پروفیسر عربی کی تعلیم کے لئے بلایا جائے جس کی تنخواہ گورنمنٹ دے گی اور وظائف کالج کے مسلمان ہمدرد دین بی اے کی تعلیم کے بعد ایم اے عربی میں یہاں کے طالب علم حاصل کریں لہٰذا ہزآنر یہ ضرور کہیں گے کہ علی گڑھ کالج میں بھی اب اعلیٰ درجہ کی تعلیم ہوگی ضرورت کیا ہے کہ ندوہ علیحدہ قائم رہے اس کا جواب یہ ہے کہ علی گڑھ کالج میں قریباً قریباً کل وہی لوگ تعلیم پاتے ہیں جو وکالت یا سرکاری نوکری کے خواہش مند ہیں اور ابھی ایک بڑا گروہ مسلمانوں میں وہ بھی ہے جو وکالت اور نوکری کے سوا اپنی اولاد کو دوسرے کاروبار زمینداری و تجارت وغیرہ میں مصروف رکھنا چاہتا ہے اُن کے لئے کوئی دوسرا ذریعہ تعلیم و تربیت کا نہیں ہے اور اُن کو یونیورسٹی کے قیود میں مبتلا کرنا کچھ ضروری نہیں یہ لوگ عام علوم عربی و اردو میں حاصل کریں گے اور صرف زبان انگریزی سیکھیں گے معہذا ابتدائی چند سالہ تعلیم ندوہ کی ایسی ہے کہ اس کے بعد طالب علم ابتدائی دینی و دنیوی

تعلیم اور اس کے بعد پھر وہ انگریزی مدارس میں بہت زیادہ کامیابی کے ساتھ تعلیم پاسکے گا۔"

چونکہ یہ زمانہ ہز آنر سرجیمس لاٹوش کا تھا جن کی پالیسی اپنے پیشرو سے مختلف تھی اور ہر طرف سے ندوہ کی تائید ہو رہی تھی اس لئے خطرہ مُنہ دکھا کر ہی رہ گیا۔

نواب صاحب ندوہ کے طرز تعلیم کے اتنے حامی رہے کہ اپنے صاحبزادہ کی ابتدائی تعلیم بھی ندوہ میں ہی کرائی۔

حج و زیارت نواب صاحب اگرچہ اعمال مذہب کے نہایت پابند تھے حتیٰ کہ نوافل اور اوراد و وظائف کا بھی ناغہ نہ ہوتا تھا لیکن ابھی تک ان کو فریضہ حج ادا کرنے کا موقع نہ ملا تھا۔

اب ۱۹۰۴ء (شوال ۱۳۲۲ھ) میں اُنہوں نے حج کیا اور روضہ نبوی (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کی سعادت زیارت سے مشرف ہوئے حاجی محمد موسیٰ خاں صاحب رئیس دتاولی لکھتے ہیں کہ "جب نواب صاحب حج کو جانے لگے تو میں نے ان کی خدمت میں ایک عریضہ لکھا جس میں حجاج کے جہاز کی تکالیف جس سے مجھکو سابقہ پڑ چکا تھا بتائیں اور مشورہ دیا کہ ڈاک کے جہاز سے مصر ہو کر جائیں اُنہوں نے جواب دیا کہ بے شک حجاج کے جہاز کی کثافت اور غریب حجاج کی کشمکش قابل خیال ہے اور ڈاک کے جہاز کا یورپین انتظام اور آرام و آسائش دلکش اور دل حسیب ہے مگر بھائی حجاج کے جہاز تکلیف وہ سہی اس میں ہونگے تو مسلمان اور ڈاک کے جہاز میں سب اغیار سے

پائے در زنجیر پیش دوستاں — بہ کہ با بیگانگاں در بوستاں

نواب صاحب بقصد روانگی حج جب بمبئی پہونچے تو راقم تذکرہ بھی وہاں موجود تھا اور یہ ذاتی علم ہے کہ جدہ کو روانگی کے وقت بھپارہ خانے میں جانے اور وہاں

سے ساحل تک پیادہ راستہ طے کرنے اور کشتی میں بیٹھکر جہاز پر سوار ہونے میں جو سخت تکلیفیں ہوتی تھیں اُن سے بچانے کے لئے مولوی عبداللہ احمدؒ (مرحوم) محافظ حجاج نے ہر چند چاہا اور منت کی کہ نواب کے واسطے خاص انتظام کریں لیکن انہوں نے اس خصوصیت کو کسی طرح قبول نہ کیا اور شکریہ کے ساتھ معذرت کی کہ "میں عام مسلمانوں سے کوئی ممتاز حیثیت اختیار کرنی نہیں چاہتا۔" مولوی مظہر علیم صاحب مرحوم سفیر کانفرنس نے جو رفیق سفر تھے مؤلف سے بیان کیا کہ حج کے بعد براہ ینبوع مدینہ طیبہ گئے قافلہ کے غربا و محتاجین کے لئے ہر منزل میں لکڑی اور پانی کا انتظام نواب اپنے صرف سے کرتے تھے ینبوع سے دوسری منزل میں دو ضعیفہ عورتیں تکلیف کے ساتھ پیادہ چلتی ہوئی نظر آئیں نواب صاحب نے اپنا اونٹ رکوایا اور ان کو بٹھا کر خود پیادہ چلنے لگے میں نے دیکھا تو اصرار کیا کہ آپ بھی ضعیف ہیں میرے اونٹ پر سوار ہوں مگر انہوں نے قبول نہ کیا اور کہا کہ "میاں یہ رستہ آنکھوں سے طے کرنے کا ہے یوں ہی چلنے دو" غرض اس طرح وہ دیار حبیب میں داخل ہوئے۔" جاتے وقت اور آتے وقت جہاز پر حجاج کو جو تکلیفیں ہوتیں ان پر افسران جہاز کو توجہ دلاتے اور ساتھیوں کی آسایش میں ہر ممکن مدد کرتے۔

پراونشل کانفرنس صوبہ بمبئی کی صدارت نواب صاحب کو اگرچہ بدو شعور سے ہی ملکی اور بالخصوص مسلمانوں کی تعلیم سے گہرا تعلق رہا اور تیس سال سے زائد عرصہ تک انہوں نے مسائل تعلیم پر غور کیا کمیشنوں میں شہادتیں دیں اخبارات میں مضامین لکھے کانفرنسوں میں مختلف رزولیوشنوں پر تقریریں کیں لیکن ابھی تک کسی ہمہ گیر تقریر و مضمون میں اظہار رائے کا موقع نہیں ملا تھا۔ اب سنہ ۱۹۰۴ء میں بمبئی کی پراونشل محمڈن ایجوکیشنل کانفرنس کی جماعت عاملہ نے ان کو اجلاس احمد آباد کی صدارت کے لئے مجبور کر دیا تو یہ قدرتی موقع

ہاتھ آیا لیکن اُنھوں نے خطبہ صدارت مرتب کرنے سے پہلے صوبہ کے ان مقامات کا جہاں مسلمانوں کی آبادی زیادہ تھی دورہ کیا ممتاز مسلمانوں سے ہی نہیں بلکہ ہندو معززین سے بھی تبادلہ خیالات کیا عام مسلمانوں کی حالت مشاہدہ کی اس طرح پندرہ مقامات کے دورے اور حالات صوبہ پر عبور حاصل کرنے کے بعد پانچ روز قبل احمد آباد آکر معزز اہل الرائے اصحاب اور دیگر اضلاع صوبہ کے ہمدرد نمایندوں اور سرکاری عہدہ داروں سے گفتگوئیں کیں اور پھر اپنا خطبۂ صدارت مرتب کیا جس میں اپنے چہل سالہ تجربات اور قابل العمل وسہل الاصول مشورے پیش کئے اور بہت زیادہ بحث حالت موجودہ پر کی پھر اُنھوں نے اس امر کو کہ ہر مسلمان کو تعلیم کی ضرورت ہے بیان کر کے مسلمانوں کو مختلف گروہوں پر تقسیم کیا جن کی ضرورتیں ایک حد تک متفق اور پھر مختلف ہو جاتی ہیں اُنھوں نے رائے دی کہ :-

> سب کے واسطے بلا امتیاز ایک ہی قسم کی تعلیم تجویز نہیں کی جا سکتی مثلاً ہم میں ایک گروہ ان لوگوں کا ہے جو ادنیٰ قسم کا کوئی پیشہ کرتے ہیں ان میں خاکروب، سقّے، حجام، گاذر وغیرہ وغیرہ ہیں ان کو بھی تعلیم کی ضرورت ہے کہ ع بے علم نتوان خدا را شناخت مگر ان کو صرف اسی قدر تعلیم درکار ہے کہ اپنی مادری زبان میں وہ کچھ کچھ لکھ پڑھ سکیں اور کسی قدر حساب جانتے ہوں اور ان کی مادری زبان کے علاوہ اگر ان کے ملک میں کوئی اور زبان بازار میں رائج ہو تو اس کو بھی جانتے ہوں۔ . . اور مذہبی تعلیم کے لحاظ سے وہ صوم وصلوٰۃ کے پابند اور حج وزکوٰۃ وطہارت وغیرہ کے مسائل سے واقف اور پرہیزگار دیندار اور راست باز و دیانت دار ہوں اس قسم کی تعلیم کا انتظام بالکل فری (مفت) ہونا چاہیئے اور ان کے مدارس بھی

جدا قائم ہونے مناسب ہیں جن میں صرف دو انتہا تین گھنٹے بچوں کو تعلیم ہو
اور باقی وقت وہ اپنے مربیوں اور اولیا کے ساتھ اور اپنے پیشوں کی تعلیم
میں حسب معمول صرف کرتے رہیں۔

اب دوسرے گروہ کو لیجئے جن کی پوزیشن اس پہلے گروہ سے کچھ زیادہ ہے
اس میں معمار لوہار بڑھئی سنار، حلوائی وغیرہ پیشہ ور شریک ہیں ان کو
اپر پرائمری تک کی تعلیم کافی ہے علاوہ اپنی مذہبی تعلیم۔ اور اس کے علاوہ
ان کو ٹکنیکل تعلیم میں بھی دلانا چاہئے یہی لوگ ہیں جن کو تھوڑی سی معمولی
ٹکنیکل تعلیم بھی اگر مل جائے تو وہ اس کی مدد سے اپنے پیشوں کو زیادہ سلیقہ
اور ہنرمندی کے ساتھ انجام دے سکیں گے اور اگر آج وہ اپنے پیشہ سے
پندرہ روپیہ ماہوار کما سکتے ہیں تو اس کے بعد اس سے المضاعف کما سکیں گے
دوسرے بہت سے ناخواندہ اشخاص ہیں جو اس وقت دس روپیہ کی کوئی
نوکری مل جانے کو غنیمت سمجھتے ہیں اور بہت سے ایسے پریمری و سکنڈری تعلیم یافتہ
نوجوان ہیں جو دس پندرہ روپیہ کی تلاش میں مارے مارے پھرتے ہیں انکا تعلق بھی انکی
اس تعلیم کے ساتھ ٹکنیکل تعلیم سے ہونا چاہئے جس میں ٹائپ رائٹنگ اور شارٹ
رائٹنگ اور تجارتی حسابات کی تعلیم شامل ہوگی تاکہ اگر ان کو نوکری ہی کرنی
ہو تو زیادہ منفعت اور زیادہ آسانی سے وہ اس میں کامیاب ہو سکیں اور اگر
کسی کا مذاق کسی خاص صنعت و حرفت کے لئے ہو تو وہ اس ذریعہ سے بلا منت
غیرے اپنی روزی فراغت کے ساتھ اس کے ذریعہ سے حاصل کر سکے اور اسی
کے ساتھ ساتھ یہ سب لوگ پابند صوم و صلوٰۃ اور دین دار مسلمان ہوں"

اس کے بعد دوسرے گروہ کے ذیل میں قوم کے یتیم اور لاوارث بچوں کی دردناک
حالت پر توجہ دلائی اور یتیم خانوں کے قائم کرنے کی اپیل کی اور بریلی کے یتیم خانہ کا تذکرہ

کرتے ہوئے کہا کہ :۔

اس یتیم خانہ کے تجربہ سے مجھکو ایک اور بات معلوم ہوئی کہ بعض وہ ماں باپ اپنے بچوں کو بریلی کے یتیم خانہ میں لائے جن میں اپنے بچوں کی پرورش کی استطاعت نہ تھی اور حضرات اس قسم کے نظائر سب جگہ پائے جاتے ہیں کہ معاش قلیل ہے اور اولاد کثیر اور ایسی اولاد والدین پر وبالِ جان ہے فوجداری کا قانون ایک طرف سر پر سوار ہے کہ پرورش کرو افلاس دوسری طرف ان کی پرورش اور تعلیم و تربیت کی سب راہیں بند کر دیتا ہے اس کشمکش کی حالت میں یہ کیسی ضروری خیرات ہے کہ جو اس قسم کے بچوں کی پرورش اور تعلیم و تربیت کے کام میں لائی جاوے بعض پولیٹکل اکانمی کے عالم اس پر معترض ہوتے ہیں کہ مفلس والدین کے ساتھ اس قسم کی رعایت کرنے سے آیندہ لوگوں میں اپنی معاش کے حصول اور اس فرض کے ادا کرنے میں جو ہر ایک شخص کو اپنی اولاد کی نسبت ہے کاہلی پیدا ہوگی لیکن اس قسم کی درخواست ہائے امداد کو کسی قدر احتیاط سے جانچ لینے کی حالت میں وہ اعتراض باقی نہیں رہتا معہذا ایسی درخواستوں سے قطعی انکار کرنے میں دوسری طرف اِن بچوں کی حالت معرض ہلاکت میں ہوتی ہے اور تعلیم درکنار ان کی جانوں کے بھی لالے پڑ جاتے ہیں اور اس طرح یہ ایک کثیر گروہ اپنی قوم کے ہونہار بچوں کا معدوم ہو جاتا ہے۔ اور اس سے قومی قوت میں ضعف پیدا ہوتا ہے۔

پھر تیسرے گروہ زراعت پیشہ کے لئے سرکاری دیہاتی مدارس کو کافی بتاکر اور مسلمانوں نے دیہات میں مذہبی تعلیم اور مذہبی ضروریات کا جو انتظام کیا ہے (یعنی ہر گاؤں میں ایک ملّا اور ایک مسجد کی موجودگی) اس پر اطمینان ظاہر کرتے ہوئے تضادِ میقاتِ تعلیم کی زیادتی پر بحث کی اور کہا کہ :۔

لازمی نتیجہ یہ ہوگا کہ وہ آبائی پیشہ کی صلاحیت و قابلیت مفقود ہو کر نوکریوں کے متلاشی ہوں گے اور اکثر یہی نتیجہ ہوا ہے حالانکہ دیہات کی تعلیم کا منشار یہ ہونا چاہئیے کہ اس سے ایک تعلیم یافتہ کاشت کار تعلیم یافتہ لوہار تعلیم یافتہ مزدور بہم پہونچے نہ یہ کہ وہ ان کے آبائی پیشہ سے علیحدہ کرکے ملازمت کا امیدوار بنادے اور آزادی کی حالت سے نکال کر غلامی کا طوق ان کی گردن میں ڈالے"

اسی سلسلہ میں اردو کی تعلیم کے انتظام اور اُس کی ضرورت پر بحث کرتے ہوے چوتھے گروہ یعنی یونیورسٹی میں تعلیم پانے والوں کی مذہبی تعلیم کی اہمیت و ضرورت واضح کی کہ:-

"یہی وہ گروہ ہے کہ جس کو مذہبی تعلیم کی نہایت درجہ ضرورت ہے اور یہی وہ گروہ ہے کہ جو ایسے جدید فلسفہ کی تعلیم پاتا ہے جس سے لا مذہبی کی طرف رجحان ہوتا ہے اور اگر اس گروہ کو مذہبی تعلیم نہ دی جاے اور مذہبی فلسفہ کے ذریعہ سے ان کے خیالات کو قوی نہ کیا جاے تو وہ یقیناً جدید فلسفہ کا شکار ہو جاے گا اور کوئی وقعت ان کے دل میں مذہب کی باقی نہ رہے گی اور یہی شکایت ہے جو اس وقت چار دانگ عالم میں پھیلی ہوئی ہے اور ہندوستان کے ہر ایک حصہ مُلک میں لوگوں کا یہ خیال پیدا ہو گیا ہے کہ انگریزی تعلیم سے مذہب کی بیخ کنی ہوتی ہی حالانکہ یہ صرف ایک غلط فہمی ہے زبان کوئی سی بھی کیوں نہ ہو اس میں نہ کسی مذہب کی حمایت کی قوت ہوتی ہے اور نہ کسی مذہب کو نقصان پہونچانے کی جب تک کہ اس زبان میں اس قسم کے خیالات ظاہر نہ کئے جائیں میں اس کو تسلیم کرتا ہوں کہ بلا شبہہ فی زماننا انگریزی زبان اور دیگر السنہ

یورپ نے فلسفیانہ خیالات سے شامل ہوکر مذہب کے خلاف ایک جنگ قائم کر رکھی ہے اور اس سے صرف مسلمانوں یا ہندوؤں یا ایشیا ہی کی دوسری قوموں کے مذہب کو نقصان نہیں پہونچ رہا ہے بلکہ خود یورپ کو بھی اور اس میں بھی سب سے زیادہ اس گروہ نے اس تعلیم کی بدولت اپنے مذہب کو خیر باد کہہ دیا جو عیسوی مذہب کا معتقد کہلاتا ہے حالانکہ اس روک تھام کے واسطے عیسائی علما نے اپنے دولت مند معتقدین کی مدد سے بے انتہا کوششیں کی ہیں اور برابر ان کوششوں میں مصروف ہیں اس کے مقابلہ میں جب کہ ہم مسلمان اپنی حالت پر غور کرتے ہیں تو باین ہمہ غفلت بہت کچھ اپنے آپ کو محفوظ پاتے ہیں اور جو تھوڑا بہت نقصان ہم نے برداشت کیا اُس کی اصل وجہ یہ تھی کہ جدید فلسفہ کے مقابلہ کے لئے جس سے ہمارے انگریزی خواں نوجوانوں کو سابقہ پڑا تھا ہم نے ان کو اپنے مذہبی فلسفہ سے کوئی مدد نہیں دی تھی اور یہ کچھ انگریزی ہی پر منحصر نہیں خود عربی زبان میں جس وقت فلفسہ کا شیوع ہوا جس کے شائع کرنے والے خود علماے اسلام تھے تو اس وقت بھی مسلمان طلبا کا رجحان لامذہبی کی طرف ہونے لگا تھا جس کے مقابلہ کے لئے علما نے علم کلام ایجاد کیا جس میں اُنھوں نے یا تو مذہب اسلام کے فلسفہ سے تطبیق کر دی اور یا یہ ثابت کر دیا کہ فلسفہ میں جن حقائق اشیاء اور واقعات سے بحث کر کے نتائج نکالے گئے ہیں وہ ہی غلط ہے اور اس لئے اس کی بنیاد پر مذہب اسلام سے کوئی معارضہ نہیں ہو سکتا علما رحمہم اللہ کی یہ سعی بفضل الٰہی مشکور ہوئی اور وہ تمام غل و شور جو مذہب کے خلاف پھیل گیا تھا دب گیا اسی طرح آج جب کہ یورپ کا فلسفہ ہمارے نوجوان انگریزی خوانوں کے مطالعہ سے گذرتا ہی جو اپنے

مذہب سے محض ناواقف ہیں اور ساتھ ہی وہ دیکھتے ہیں کہ خود اکثر علمائے یورپ کو اس فلسفہ نے کیسا لامذہب بنا دیا ہی تو ان کا میلان بھی خواہ مخواہ لامذہبی کی طرف ہوتا ہی اور اس مصیبت کو دفع کرنی کے واسطے پھر اس وقت کی مناسب ایک علم کلام مُدّون ہونے کی ضرورت ہے اور میں دیکھتا ہوں کہ رفتہ رفتہ وہ مدون ہوتا جاتا ہی اور مختلف علما مختلف رسائل وکتب کے ذریعہ سے جدید علم کلام کی عمارت تعمیر کر رہے ہیں اور اس بات کی ضرورت ہی کہ جو ذخیرہ اس طرح پر جمع ہوتا جاتا ہے اس کے لکچر مسلمان انگریزی خوان طلبا کو دئے جائیں اور ساتھ ہی مذہبی احکام وعقائد کی اور اخلاق نبوی کی ان کو تعلیم دی جائے جس سے اعلیٰ وافضل دُنیا میں کوئی دوسرا ذریعہ حسن ترین اخلاق کی تعلیم کا نہیں ہی اور مسلمان تو اس کی بدون اخلاق حسنہ سے کسی طرح متصف نہیں ہو سکتے۔"

اُنھوں نے مشنریوں کی کوششوں کے تذکرہ میں کہا کہ :-

انھوں نے تو اپنا ایک خاص مقصد قرار دے لیا ہے لیکن دیکھنا یہ ہے کہ جن لوگوں پر وہ اپنی کوششیں صرف کر رہے ہیں ان کے خیالات کیا ہیں ایک مجلس میں جب کہ کسی سلسلہ کلام میں خداوند تعالیٰ جل شانہٗ کا نام میری زبان پر آیا ایک صاحب نے جو فلسفیانہ مشرب رکھتے تھے فرمایا کہ جرمن میں کسی شخص کی نسبت یہ کہنا کہ وہ خدا پر اعتقاد رکھتا ہے مترادف اس کہنے کے ہی کہ وہ ایک بے وقوف شخص ہی میں نے ان دوست کو جواب دیا کہ جرمن میں اس قسم کے خیالات کی وجہ ہی یعنی وہاں جس قسم کی خدا پر اعتقاد رکھنی کا وعظ کہا جاتا ہے وہ ضرور لوگوں کی عقل میں آنے والی بات نہیں ہے لیکن ایک مسلمان کی زبان سے جب کہ اس کے خدا کا نام سنا جاوے جو وحدہ لاشریک لہ ہے تو اُس پر کسی بے عقلی کا الزام عائد نہیں ہو سکتا۔"

اسی سلسلہ میں اُنھوں نے ایک مرتبہ علامہ کی اس رائے پر کہ مذہبی تعلیم ہونی ہی نہیں چاہئے کیوں کہ اس سے مختلف قوموں میں نفرت پھیلتی ہے اظہار رائے کرتے ہوئے اسلامی تعلیمات کے اثر کو بیان کیا کہ :۔

جس قدر کوئی شخص اپنے مذہب سے زیادہ واقف ہوگا اُس قدر حصہ اُس کو نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے اخلاق حسنہ سے ملا ہوگا اُسی قدر وہ ان لوگوں کے حق میں آیہ رحمت ثابت ہوگا۔ جن میں کہ وہ اپنی زندگی بسر کرتا ہے عام ازیں کہ وہ مسلمان ہوں یا کسی اور مذہب کے ہوں .... دوسری وجہ اس بات کی کہ مسلمان بہ نسبت اور اہل مذاہب کے کیوں مذہبی تعلیم پر زور دیتے ہیں یہ ہے کہ مسلمانوں کو جو تعلیم رسول خدا صلی اللہ علیہ وسلم کے ذریعہ سے ہوئی اُس نے عبد کا تعلق معبود سے براہ راست قایم کر دیا اور اس تعلق کو درست حالت میں رکھنے کے لئے ہر ایک مسلمان کو بقدر ضرورت مذہبی احکام پر مطلع ہونا ضروری ہے۔

پھر اُنھوں نے دوسرے مذاہب میں مذہبی فرائض ادا کرنے کے لئے مخصوص اشخاص کی ضرورت پر توجہ دلاتے ہوئے کہا کہ :۔

ان مذہب والوں کو اپنے مذہبی مسائل کی واقفیت کی ایسی ضرورت نہیں جیسی کہ مسلمانوں کو۔

ہم کو اپنے مذہبی مسائل اور مذہبی احکام سے بطور سوسائٹی کے آداب واخلاق (ایٹیکیٹ) کے واقف رہنا ضروری ہے۔ اور اگر کسی ضرورت کے وقت ہم میں سے کوئی اس سے ناواقف پایا جاوے تو اس کے لئے وہ ناواقفیت سوسائٹی میں ندامت کا موجب ہوتی ہے"۔

پھر اُنہوں نے اس مقصد کے لئے مسلمانوں کی ایک جداگانہ یونیورسٹی کی ضرورت پر زور دیتے ہوئے علی گڑھ کی تعلیم کا تذکرہ کیا کہ :-

اگرچہ اس میں بہت کچھ اصلاح و ترقی کی ضرورت ہے لیکن پھر بھی دینی و دنیوی تعلیم کے دونوں مقصد جس طرح ساتھ ساتھ وہاں حاصل ہوتے ہیں اور ہو سکتے ہیں اس کی نظیر دوسرے کالج میں نہیں مِل سکتی۔

اس کے بعد کانفرنس کو اپنے صوبہ کی تعلیم پر اور غربا اور نادار طلبا کی امداد و وظائف پر توجہ دلا کر پانچویں گروہ یعنی مُلک کے دولت مند مسلمانوں کی تعلیم پر بحث کی جن میں بڑے بڑے تاجر جاگیردار و زمیندار شامل ہیں اور جن کا مقصد تعلیم سے نہ سرکاری ملازمت حاصل کرنا ہے اور نہ قانونی پیشہ اختیار کرنا بلکہ علم کو علم کے لئے حاصل کرنا مقصود ہے اس ضمن میں کہا کہ :-

لیکن حد سے زیادہ افسوس کی بات ہے کہ جو گروہ اعلےٰ ترین تعلیم حاصل کرنے کی قابلیت رکھتا ہے اسی میں تعلیم کی طرف سب سے زیادہ بے پروائی ہے۔ یہ لوگ جب دیکھتے ہیں کہ کتنے بی اے اور ایم اے چالیس اور پچاس روپیہ کی نوکریوں کی تلاش میں سرگرداں ہیں اور ایک تجارت پیشہ شخص صرف گجراتی زبان کی مدد سے ہزاروں روپیہ کما لیتا ہے اور کئی گریجویٹ اس کے کارخانہ میں خود ملازم ہوتے ہیں تو اس سے وہ یہ نتیجہ نکالتے ہیں کہ اعلیٰ تعلیم میں وقت کو صرف کرنا اور اس کی تکلیفات کو برداشت کرنا نہ صرف غیر ضروری ہے بلکہ ایک غلط راستہ پر چلنا ہے مگر یہاں تعلیم کے مفہوم کو اُنہوں نے غلط سمجھا ہے اور ہمارے زمانہ کی یونیورسٹیوں کے تحت فرمان جس طریقہ سے کہ تعلیم دی جاتی ہے اور جس میں طلبا اپنی قیمتی زندگی کا اکثر حصہ کتابوں اور مضامین کے از بر یاد کرنے میں صرف

کرتے ہیں اور جس طرح پر کہ ایک ساتھ اُن پر متعدد مضامین کا بوجھ لاد دیا جاتا
ہے اور بالآخر جس غیر کافی قابلیت کے گریجویٹ کہ ان یونیورسٹیوں سے
پیدا ہوتے ہیں اس کے لحاظ سے بلا خوفِ تردید یہ کہا جا سکتا ہے کہ مُلک کے
لئے وہ تعلیم کوئی اعلیٰ تعلیم نہیں ہے اور اگر ہزار گریجویٹوں میں سے معدودے چند
اپنی خداداد طبیعت اور غیر معمولی شوق و محنت کی وجہ سے کسی اعلیٰ درجہ
تک ترقی کرنے میں کامیاب ہو گئے تو اس سے ہمارا کُلیہ باطل نہیں ہوتا اور
ایسے چند افراد کسی شمار میں نہیں آتے ورنہ معمولی طور پر ہماری یونیورسٹیاں
اس سے زیادہ کچھ نہیں کرتیں کہ اپنے گریجویٹوں کے لباس میں انتظامی باربرداری
کے واسطے تعلیم یافتہ قلیوں کا گروہ پیدا کر دیں پس اگر وہ لوگ جو تجارت
وغیرہ سے خود مختارانہ طریقوں سے اپنے لئے کافی معاش حاصل کر سکتے ہیں اس
قسم کی نفرت ظاہر کریں تو ان کی یہ نفرت حق بجانب ہے اور ایسی تعلیم ہرگز
بھی اعلیٰ درجہ کی تعلیم میں داخل نہیں ہو سکے گی یونیورسٹی ہال میں ان گریجویٹوں کی
کچھ ہی عزت اور منزلت کی جاتی ہو مگر اس سے باہر مُلک میں وہ اس سے
دسواں حصہ وقعت کی نگاہ سے نہیں دیکھے جاتے اور دیکھے بھی کیونکر جاویں
جب کہ ان کی حالت یہ ہے کہ اپنی مذہبی تعلیم سے بہت کچھ محروم اور اپنی
قومی تاریخ سے بہت کچھ ناواقف اور اپنے قومی اور مذہبی اخلاق کا ان میں
بہت ہی کم اثر ہے اور جن کا کل مایہ ناز انگریزی زبان کے وہ چند سبق
ہیں جو انہوں نے اسکول و کالج میں پڑھے ہیں اعلیٰ تعلیم سے جو تعلیم مراد ہے
وہ تعلیم ہے جس سے انسان کا دماغ روشن ہوتا ہے تمام قویٰ ظاہری و
باطنی میں شگفتگی اور خیالات میں وسعت ہوتی ہے اور اپنی مذہبی تعلیم
اور قومی تاریخ کے اثر سے اخلاق حسنہ طبیعت ثانیہ بن گئے ہوں ''۔

اس گروہ کو اُنھوں نے مشورہ دیا کہ وہ اپنے لئے ایک مخصوص تعلیمی اسکیم بنائیں جس میں نہ بہت سے مضامین ایک ہی وقت طلبا کے دماغوں میں ٹھونسے جائیں اور نہ بہت سی چیزیں حفظ کرائی جائیں اور اپنے قومی لٹریچر قومی تاریخ اور مذہبی تعلیم کے ساتھ علوم مروّجہ مادری زبان میں پڑھائے جائیں اور انگریزی ادب کی تعلیم بھی ضروری ہو اور پھر جس شعبہ تعلیم میں چاہے کمال حاصل ہو سکتا ہے پھر اسکیم کے مدارج پر بحث کرکے اس سے مختلف قسم کی قابلیتوں اور منفعتوں کے حصول اور ترقی کاروبار پر اظہار خیال کرتے ہوئے کہا کہ :۔

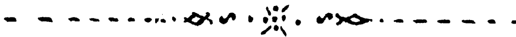
اس کا رجحان طبیعت رفتہ رفتہ اس طرف ہوتا جاوے گا کہ زیادہ تر مُلک کی پیداوار اور مصنوعات دوسرے ملکوں میں بھیجے نہ یہ کہ دوسرے مُلکوں کی پیداوار و مصنوعات سے اپنے مُلک کو بھر دے اعلیٰ تعلیم دولت سے شامل ہو کر ٹاٹا جیسے وسیع خیال ہمدردان قوم و فدائیان مُلک پیدا کرتی ہے ورنہ بدون اعلےٰ تعلیم کے جس طرح اس وقت ہمارے اہل ملک گجراتی، مرہٹی، ہندی وغیرہ حروف کی مدد سے تجارت کرتے ہیں تو جو نفع کہ وہ اس کے ذریعہ سے حاصل کرتے ہیں خواہ وہ ہزاروں کی تعداد میں ہو یا لاکھوں کی تعداد میں اُس کی نسبت میں تو بہت ادب سے یہی کہنے کی جرات کروں گا کہ وہ صرف ایک حق المحنت ہے اس خدمت کے صلہ میں کہ اپنے مُلک کی گاڑھی کمائی کا روپیہ دوسرے مُلکوں میں بھیجیں اور ان دوسرے ملکوں سے اپنے مُلک میں وہ چیزیں لاویں جو اس مُلک کے واسطے کمتر مفید اور اکثر صرف فضول خرچی اور کاہلی و عیش و نشاط اور ظاہری رونق اور بہار پر فریفتہ کرنے والی ہیں :۔

خطبہ کے آخر میں لڑکیوں کی تعلیم اور اُستانیوں کے لیے ٹریننگ اسکول وغیرہ

اور کانفرنس کے نظامِ عمل پر اپنی رائے ظاہر کی۔

نواب صاحب کے اس خطبہ کا حاضرین پر بہت گہرا اثر پڑا دوران خطبہ میں جب وہ عملی امور پر توجہ دلا رہے تھے اور ایک تنخواہ دار عملہ کی ضرورت پر زور دے رہے تھے تو اس موقع پر ٹھہر گئے اور حاضرین سے کہا کہ اس کا فیصلہ اسی وقت ہونا چاہئے چنانچہ اس کو بالاتفاق تسلیم کیا گیا اور چند منٹ میں پندرہ سو روپیہ کا چندہ ہوگیا۔ نواب صاحب نے اپنے دورہ میں محسوس کیا تھا کہ اس صوبہ کے اصحاب ایم اے او کالج اور آل انڈیا مسلم ایجوکیشنل کانفرنس اور ندوہ کے متعلق متعصبانہ اور مغائرانہ خیالات رکھتے ہیں اور ان کو محمڈن یونیورسٹی کی تحریک سے کوئی دلچسپی نہیں ۱۸ اکتوبر کو آخری تقریر میں انہوں نے نہایت تفصیل سے ان خیالات کو اور جو غلط فہمیاں تھیں ان کو دور کرنے کی کوشش کی،

خطبۂ صدارت کی بعض تجاویز کانفرنس کے اجلاسوں میں رزولیوشن کی صورت میں بھی پیش ہوئیں اور پاس کی گئیں احمد آباد میں ایک یتیم خانہ قائم کیا جانا اور سرکاری مدارس میں مذہبی تعلیم کا انتظام فوراً طے ہوگیا اور ان دونوں تجاویز کو عملی شکل میں لانے کے لئے اسی وقت معقول چندہ بھی کرلیا گیا۔



باب ششم

ایم اے او کالج کے معاملات میں اصلاحی کوششیں

اگرچہ نواب وقار الملک تمام قومی تحریکات میں حصہ لیتے تھے لیکن سب سے زیادہ اور گہرا تعلق محمڈن کالج (مدرسۃ العلوم) سے تھا اور یہی ادارہ ہندوستان کا سب سے زیادہ شاندار ادارہ اور قوم کی تمام امیدوں کا مرکز و محور تھا مگر مسٹر بل کی وجہ سے ایک جماعت نے جو علیحدگی اختیار کر لی تھی اس کا برا اثر بھی مترتب ہو رہا تھا اور بعض حالات نے بھی قوم میں بددلی پیدا کر دی تھی اس پر ۱۸۹۵ء میں ایک کلرک شام بہاری لال نے جعل سازیوں سے جو ایک لاکھ پندرہ ہزار روپیہ کا غبن کر لیا اس سے مالی حالت بھی متزلزل ہو گئی۔

سرسید عمر کی اُس منزل میں تھے جب کہ "من نعمرہ ننکسہ فی الخلق" کے ماتحت انسان کی تمام قوتیں ضعیف ہو جاتی ہیں ان کی طبیعت میں ایک طرف کالج کے مستقبل کی فکروں اور خیالوں نے ایک قسم کا غصہ پیدا کر دیا تھا دوسری طرف مسٹر بیک پرنسپل پر حد سے متجاوز اعتماد اور خود پرنسپل کا اثر و اقتدار بہت سے ناگوار حالات کا سبب بن گیا تھا۔ اگرچہ ہر قسم کی کارروائیوں کے لئے ایک قانون اور ضابطہ موجود تھا لیکن سرسید نے اہم معاملات میں اپنے اختیارات کی تاویل سے اس قسم کی کارروائیاں کیں جو اُسی قانون و ضابطہ کی رو سے قابل اعتراض تھیں۔

غرض ہر چیز سرسید کی مرضی کے تابع تھی اور ٹرسٹی باوجود خرابیوں اور نقصانوں کو محسوس کرنے کے ان کی عظمت و شخصیت اور محبت کی وجہ سے نہ تو اختلاف کرنا چاہتے

تھے اور نہ اکثر میں جرات ہی تھی البتہ بعض ہمت کر کے ادب و عاجزی سے اگر کچھ کہتے
تو وہ غیر موثر ہوتا۔[۱۵] نواب وقار الملک اور سر سید کے تعلقات خوردی و بزرگی کے
تھے اور یہ بھی حقیقت ہے کہ نواب صاحب کی تربیت و ترقی میں سر سید کی ذاتی توجہات
اور احسانات کا بھی حصہ اعظم تھا بزرگانہ شفقت اور خوردانہ ادب ہمیشہ دونوں کا
شعار رہا نواب صاحب نے جس جوش اور عزم و فیاضی کے ساتھ قومی کاموں
میں مدد دی تھی اس سے سر سید کو اور زیادہ محبت ہو گئی تھی البتہ ۱۸۸۹ء میں ٹرسٹیز بل
بل سے اختلاف کے باعث ان کو ناگواری تھی لیکن جب اس کے بعد نواب صاحب
نے امید سے زیادہ کالج کی ترقی و استحکام کی تدابیر میں امداد دی تو وہ ناگواری جاتی
رہی چنانچہ ایک خط مورخہ ۱۳ / نومبر ۱۸۹۰ء میں لکھا تھا کہ:۔

---

۱۵ ان حالات کو بیان کرنے کے لئے ایم اے او کالج کی تاریخ موزوں ہے راقم تذکرہ
نے یہ تاریخ بھی مدون کی ہے جو ہنوز مسودہ کی صورت میں ہے تاہم مجموعہ خطوط سر سید
مکاتیب اور تذکرہ محسن سے بہت کچھ روشنی پڑتی ہے سر سید کی رحلت کے بعد ۲ جنوری
۱۸۹۹ء کو ہز آنر سر انٹونی میکڈانلڈ نے بھی کالج وزٹ کے موقع پر کہا تھا کہ:۔

لوگوں کو یقین ہے کہ موجودہ انتظام اور بندوبست کا سسٹم کافی اور قابل
اطمینان نہیں ... یہ خیال اُس وقت پیدا ہوا تھا جب کہ ۱۸۹۵ء کا غبن لوگوں
پر ظاہر ہوا اور جتنے سال گذرتے گئے یہ خیال بھی پختہ ہو گیا کیونکہ جس انتظام
کی خرابی یعنی ایک شخص کے ہاتھ کل انتظام ہونے کی وجہ سے اس غبن کا ہونا
ممکن ہوا اس کی کوئی اصلاح نہ کی گئی میں یقین کرتا ہوں کہ تمام تعلیم یافتہ مسلمانوں
کی بالاتفاق یہ رائے ہے کہ قبل اس کے کہ کالج کی طرف سے لوگوں کو پورا
پورا اعتماد اور اطمینان ہو یہ امر لازمی ہے کہ اس کے انتظام میں بعض ضروری
تغیرات عمل میں آئیں ... کن اعتبارات سے اس کالج کا (بقیہ نوٹ صفحہ آئندہ)

آب میرا دل تم سے صاف ہو گیا مہدی حسن کے سامنے میں نے تم کو بہت
برا بھلا کہا اور بخارات نکال لئے اس لئے میں تم کو وہی القاب لکھتا ہوں
جو پہلے لکھتا تھا، عزیزی مکرمی مولوی مشتاق حسین

مگر اب صورتِ حالات بدتر ہو گئی تھی اور عموماً ٹرسٹی اصلاح کی ضرورت
محسوس کرتے تھے نواب محسن الملک بھی اصلاح حالت میں کوشاں تھے اور اچھی طرح
جانتے تھے کہ جو کچھ نقصان کالج کو ہو رہا ہے وہ سر سید کی رائے کی غلطی اور ضد کا نتیجہ
ہے جہاں جہاں گئے اور جن جن سے ملے اُن کو شاکی پایا لیکن اُن کی کچھ پیش نہ جاتی
تھی اور کبھی کبھی ناگواری پیدا ہونے لگتی تھی لیکن سر سید کی ذاتی محبت ان کی اس
وقت کی حالت اور صحت کی خرابی ساکت کر دیتی تھی، وہ اکثر یہ حالات نواب
وقار الملک کو بھی لکھتے رہتے اور دوسرے ٹرسٹی بھی اطلاعیں دیتے رہتے نواب صاحب
کو خود بھی پورا اندازہ تھا اور اب سکوت کو قومی گناہ تصور کرنے لگے تھے اُنھوں نے وقتاً
نوقتاً آزادی سے اپنی رائیں لکھیں اور اپنے مسلک کی نسبت خود سر سید ہی کو
تحریر کیا کہ :-

"اگر مجھ کو یہ یقین ہوتا کہ اب اور کچھ زیادہ عرض کرنا کالج کے لئے مفید ہوگا تو
مجھکو وہ طریقہ معلوم ہے کہ جس سے میری اس گذارش پر توجہ اور اس پر
مباحثہ کرنے کے لئے آپ مجبور ہوتے لیکن مجھکو معلوم ہے کہ اس سے کچھ

(بقیہ نوٹ صفحہ ۱۴۸) موجودہ انتظامی سسٹم ناقص ہے اور وہ اس وجہ ناقص ہے کہ اسکے
ذریعہ سے کل اختیارات متعلق بندوبست و نظام ایک شخص واحد کے ہاتھ میں آجاتے
ہیں ان وجوہات سے جو اظہر من الشمس ہیں یہ امر ضروری تھا کہ کالج کے بچپن کے زمانہ
میں اختیارات اور فرائض صرف اس کے بانی کے ہاتھ میں رہیں۔۔۔ مگر جوں جوں
کالج بڑھتا اور وسیع ہوتا گیا ان اختیارات کے ایک شخص کے ہاتھ میں مرکوز اور مجتمع
ہونے کی ضرورت کم ہوتی گئی اور ان کے مفید ہونے میں فرق آگیا۔

فائدہ نہوگا۔ میں اب اس قصہ کو طول دینا نہیں چاہتا اور اسی لئے میں نے اپنا مسلک یہ اختیار کر لیا کہ بُرا یا بھلا جو کچھ میری سمجھ میں آتا ہے اس کو اپنا فرض سمجھ کر آپ کے سامنے بہت ادب سے پیش کر دیتا ہوں پھر اس کے بعد آپ جانیں اور آپ کا دین و ایمان۔ پہلا عریضہ جو میں نے گذرانا تھا وہ وہ بلاشبہہ بالکل ایک خانگی عریضہ تھا مگر جب میں نے دیکھا کہ اس میں بھی آپ اپنی معمولی ضد سے کام لینا چاہتے ہیں تو میں نے اُن لوگوں کے اعتراض کے لحاظ سے جو لکھتے ہیں کہ ٹرسٹی کچھ توجہ نہیں کرتے دوسرے عریضہ میں اسی مضمون کو مُدلل طور سے بحیثیت ایک ٹرسٹی کے پیش کر دیا۔

لیکن اس سے کوئی نتیجہ برآمد نہ ہوا اسی سلسلہ میں سرسید نے ایک خط کے جواب میں اُن کو لکھا کہ :۔

جن امور کو آپ تصور کرتے ہیں کہ قومی کالج کے لئے مبارک فال نہیں ہیں ہم اُنھیں امور کو قومی کالج کے لئے مبارک فال سمجھتے ہیں پس اس کا کوئی علاج نہیں ہے اور یہ یقین کرنا چاہئے کہ جو خدا کو منظور رہے وہ ہوگا۔"

نواب صاحب نے اس نوبت پر ٹرسٹیوں کو صاف طور پر متوجہ کیا کہ :۔

اب یہ وقت نہیں رہا کہ کمیٹی کا سکرٹری ایک ایسا شخص ہو جو اختیارات تو معمول سے بہت زیادہ رکھتا ہو اور ذمہ داریوں کے برداشت کرنے کی اس میں قوت نہو اور کمیٹی کے ممبر اس کی بزرگی اور عظمت اور اس کی گذشتہ خدمات اور احسانات اور دوسری قسم کی خوبیوں اور اسی کے ساتھ اسکی غصیلی اور پرضد طبیعت کے لحاظ سے کسی واجبی سی واجبی بات کو جو اسکی اپنی اکیلی مرضی کے برخلاف ہو آزادانہ اس کے سامنے پیش کرنے کی بہت کم جرات کرتے ہوں اور اگر کسی نے ایسی جرات کی تو اس کو

جناب ممدوح کی بزرگانہ جھڑکیوں کی برداشت کرنے کے لئے جو بلاشبہہ غرور اور کینہ کی آمیزش و آلائش سے بالکل پاک اور صاف ہوتی ہیں تیار رہنا پڑا ہے۔"

اسی عرصہ (۱۸۹۷ء) میں سرسید نے قانون کی ایک دفعہ ۴۴ کی رو سے جس میں کالج کے مطالب کے لئے فوراً کارروائی کے اختیار سکرٹری کو تھے خود ہی اکیس جدید ٹرسٹی منتخب کر دئے اور جب اس کی اطلاع ایجنڈا میں درج کر کے اور ٹرسٹیوں کو دی گئی تو نواب محسن الملک نے سخت مخالفت کی اور نواب وقار الملک نے ایک طویل احتجاجی یادداشت لکھی مگر جب یہ کارروائی ۲۲ اگست کی میٹنگ میں پیش ہوئی تو اس کے جواز میں سرسید نے کہا کہ :-

چوں کہ جنوری میں میری طبیعت جادۂ اعتدال سے زیادہ منحرف ہو گئی تھی اور بہ سبب پیرانہ سالی کے مجھے اندیشہ تھا کہ علالت کا کیا انجام ہو گا اور چونکہ کالج میرا قائم کیا ہوا ہے اور تمام ٹرسٹی جو مقرر ہوئے ہیں وہ میری ہی تجویز سے ہوئے اس لئے کالج کے آئندہ استحکام اور بہبودی کے لئے جس کا مجھ سے زیادہ شاید کسی کو خیال ہو مجھکو ضرور معلوم ہوا کہ ٹرسٹیوں کے عہدہ جات خالی کو اپنی زندگی میں ایسے ٹرسٹیوں سے معمور کر دوں جن سے مجھکو امید ہے کہ میرے بعد بھی کالج کی بہبودی کی فکر رکھیں گے ۔ اس لئے مجھکو بموجب اس اختیار کے جو حسب دفعہ ۴۴ قواعد و قوانین ٹرسٹیاں تھا بنظر سود و بہبود کالج کے بحیثیت لائف آنریری سکرٹری ان تمام امور کے کرنے کا حاصل ہے جو مجموعاً ٹرسٹیان کالج کر سکتے ہیں اس کے مطابق میں نے ۲۱ صاحبوں کو ٹرسٹی مقرر کیا اور فی الفور اس کارروائی کی اطلاع بذریعہ تحریر کے جملہ ٹرسٹیوں کو دی کیونکہ میری حالت ایسی تھی کہ جنوری ۹۸ء تک زندہ رہنے

کی مجھکو امید نہ تھی۔

اس بیان پر بجز ایک ٹرسٹی کے سب نے یہ کارروائی جائز قرار دی، مرزا عابد علی بیگ کی تحریک اور مولوی نذیر احمد دہلوی کی تائید سے نواب صاحب کے متعلق ناراضی کا ووٹ پاس کیا گیا مگر انھوں نے اس کا کوئی اثر قبول نہیں کیا چنانچہ بہت بعد کو ایک موقع پر مولوی بشیرالدین صاحب (مینجر اسلامیہ ہائی اسکول اٹاوہ واڈیٹر اخبار البشیر) نے ایک خط میں جب مرزا صاحب کے متعلق اپنے بعض خیال ظاہر کیے تو ان کو لکھا کہ :-

مرزا صاحب کی نسبت جن وجوہ سے آپ نے اپنی بیزاری کا اظہار کیا ہے مجھکو ان وجوہ پر مطلق علم نہیں اور جب تک علم اور اس کی تحقیق کا موقع نہ ہو معاف کیجیے کہ میں اس بیزاری میں شریک نہیں ہو سکتا حالانکہ آپ واقف ہیں کہ انہیں مرزا صاحب نے میری نسبت ٹرسٹیز کمیٹی میں ملامت کا ووٹ پاس کرایا تھا مگر اُس وقت بھی اس کا اثر میرے اوپر اتنا بھی نہ ہوا جس قدر کہ اُڑ دیر سفیدی اور میں اپنے اس عقیدہ پر قایم رہا کہ یہ سب ووٹ پاس کرنے والوں کی خطا ہے، میں خطا سے بری ہوں اور ان حضرات کی وجہ سے میں کالج کو نہیں چھوڑ سکتا جو گویا خود ہمارا کالج ہے۔

معاملہ اس ملامت کے ووٹ پر ہی ختم نہیں ہوا بلکہ آنریری سکریٹری کے اختیارات کی رو سے سرسید نے تہیہ کر لیا کہ ان کو ٹرسٹیوں کے زمرہ سے ہی خارج کر دیا جاے لیکن بعض اصحاب کے اصرار سے یہ نوبت نہ آئی بایں ہمہ نواب وقار الملک اپنی جدو جہد میں معروف رہے اور جب امید اصلاح کی کوئی جھلک باقی نہیں رہی اور تمام

---

[1] مرزا صاحب مراد آباد کے رہنے والے پنشنر سب جج تھے انھوں نے اس ادارہ کی ابتدا سے نہایت نمایاں خدمات انجام دی تھیں سرسید کے بڑے معاون اور رفیق تھے۔

خانگی کوششیں نقش برآب ثابت ہوئیں تو پھر اُنھوں نے ایک آخری خط لکھا اور ان تمام مباحث کو اس اطلاع پر ختم کیا کہ میرا اپیل اب قوم کے سامنے ہوگا۔

اس خط میں جو اطلاع دی گئی تھی اس کے مطابق نہ صرف اُن ہی کی طرف سے اپیل شائع ہونے والی تھی بلکہ وہ رفقاے کار بھی جن سے زیادہ سرسید کا کوئی جاں نثار اور مداح و معترف نہ تھا اس کارروائی میں شرکت کے لئے آمادہ تھے لیکن اس اپیل کی اشاعت کی نوبت نہیں پہنچی اور سرسید کی وفات نے جو ۲۸ مارچ ۱۸۹۸ء کو واقع ہوئی ان تمام قضیوں کا خاتمہ کر دیا۔ اس کے متعلق ۱۹۰۵ء میں مولانا حالی کو ایک یورپین مسٹر کارنا کے مسئلہ تقرر پر متوجہ کرتے ہوے لکھا تھا کہ:-

جو کوشش کہ کالج کے اس اہم مسئلہ کے متعلق جناب نے فرمائی اور فرما رہے ہیں وہ کچھ نئی نہیں لیکن ایک خاص مضمون بہت ہی کم لوگوں کو معلوم ہے کہ اگر جناب سرسید مرحوم و مغفور ایک مہینہ بھی اور زندہ رہتے تو جناب اور نواب محسن الملک بہادر اور خاکسار کے دستخطوں سے ایک ایک یادداشت ٹرسٹیوں میں جاری ہی ہو چکی تھی کہ کالج کی خبر لیں اور اس کو یورپین اسٹاف کے ہاتھوں میں جانے سے روکیں"

پھر اپنے ایک مضمون میں جو ۱۹۰۷ء کے پیسہ اخبار (لاہور) میں شایع ہوا یہ بیان کیا ہے کہ:-

" ان حالات کو دیکھ کر وہ لوگ جن کو قوم کا زیادہ درد تھا بہت فکر میں پڑ گئے تھے اور باہم سرگوشیاں ہونے لگی تھیں اور بالآخر باوجود سرسید مرحوم و مغفور کے اُن اقتدارات اعظم اور عظمت و جلال کے جس کی دوسری نظیر شاید مدت تک نہ ملے گی بعض ٹرسٹیوں نے یہ فیصلہ کر لیا تھا کہ اب ہم کو صرف اپنی قوم کی بہبودی کا خیال مدنظر رکھنا چاہیے اور

جناب مرحوم و مغفور کی مروت کو قوم کے مقابلہ میں بالائے طاق رکھنا چاہیئے
مضامین کا ایک سلسلہ روزانہ پیسہ اخبار لاہور میں چھاپنا تجویز ہوا تھا
جو گمنام نہ ہوتا بلکہ اس پر ایسے لوگوں کے دستخط ثبت ہوتے جیسے کہ نواب
محسن الملک اور شمس العلماء مولوی خواجہ الطاف حسین حالی اور ایک یہ
خاکسار مشتاق حسین اور مجھ کو اس وقت اچھی طرح یاد نہیں رہا غالباً آنریبل
حاجی محمد اسمٰعیل خاں بہادر کے دستخطوں کا بھی ان مضامین پر ثبت ہونا
تجویز ہو گیا تھا ان مضامین کے ذریعہ سے یہ بات ثابت کرنی مقصود تھی کہ
کالج کے قیام سے جو اصل مقصد تھا اب جناب مرحوم و مغفور اپنے ہاتھ سے
اس کو برباد کر رہے ہیں اور ٹرسٹیوں اور قوم کو چاہیئے کہ وہ جناب مرحوم
کی اس خود مختاری کو روکے اور کالج کو تباہی سے بچائے۔

پہلا نمبر اس سلسلہ مضامین کا میں نے اپنے قلم سے لکھا تھا اور نواب
محسن الملک بہادر اور شمس العلماء مولوی حالی صاحب کی خدمت میں جو
غالباً اس وقت علی گڑھ ہی میں تشریف رکھتے تھے دستخطوں کے لئے بھیجا
گیا تھا کہ دفعتاً جناب مرحوم و مغفور کی رحلت کی خبر پہونچی اور میں نے
فوراً نواب محسن الملک کو تار دیا کہ وہ مضمون واپس کر دیں کیونکہ اب ہمارے
دلوں میں جناب ممدوح کی خوبیوں اور بے نظیر عمدہ اوصاف کے سوا
اور کوئی خیال باقی نہیں ہے چنانچہ اُسی وقت سے ان مضامین کا سلسلہ
ترک کر دیا گیا بلکہ دلوں سے بھی اس شکایت کو نکال دیا گیا اور اُس وقت
بھی صرف کالج کے فوائد کی غرض سے اس کو ظاہر کیا گیا ہے۔

سر سید کی رحلت کے بعد بروے قانون سید محمود کی
جانشینی ایک طے شدہ معاملہ تھا اس لئے اُنھوں نے فوراً ہی سکرٹری کی حیثیت سے

کام شروع کر دیا آیندہ انتظام کے متعلق الہ آباد جاکر ہز آنر سے ملاقات کی اور مسٹر بیک کو رجسٹرار کے اختیارات دیدے نواب محسن الملک علی گڑھ میں مقیم تھے ان کو کالج کی مالی حالت[1] کا اندازہ تھا اُنھوں نے موقع اور وقت سے فائدہ اٹھاکر اور سرسید میموریل فنڈ قایم کرکے قوم میں محمڈن یونیورسٹی[2] کی تحریک شروع کردی مولوی سمیع اللہ خاں بھی پُرانی رنجش کو بُھلا کر اس جدید تحریک میں رفیق کار بن گئے تاہم کالج امید وبیم کے ایک دور میں تھا اور حالات کے لحاظ سے ترمیم قانون ناگزیر تھی اس لئے ہر طرف سے ترمیمات وتحریکات پیش ہونی شروع ہوگئیں مسٹر بیک اپنے لائف پرنسپل مقرر کئے جانے کے متعلق قانون میں ترمیم چاہتے تھے انتظامی عہدوں کے کے لئے بھی کشمکش جاری ہوگئی تھی اور اختلافات نے ایک مہیب شکل اختیار کرلی تھی، جس میں اسٹاف کی بھی فریقانہ حیثیت تھی، سید محمود کی جو حالت تھی اُس سے کوئی امید نہ تھی کہ وہ ان مشکلات پر غالب آجائیں گے جولائی میں ہز آنر علی گڑھ آئے اور ایک پرائیویٹ ملاقات میں طے ہوا کہ ان کو بورڈ آف ٹرسٹیز کا پریسیڈنٹ بنا دیا جائے نواب وقار الملک نے ان کی خرابی صحت اور طوالت کارروائی کی عادت کو مدنظر رکھ کر رائے دی کہ

> ان کے حقوق وخدمات کے لحاظ سے ایسا عہدہ تجویز کیا جائے جو مرتبت میں پریسیڈنٹ کے عہدہ سے فائق ہو اور کالج کے ساتھ بھی مستقل طور سے تعلق قائم رہے اور وہ اپنی بے نظیر خداداد قابلیت سے جو کچھ کام کالج کے لئے کرنا چاہیں کرسکیں اور وہ کام خواہ کتنی ہی دیر سے ہو اس کی وجہ

---

[1] مالی حالت مختصراً یہ تھی کہ بڑا بار قرضہ سودی وبلا سودی کا تھا اسٹاف کی تنخواہیں رُک گئی تھیں تعمیر کا کام بند پڑا تھا۔

[2] تذکرہ محسن میں تفصیل ہے۔

کالج کے روزانہ کام میں کچھ ہرج نہ ہوگا۔

لیکن وہ خاص اختیارات کے ساتھ پریسیڈنٹ ہی تجویز کئے گئے۔

مسٹر بیک اور سید محمود اور سید محمد احمد[1] میں کھلم کھلا مخالفت تھی اول الذکر نے اپنے اصلی کام کو چھوڑ کر تمام قوت ان ہی کاموں کے لئے وقف کر دی، نواب وقار الملک اس صورت حالات کو خاموشی سے دیکھتے رہے۔ اور ان کی زیادہ تر کوشش یہ تھی کہ اطمینان کے ساتھ قانون و قواعد کی ترمیم ہو جائے وہ چاہتے تھے کہ جنوری (۹۹ء) کے اجلاس میں ترمیم قانون ملتوی رہے اور غور و فکر کے ساتھ ترمیمات کر کے اپریل میں پیش کیا جائے اور اس کے بعد عہدوں پر انتخابات و تقررات ہوں انہوں نے بہت زیادہ زور دیا کہ "سرسید کی حیات تک ملک و قوم اور ٹرسٹیوں کا تمام بھروسہ ان پر تھا نہ کہ اس مجموعہ قواعد پر اور اسی لئے جس قدر نقصانات کہ اس مجموعہ میں ہیں ان پر لوگوں کو غور کا موقع ہی نہیں ملا اور ان کے بعد بھی یہی حالت ہے اور جو ترمیمات پیش ہوئی ہیں وہ بھی ناکافی ہیں اس لئے کافی وقت ملنا چاہئے" ساتھ ہی انہوں نے انتخابات و تقررات میں مخفی ووٹ کی ضرورت بیان کی اور اس کے برخلاف طریقہ کو رنجشوں کی بنیاد قرار دیا۔ پھر اس بے اطمینانی پر جو اس وقت پھیلی ہوئی تھی متوجہ کر کے اپنی خدمات پیش کیں اور اس بات پر آمادگی ظاہر کی کہ قیام علی گڑھ میں رکھ کر سید محمود کو مدد دیں انہوں نے واضح طور پر یہ بھی لکھ دیا کہ

> میں اپنے لئے کوئی خاص پوزیشن نہیں چاہتا نہ اب اور نہ آئندہ بلکہ کالج کے ٹرسٹی اور سید محمود صاحب کے ایک قدیمی نیاز مند اور قوم کے ایک ادنیٰ خادم کی حیثیت اس طرح کام کرنے کی غرض سے میرے لئے بالکل کافی ہے اور میرے اور کالج کے لئے یہ کوئی نئی بات بھی نہیں ہے برسوں تک

---

[1] سرسید کے بھتیجے پنشن یافتہ سب جج اور ۱۸۹۶ء میں اسسٹنٹ سکرٹری مقرر ہوئے تھے۔

میں اسی طرح جناب سر سید صاحب مرحوم و مغفور کے ساتھ کام کرتا رہا ہوں۔"

لیکن حالات ہی ایسے رونما ہوئے کہ ان کو بھی سکرٹری شپ کا تغیر ضروری معلوم ہوا اور وہ بھی اس پر متفق ہو گئے۔ عام رائے نواب محسن الملک کے انتخاب پر تھی نواب وقارالملک بھی موید تھے لیکن اس سلسلہ میں جب مسٹر بیک نے ایک گشتی خط کے ذریعہ سے اس انتخاب کے متعلق رائیں حاصل کرنی شروع کیں تو نواب وقارالملک نے انکی خدمات پرنسپلی کا اعتراف کرتے ہوئے لکھا کہ :۔

ہمارے کاموں میں ان کی یہ مداخلت ایک بے جا مداخلت ہے اور ناقابل برداشت ہے۔

۳۱ جنوری کو اجلاس منعقد ہوا نواب محسن الملک سکرٹری اور سید محمود پریسیڈنٹ ہو گئے اور ان کو خاص اختیارات دئے گئے۔ امید بندھی کہ اب اطمینان کے ساتھ کام ہوگا مسٹر بیک کا بھی ستمبر ۱۸۹۹ء میں انتقال ہو گیا اور مسٹر (سر) ماریسن جانشین ہوئے مگر صورتِ حالات بد سے بدتر ہوتی چلی گئی اور آنریری سکرٹیری اور پرنسپل دونوں نے تحریکیں کیں کہ سید محمود جدید عہدہ سے معزول کئے جائیں ورنہ وہ دونوں بھی مستعفی ہو جائیں گے اب نازک صورت پیدا ہو گئی اس باوقار شخصیت کی معزولی ہر ایک لحاظ سے تکلیف دہ امر تھا۔ ۳ جنوری ۱۹۰۰ء کے اجلاس میں یہ مسئلہ پیش ہونے والا تھا، نواب وقارالملک اجلاس سے دو تین پہلے علی گڑھ آئے صورت حالات کا مطالعہ کیا اور بالآخر یہ رائے دی کہ :۔

ایک مسٹر ماریسن نہیں پچاس ماریسن اور ایک نواب محسن الملک بہادر نہیں سو محسن الملک بھی ایسی دھمکی دیتے اور ان کے ساتھ کالج اور اسکول کے تمام طلبا اور بورڈ بھی اس قسم کی دھمکی میں شریک ہوتے مگر سید محمود کی

حالت صحت درست ہوتی اور کالج کا کام وہ میری دانست میں
اچھی طرح کرسکتے ہوتے تو میں ایک دفعہ اسکول و کالج اور بورڈنگ ہاؤس
کا بالکل خالی ہونا پسند کرتا بہ نسبت اس کے کہ اس قسم کے دباؤ کی وجہ
سے سید محمود صاحب کے خلاف کوئی راے دیتا لیکن کیا کیا جائے ان کی
حالت صحت ہی کچھ ایسی ہوگئی ہے کہ ہم کو یہ مجبوری کالج کے فائدہ کی
غرض سے ان کو عہدہ لائف آنریری پریسیڈنٹ سے سبکدوش کرنے
کی راے دینی پڑی ہے۔

اب سید محمود وزیٹر[۵] اور نواب ممتاز الدولہ فیاض علی خاں رئیس پہاسو پریسیڈنٹ منتخب ہوے اس موقع پر نواب وقار الملک نے پریسیڈنٹ کے اختیارات پر بحث کی کہ خاص اختیارات جو در اصل آنریری سکرٹیری کے تھے اور سید محمود کو بوجہ ان کی قابلیت کے خاص طور پر دئے گئے تھے دوسرے پریسیڈنٹ کو نہ دئے جائیں بلکہ آنریری سکرٹیری کو ہی ملنے چاہئیں۔

اسی اجلاس میں ان کی تحریک و بحث پر ایک سلیکٹ کمیٹی مقرر ہوئی کہ قانون و قواعد پر نظر ثانی کرے اور وہ ہی سکرٹیری مقرر کئے گئے اور اُنھوں نے علی گڑھ اور سیتاپور میں مقیم رہ کر اس خدمت کو انجام دینے میں سید محمود کی قانونی قابلیتوں سے فائدہ اُٹھایا لیکن قبل ازیں کہ کام کلیۃً تکمیل کو پہونچے ناگزیر ضرورتوں کی وجہ سے سکرٹیری کے عہدہ سے مستعفی ہوگئے تاہم بڑے مراحل طے کرچکے تھے اور بالآخر قانون و قواعد کی تکمیل ہوگئی۔

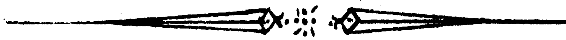
---

[۵] اجلاس میں جب یہ مسئلہ پیش ہوا تو بعض ٹرسٹیوں نے اختلاف کیا اور سید محمود نے بھی تسلیم نہیں کیا اس نوبت پر ہز آنر لفٹننٹ گورنر پیٹرن کالج اور ان کے مابین طویل مراسلت ہوئی اور بالآخر اُنھوں نے ۱۰ر اپریل ۱۹۰۱ء کو باقاعدہ منظوری بھیجدی۔

نواب حاجی محمد اسمعیل خاں مرحوم رئیس دتاولی نے جو علی گڑھ تحریک کے زبردست علم بردار تھے اور جنہوں نے آغاز کار سے سرسید کے ساتھ اس تحریک کی ترقی میں دامے درمے قلمے اور سخنے بڑی بڑی کوششیں کی تھیں۔ ۱۹۲۰ء میں مولف تذکرہ کے ایک خط کے جواب میں اُن اختلافات کے متعلق جن کا تذکرہ اس باب میں ہے تحریر کیا تھا کہ :-

مجھ کو خوب یاد ہے کہ کالج کے معاملات میں نواب وقارالملک مرحوم اور سید صاحب مرحوم کے درمیان میں ہمیشہ سخت اختلاف رہا مگر دونوں بزرگ تحمل اور بردباری سے رہتے تھے اور احمقانہ رنجشوں سے دور رہتے تھے ...... نواب وقارالملک مرحوم نے ہمیشہ باوجود اختلافوں اور سید صاحب مرحوم کے غصہ کے سید صاحب مرحوم اور سید محمود صاحب مرحوم سے نہایت سنجیدہ اور محبت آمیز سلوک رکھا اور سوائے اس کے کہ وہ سید صاحب مرحوم کی رایوں کو نہ مانتے تھے اور کسی طرح پر ادب و لحاظ میں کمی نہ کرتے تھے میں نے جہاں تک غور کیا ہے باوجود اس کے کہ مجھ میں اور نواب وقارالملک مرحوم میں بھی اختلاف رہا ہے مگر میں ان کو نہایت ایماندار۔ راست باز۔ قومی معاملات میں ذاتی اغراض سے دور اور متنفر مانتا ہوں اور اب میں یہ بھی تسلیم کرتا ہوں کہ سید صاحب مرحوم اور میرے نواب وقارالملک مرحوم کے درمیان میں جو اختلاف تھے اس میں نواب وقارالملک مرحوم حق پر تھے کیونکہ تجربہ یہی بتا رہا ہے ...... میں نے اس لکھنے کے بعد مکرر آپ کا خط پڑھا تو ایک جواب رہ گیا تھا یعنی سید صاحب کی وفات کے بعد سید محمود مرحوم سے کوئی بدسلوکی نواب وقارالملک مرحوم نے نہیں کی البتہ

جس طرح سب دوست سید محمود مرحوم کی حالت پر افسوس کرتے تھے
وہ بھی اس میں شریک تھے اور جہاں تک مجھ کو یاد ہے اور خوب یاد ہے
سید محمود مرحوم دو شخصوں پر خاص ناراض تھے ایک نواب محسن الملک
مرحوم پر اور ایک مجھ پر اور وہ کسی تیسرے پر ناراض نہ تھے اور یہ جملہ میں نے
اس لئے لکھا ہے کہ اگر نواب وقار الملک نے اُن کو چھیڑا ہوتا تو ضرور
اُن پر سبّ و شتم کرتے۔



باب ہفتم

سیاسی تنظیم اور مسلم لیگ کا قیام

نواب صاحب سیاسیات میں سرسید کی پالسی کے حامی[۵] تھے ان کے نزدیک مسلمانوں کا کانگریس اور ایجی ٹیشن میں شریک ہونا خودکشی کے مرادف تھا

---

[۵] افسوس ہے کہ موجودہ دور میں مسلمانوں کی کوئی سیاسی تاریخ نہیں جس سے معلوم ہو کہ سرسید کی پالیسی کن اسباب و وجوہ پر مبنی تھی، ہمارے پرجوش نوجوان اس زمانہ کے حالات اور سیاسیئن کے خیالات سے مرعوب و متاثر ہو کر بے دھڑک سرسید اور اُن کے جانشینوں کو مسلمانوں میں غلامانہ ذہنیت پیدا کرنے والا سمجھتے اور کہتے ہیں، لیکن وہ سلطنت مغلیہ کے زوال اور انگریزی حکومت کے استقلال کی تاریخ میں، ہنی سیاسی پوزیشن اور دیگر قوموں کے ساتھ اپنے تباین حالات کا مطالعہ نہیں کرتے، اگر سرسید کے پولٹیکل ورک کو ان حالات و واقعات کے ساتھ ساتھ مطالعہ کریں تو وہ تسلیم کرنے پر مجبور ہوں گے کہ تمام مقتضیات عصری سے اس وقت وُہی پالیسی صحیح تھی اور بقول مولانا محمد علی مرحوم

تاہم ہیں اس اعتراف کے مجبور ہوں کہ مسلمانوں یا بہ حیثیت مجموعی کوئی خیر طلب مسلمانان ہند کی رہنمائی کے لئے بجز اس کے اور کوئی راہ اختیار کر ہی نہیں سکتا تھا.....

باوجود الزام کفر والحاد اور باوجود شدت سب وشتم سیاسی پالسی میں ساری قوم کی قوم نے بے چون وچرا اسی شخص کی پیروی کی ظاہر ہے کہ منطقی مغالطے یا سیاسی سبز باغ میں اتنی قوت (بقیہ نوٹ بر آیندہ)

حیدرآباد سے سبکدوش ہو کر وطن آئے تو انہوں نے ایک موقع پر یہ خیال ظاہر کیا تھا کہ:-

ہندوستان میں جس قسم کی حکومت ہو رہی اس کے لحاظ سے رعایا کے لئے
عمدہ ترین پالسی یہ ہی ہے کہ حکام کو حتی الامکان اپنے سے ناخوش نہ
ہونے دے اور اس کے برخلاف کوئی کوشش نوجوانوں کا کام ہے،
میرے ولولے اب آزادی اور مساوات کے متعلق پست ہو چکے ہیں
اور میں اب اسی کو غنیمت سمجھتا ہوں کہ جو دن زندگی کے باقی ہیں وہ
آرام کے ساتھ گذر جائیں۔

مگر ۱۸ اپریل ۱۹۰۰ء کو جب صوبہ متحدہ کی حکومت نے سرکاری دفاتر میں اجرائے ہندی کے متعلق اپنا مشہور رزولیوشن[۱] صادر کیا جو مسلمانوں کی قومیت پر ہی ایک ضرب شدید تھا تو نواب صاحب بھی بہت متاثر ہوئے اور اب ان کے لئے زمانہ کے تغیرات اور سیاسی مقتضیات سے بے تعلق رہ کر گوشہ گزیں رہنا دشوار ہو گیا،

(بقیہ نوٹ صفحہ ۱۶۱) نہیں ہو سکتی اور میرا یقین واثق ہے کہ اس میں محض اس
وجہ سے کامیابی ہوئی کہ ان کی سیاسی رائے صائب تھی" (خطبہ صدارت
کانگریس ۱۹۲۳ء)

نوٹ صفحہ ہذا) [۱] ۱۸۶۶ء میں سرسید نے ایک ورنیکلر یونیورسٹی کی تحریک کی تھی جس میں اردو ذریعہ تعلیم ہوتی کیونکہ اس وقت بھی ملک کی یہی مشترکہ زبان تھی لیکن بعض ہندؤں کی طرف سے مخالفت کی آواز بلند ہوئی ۱۸۶۷ء میں بنارس کے با اثر ہندوؤں نے سرکاری دفاتر میں اردو زبان اور فارسی رسم الخط کی جگہ بھاشا اور دیوناگری حروف جاری کئے جانے کے لئے تنظیمی کوششیں شروع کیں بہار میں بھی یہی کوششیں تھیں جو کامیاب ہوئیں سر انٹونی میکڈانلڈ اس وقت کلکٹر کے عہدہ پر تھے اور ان کوششوں کی تائید و حمایت میں ان کا بڑا حصہ تھا، ممالک متحدہ میں سرسید نے تنہا مقابلہ کیا اور اسوقت (بقیہ نوٹ برصفحہ آئندہ)

اُنھوں نے پہلے تو اس بات کی کوشش کی کہ حکمرانِ صوبہ ہز آنرسر انٹونی میکڈانلڈ کو بالمشافہ گفتگو سے اس رزولیوشن کے نقصانات و اثرات پر متوجہ کریں لیکن جب ہز آنر نے ملنے سے انکار کیا تو اُنھوں نے ان تمام احتجاجی کارروائیوں میں گرمی کے ساتھ حصہ لیا جو نواب محسن الملک کی رہنمائی میں مسلمانوں نے کیں وہ لکھنؤ کے اس عظیم الشان جلسہ میں شریک ہوئے جو ۱۸ اگست کو منعقد ہوا اور گویا، مسلمانانِ ہند کا یہ پہلا احتجاجی مظاہرہ و مجاہرہ تھا، اس جلسہ میں اُنھوں نے بھی پر زور تقریر کی۔

(ہندوؤں کو ناکامی ہوئی لیکن اُنھوں نے پنجاب کو بھی ہم نوا بنا کر کوششوں کا سلسلہ قائم رکھا ۱۸۸۲ء میں ہنٹر کمیشن کے سامنے بھی اسی قسم کی درخواستیں پیش ہوئیں چنانچہ علی گڑھ کے مقام پر ڈاکٹر ہنٹر نے اپنی تقریر میں کہا تھا کہ :-

ایک زبردست گروہ لوگوں کا موجود ہے جو یہ درخواست کرتا ہے کہ ہندی یا لوگوں کی دیسی زبان اب بھی کثرت سے سکھائی جائے ہر دن کی ڈاک میں ہمارے پاس ہندی کی تائید میں ایسے میموریل آتے ہیں جن پر کثرت سے دستخط ہوتے ہیں چنانچہ ایک عرضی پر جو کل دی گئی تھی ۷۲۲۳ نام لکھے ہوئے تھے "

تاہم اس مرتبہ بھی ناکامی ہوئی مگر جب ۱۸۹۸ء میں عنانِ حکومت سرانٹونی میکڈانلڈ کے ہاتھوں میں آئی تو ان کوششوں میں ایک نئی جان پڑ گئی اور بالآخر وہ ۱۹۰۰ء میں کامیاب ہوئے، اب سرسید کا انتقال ہو چکا تھا اور نہ کوئی شخص ایسا تھا جو مقابلہ کرتا نہ کوئی ایسوسی ایشن ہی تھی، البتہ نواب محسن الملک نے سرسید کی جانشین کی حیثیت سے جمہوری طریقہ پر احتجاج کیا اردو ڈیفنس ایسوسی ایشن قائم ہوئی جس کا ایک بہت بڑا جلسہ ۱۸ اگست کو منعقد ہوا (تذکرہ محسن میں تفصیل ملاحظہ ہو)

اس واقعہ نے تعلیم یافتہ مسلمانوں میں قومی حقوق کے تحفظ کا خیال اور ایک پولٹیکل ایسوسی ایشن کی ضرورت کا احساس پیدا کرادیا، اخبارات میں بھی اس خیال و احساس کے متعلق بکثرت مضامین شائع ہوئے اور پرائیوٹ صحبتوں میں بھی بحثیں ہونے لگیں، ان حالات کا نواب وقارالملک پر نہایت گہرا اثر پڑا اور انھوں نے گوشہ عافیت سے نکلنے کا ارادہ کرلیا۔

نواب محسن الملک نے علی گڑھ انسٹیٹیوٹ گزٹ میں ایک مضمون بعنوان "مسلمانوں کو اپنے پولٹیکل حقوق کی حفاظت کے لئے کیا طریقہ اختیار کرنا چاہئے" شائع کیا اور رائے دی کہ ہمارے پولٹیکل مقاصد کی حفاظت کے لئے بظاہر کوئی تجویز اس سے بہتر نہیں ہوسکتی کہ محمڈن اینگلو اورینٹل ڈیفنس ایسوسی ایشن کو پھر قائم کیا جائے جو سرسید کے زمانہ (۳۰ دسمبر ۱۸۹۳ء) میں ہوئی تھی اور جس نے یہ طے کیا تھا کہ پولٹیکل مستعدی کا ایک ترمیم شدہ طریقہ اختیار کیا جائے یعنی ایک طرح یہ نہ تو بالکل خاموش رہنا اور دوسری طرح یہ عام طور پر ایجی ٹیشن نہ کرنا اسی مضمون کے ساتھ انھوں نے مذکورہ بالا ایسوسی ایشن کے قیام کی روئداد بھی شایع کی۔

اس مضمون و روئداد کو پڑھنے کے بعد فوراً نواب صاحب نے نواب محسن الملک کو حسب ذیل خط لکھا کہ :-

"۵ اراگست کے پرچہ علی گڑھ انسٹیٹیوٹ گزٹ میں آپ نے ایک رائے اور ۱۸۹۳ء کی ایک روئداد محمڈن اینگلو اورینٹل ڈیفنس ایسوسی ایشن آف اپر انڈیا کے متعلق مشتہر فرمائی ہے جس کا مفصلہ ذیل فقرہ آب زر سے لکھنے کے قابل ہے کہ"

جس حالت میں کہ مسلمانوں کے حقوق تلف ہو رہے ہیں اور ان کے مقاصد پر حملے کئے جاتے ہیں اور اخبار نویس برابر آرٹیکل لکھ رہے ہیں

تو کیوں کر ممکن ہے کہ مسلمان خاموش رہیں اور ان کی خاموشی سے نقصان نہ پہونچے اور کچھ نہ کرنا اور اپنی کوشش کو صرف تعلیم کی جانب مصروف رکھنا ایک ایسی تجویز ہے کہ اس کا عملدر آمد ناممکن ہے"

اس کے بعد پھر آپ نے یہ رائے دی ہے کہ :-

ڈیفنس ایسوسی ایشن کی اسی تجویز کے مطابق اب بھی عملدر درآمد کیا جاوے اور کسی تجویز کا اپنے پولٹیکل حقوق کی حفاظت کی غرض سے اختیار کرنا مسلمانوں کے لئے خطرناک ہوگا۔ جب کہ آپ مسلمانوں کو ایسی اہم تجویز کی نسبت متوجہ فرما رہے ہیں تو آیا مہربانی سے آپ اس امر کے متعلق بھی کچھ تحریر فرمانا ضروری سمجھیں گے یا نہیں کہ مذکورہ بالا ایسوسی ایشن جو ۱۸۹۳ء میں قائم ہوئی تھی اور جس کے بعد جناب سر سید احمد خاں بہادر اور مسٹر تھیوڈر بیک جیسے پرجوش اور کام کرنے والے لیڈر کئی سال تک زندہ اور تندرست رہے آیا اس کو اپنے مقصد میں کامیابی ہوئی اور اگر نہیں ہوئی تو اس کے اسباب کیا تھے یہاں اس قدر اور بھی لکھ دینا مناسب سمجھتا ہوں کہ مسلمانو کا ہندوؤں کی نیشنل کانگریس میں شریک ہونا میں بھی خودکشی ہی میں داخل سمجھتا ہوں اور جن بعض معزز مسلمانوں نے ایسا خیال کیا ہے کہ وہ ان کی اس انتہائی مایوسی کی وجہ ہے جو ان کو گورنمنٹ کی طرف سے مسلمانوں کے حقوق کی حفاظت کے متعلق خاص کر فی زمانہ پیدا ہوئی ہے اور انتہائی مایوسی انسان کو اکثر خودکشی کی طرف مائل کرتی رہی ہے مگر یہ کوئی عقل کا کام ہے اور نہ ہمت کا مگر جو تحریک کہ مسلمانوں میں اپنے حقوق کی حفاظت کی غرض سے گذشتہ سال سے از سر نو پیدا ہوئی ہے اس پر اب ذی فہم

اشخاص ہر جگہ غور کر رہے ہیں اور اُمید ہے کہ کسی عام جلسہ میں کوئی
نہ کوئی ایسا طریقہ عنقریب اختیار کیا جاوے گا جو سب سے زیادہ،
معتدل اور مفید اور عام پسند ہوگا اور بالآخر گورنمنٹ بھی اس پر مطمئن
ہو جاوے گی اور جن دوسری قوموں سے کہ ہم کو پشت ہا پشت سے
چولی دامن کا ساتھ رہا ہے ان کے ساتھ بھی اس تجویز سے کوئی منازعت
قائم نہ ہوگی جیسا کہ بدقسمتی سے اس سے پہلے ہوتا رہا ہے اور پولیٹیکل
حقوق کی حفاظت کے غل غپاڑہ کے ساتھ عام تعلیم اور اعلیٰ تعلیم کی طرف
بھی قوم کی توجہ بیش از بیش رہے گی کہ یہی دراصل ہر ایک کامیابی کے
خزانہ کی اصل کنجی ہے اور شاید کہ ہم اس صدی کا دوسرا سال اسی جدید
تجویز کے سایہ میں شروع کر سکیں۔

نواب محسن الملک نے بھی اس کے جواب میں مذکورہ بالا ایسوسی ایشن کے ناکام
رہنے کے اسباب بیان کرتے ہوئے اپنے قومی حقوق کی حفاظت کے متعلق زوردار
طریقہ سے توجہ دلائی کہ اب وقت باقی نہیں ہے کہ ایسے ضروری معاملہ میں دیر کی جائے
اور گھر میں بیٹھ کر عورتوں کی طرح نالہ و شیون کیا جائے اور اپنے حقوق کے تلف ہونے
کا الزام گورنمنٹ پر لگایا جائے بلکہ اب وقت آگیا ہے کہ سمجھدار مسلمان اپنی قوم کے
مصائب پر رحم کریں اور اپنی قومی حقوق کی محافظت کا کوئی طریقہ اختیار کریں"
بہرحال اس ضرورت کی آواز ہر طرف سے آرہی تھی اور اب اس کی اساس و
تنظیم کا بار نواب وقار الملک کے شانوں پہ آگیا۔

اُنھوں نے قوم کے تعلیم یافتہ اور سربرآوردہ اصحاب سے مراسلت کی
اور اس مقصد کے لئے پہلا جلسہ مشاورت اکتوبر ۱۹۰۱ء میں بمقام لکھنؤ منعقد ہوا
نواب صاحب نے ایک طویل و مفصل تقریر میں اس بات کو ظاہر کرنے کے بعد

کہ تمام ہندوستان میں کچھ عرصہ سے مسلمانوں کا درجہ کس طرح روزبروز تنزل کرتا جاتا ہے اور خاص خاص صوبوں میں بھی ان کے پولیٹکل حقوق پر حملہ ہو رہا ہے اور اُردو ناگری کے مسئلہ پر اشارہ کرتے اور اس امر پر توجہ دلاتے ہوئے کہ سرکاری عہدوں کی تعداد ان میں کس طرح روزبروز کم ہوتی جاتی ہے اور ویسرائے کی اور صوبوں کی قانونی کونسلوں میں وہ اپنے انتخاب سے اپنے ممبر نہیں بھیج سکتے۔ اپنی ایک اسکیم پیش کی کہ کس طریقہ سے آیندہ ان خرابیوں کا انسداد اور اپنے حقوق کی حفاظت کرنی چاہئے۔ اس اسکیم پر مباحثے ہوئے اور ایک ترمیمہ شکل میں وہ منظور کی گئی۔

اب اسکیم کو کامیاب بنانے کے لئے نواب صاحب نے متعدد مقامات کے دورے اور اہل الرائے اصحاب سے مشورے حاصل کئے اور ہر جگہ جلسے منعقد کرا کے مجوزہ آرگنایزیشن کے مقاصد بیان کرکے تعلیم یافتہ اور با اثر اصحاب کو اپنا ہم خیال اور متفق الرائے بنایا۔ نواب صاحب باوجودیکہ سخت قسم کے خانگی تردداتمیں مبتلا تھے[۱] اور کبھی کبھی اپنے ہی کیمپ (علی گڑھ) سے بعض نوجوانوں کی طرف سے اس آرگنائیزیشن کی مخالفت بھی ہوتی تھی۔ لیکن قومی کام کی دھن اور آرگنایزیشن کی تکمیل کی ضرورت نے ان کو دورے کرنے پر مجبور کر دیا تھا کہ ماہ رمضان المبارک میں جب کہ نواب صاحب جیسی عمر اور صوم وصلوٰۃ کے پابند آدمی کو سفر میں انتہائی تکلیفیں ہوتی ہیں انھوں نے دورہ کا سلسلہ جاری رکھا بالآخر پانچ سال کی کوشش میں پوری کامیابی ہوئی اور اُنھوں نے یہ کام مکمل کرلیا۔

ان ہی کوششوں کے دوران میں گورنمنٹ کی جانب سے قانونی کونسلوں میں اصلاحات کی تجویز یا رِفارم کی پہلی قسط عطا کرنے کا اعلان شائع ہوا اور نواب محسن الملک نے موقع سے فائدہ اُٹھانے اور مسلمانوں کے سیاسی حقوق کے متعلق

---

[۱] ملاحظہ ہو مکاتیب۔

گورنمنٹ کے سامنے ایک ڈپوٹیشن کے ذریعہ سے میموریل پیش کرنے کی تجویز کی تو نواب وقار الملک نے بڑے جوش سے تائید کی اور پوری سرگرمی کے ساتھ کام شروع کر دیا۔ متعدد جلسہ ہائے مشاورت بھی منعقد کئے اور خود بھی وضاحت کے ساتھ مسلمانوں کی قومی ضروریات و حالات کی یادداشتیں قلم بند کرکے بھیجیں اور جب تمام مراحل و مراتب طے کرنے کے بعد اکتوبر ۱۹۰۶ء میں ڈپوٹیشن پیش ہو گیا جس میں وہ خود بھی شریک ہوئے تو اس کے بعد ۳۰ دسمبر کو ڈھاکہ میں مسلمانانِ ہند کی ایک پبلک میٹنگ منعقد کرائی اور چونکہ نواب صاحب اس سیاسی مجلس کے بانی تھے۔ نوجوانان قوم کے اصرار سے ان کو ہی پہلے اجلاس کی صدارت قبول کرنی پڑی۔

خطبۂ صدارت میں انہوں نے قومی پولٹیکل پالسی کے متعلق اپنی جو رائے ظاہر کی وہ ہی مسلمانوں میں سیاسی تحریک کی بنیاد قرار پائی۔ انہوں نے سرسید کی پالسی، پولٹیکل آرگنائزیشن کی ضرورت اور ڈپوٹیشن کا تذکرہ کرکے کہا کہ :-

> اور اب قبل اس کے کہ اس مسئلہ کے متعلق میں کسی عملی کارروائی کا ذکر کروں یہ کہنا ضروری جانتا ہوں کہ برٹش گورنمنٹ کے عام اصول سلطنت چاہے کچھ ہوں اور برٹش نیشن کی لبرٹی اور انصاف پسندی چاہے رعایا کو کیسی ہی حقوق کا مستحق بناتی ہو لیکن ہم لوگوں کو جو اپنی تاریخی روایتوں کو ابھی بھولے نہیں ہیں اور سلطنت و رعایا کے باہمی تعلقات سے بخوبی واقف ہیں۔ بطور ایک اصول کے یہ بخوبی سمجھ لینا چاہئیے کہ رعایا کے پولٹیکل حقوق کا پودہ صرف وفاداری کی سرزمین میں نشوونما پا سکتا ہے۔ لہذا مسلمانوں کو قبل اس کے کہ وہ اپنے کسی حق کا مطالبہ گورنمنٹ سے کریں اپنی گورنمنٹ کا سچا وفادار[۵۱] گروہ

---

[۵۱] ابھی تک کانگریس میں بھی وفاداری کے رزولیوشن پاس ہوتے تھے۔

شاہت کرنا چاہیئے۔

مسلمان ہندوستان میں اپنی دوسری ہمسایہ قوموں سے ایک خمس کے قریب ہیں اور اس لئے یہ ایک بہت صاف مضمون ہے کہ اگر خدانخواستہ کسی وقت برٹش حکومت ہندوستان میں قائم نہ رہے تو اس وقت وہی قوم ملک پر حکمراں ہوگی جو تعداد میں ہم سے چار حصہ زیادہ ہے اور اب صاحبو ہر ایک شخص کو چاہیئے کہ اپنے دل میں اس بات پر غور کرے کہ اُس وقت ہماری حالت کیا ہو جاوے گی۔ اُس وقت ہماری حالت یہ ہوگی کہ ہماری جان ہمارا مال ہماری آبرو ہمارا مذہب سب خطرہ میں ہوگا۔ آج جب کہ برٹش کی زبردست سلطنت اپنی رعایا کی محافظ ہے جس قسم کی مشکلات[۱] بسا اوقات ہم کو اپنے ہمسایہ دوستوں سے

---

[۱] لارڈ منٹو کی پہلی ریفارم یا سیلف گورنمنٹ سے مسلمانوں کو مستفید ہونے میں رکاوٹ کی انتہائی کوشش تھی مہاراشٹر میں انجمن مخالفین ذبیحہ گاؤ قائم ہو چکی تھی جس کے روح رواں مسٹر تلک تھے بنگال کا ایجی ٹیشن حکومت ہی کے خلاف نہ تھا بلکہ اُس کا غصہ اور نزلہ مسلمانوں پر تھا اور کانگریس اس ایجی ٹیشن کی زبردست موید تھی غرض ایک کھلا ہوا چیلنج مسلمانوں کو دیدیا گیا تھا۔

یہاں یہ واقعہ پیش نظر رکھنا چاہیئے کہ سرسید نے ۱۸۸۷ء میں جو تقریریں کی تھیں ان کا مدعا صرف اپنی قوم کو کانگریس سے علیحدہ رکھنا مقصود تھا انہوں نے کوئی اینٹی کانگرس (کانگرس کی مخالف) ایسوسی ایشن قائم نہیں کی اور نہ کوئی مخالفانہ سیاسی سرگرمی ظاہر کی لیکن کانگریسی لیڈر ہر جگہ مسلمانوں کے نقصان کے کاموں میں سرگرم تھے۔ اس لئے یہ ترددات پیدا ہو گئے تھے اور آج تک بھی ان ترددات کا وجود وہم پر نہیں بلکہ واقعات پر اور اُس ذہنیت پر ہے جو ہندو لیڈر (بقیہ برصفحہ آئندہ

پیش آتی رہتی ہیں اس کی نظائر کم و بیش ہر صوبہ میں موجود ہیں تو وائے
اس وقت پر جب کہ ہم کو ان لوگوں کا محکوم ہو کر رہنا پڑے جو اورنگ زیب کا
بدلا صدہا برس بعد آج ہم سے لینا چاہتے ہوں اور اس خطرہ سے بچنے
کے واسطے جب کہ خدانخواستہ وہ کسی وقت پیش آجاوے دوسرا اور
کوئی راستہ مسلمانوں کے پاس اس کے سوا نہ ہوگا کہ برٹش جھنڈے
کے نیچے اور اس کی حفاظت میں اپنے مالوں اور جانوں کو وقف
کر دیں اور ہمارا ایسا کرنا کچھ برٹش لوگوں کے واسطے نہ ہوگا بلکہ خود
اپنی جان و مال و آبرو اور مذہب کی حفاظت کی غرض سے ہم کو
ایسا کرنا ناگزیر ہوگا لہذا جس وفاداری کا اظہار ہماری طرف سے
اپنی گورنمنٹ کی نسبت اس وقت کیا جا رہا ہے اس کی یہ بہترین
ضمانت ہے کہ ہمارا خود نفع اسی میں ہے، میں آخیر شخص ہوں گا
اگر اپنے ہمسایوں کی نیت کی نسبت بدگمانی کروں ۔ لیکن با ایں ہمہ
اس واقعی امر کے کہنے میں مطلق و پس و پیش کرنا نہیں چاہتا کہ اگر کانگریس کے
لیڈروں نے اس دشمنی اور عداوت کی جوش کو غور کرنے میں آئندہ توجہ نہ کی جو ان کے
گروہوں میں اب روز بروز انگریزی حکومت اور انگریزی قوم کی بخلاف ترقی پکڑ
تو یقینی امر سمجھنا چاہئے کہ یہ جو کچھ اب آج کل ہو رہا ہے اس سے رعایا کے بڑے گروہ کے
دلوں میں بغاوت کا بیج بویا جا رہا ہے اور مسلمانوں کو برٹش فوج کے ساتھ اس بغاوت کو

(بقیہ نوٹ صفحہ ۱۶۹) وقتاً فوقتاً ظاہر کرتے رہتے ہیں جس کے باعث سر عبدالرحیم صدر اسمبلی
اور مسٹر محمد علی جینا جیسے آزاد سیاسئین تک مطمئن نہیں، اور اپنی قومی تنظیم اور قومیت حقوق
کے تحفظ کو اہم سمجھتے ہیں اور مسٹر جینا کے چودہ نکات کانگریس کی اُسی پالسی کا نتیجہ ہیں جس نے
اس صدی کے آغاز میں ان دور اندیش مسلمانوں کو متردد بنا دیا تھا۔

فرد کرنے کا نہایت ضروری فرض ایک نہ ایک دن ادا کرنا پڑے گا۔
البتہ ہمارا یہ فرض بھی ضروری ہے کہ جہاں تک ہمارا انفلوئنس
کام دے وہاں تک ہم اپنے دوستوں کو غلط راستے پر جانے سے روکیں
اور بحیثیت ان کے ہمسایہ ہونے کے ، ان کے ساتھ حسن اخلاق سے
پیش آویں اور اپنے حقوق و مقاصد کو ملحوظ رکھ کر سوشل طور پر اُن کے
ساتھ اپنی ہمدردی کو قایم رکھیں اور کسی معاندانہ برتاؤ سے ان کے
ساتھ اجتناب کریں ۔ نیز یہ بھی سمجھ لینا چاہئے کہ ہم کو کانگریس اور اہل
کانگریس کے ساتھ کوئی دشمنی نہیں ہے نہ ان کی جملہ کارروائیوں سے ہم کو
اختلاف ہے ہم اُن کی اس جدوجہد کے درحقیقت مشکور بھی ہیں جن سے
ملک کو بعض وہ منافع پہونچے ہیں جن میں ہم برابر کے شریک ہیں اور ممکن ہے آئندہ
بھی ہم کانگریس کی کارروائی کے کسی حصہ کو واجبی سمجھیں ہم کو جو کچھ کانگریس سے
اب اختلاف ہے یا آیندہ اختلاف ہوگا وہ تین قسم کے امور ہیں :۔
اول ۔ ان کے وہ مطالبات جن سے ہندوستان میں انگریزی سلطنت
کو خطرہ ہو۔
دوم ۔ وہ امور جن سے ہمارے واجبی حقوق معرض تلف میں ہوں۔
سوم ۔ ان کی سخت کلامی جو رعایا کی طرف سے سلطنت کی نسبت
مسلمان کبھی پسند نہ کریں گے ۔ اور میں بہت زور کے ساتھ آپ صاحبوں
سے ضرور یہ عرض کروں گا کہ ہم کو اپنی پولیٹیکل ایسوسی ایشن کی کارروائی
میں اعتدال اور ادب کو ہمیشہ اپنا شعار رکھنا چاہئے ۔"
اس کے بعد متعدد تجاویز[1] پاس ہوئیں مسلم لیگ قائم ہوگئی اور نواب وقار الملک

---

[1] اس اجلاس اولین کی پہلی رپورٹ گرین بک (Green Book) کے نام سے
مولانا محمد علی مرحوم نے مرتب کی تھی جو بہ کثرت شائع کی گئی۔

اس کے سکریٹری منتخب کئے گئے۔

ایم اے او کالج میں پالیٹکس پر تقریر

مارچ ۱۹۰۸ء میں انہوں نے علی گڑھ میں مسلمانانِ ہند کے پالیٹکس پر ایک جامع اور بلیغ تقریر کی کالج کی تاریخ میں یہ پہلا موقع تھا کہ نوجوانوں کے سامنے پلیٹ فارم پر سیاسی خیالات پیش کئے گئے انہوں نے پہلے موجودہ پالیٹکس کی مختصر تعریف کر کے سلطنت برطانیہ کی وفاداری اپنی قومیت قومی زندگی و وجود کے تحفظ اور اپنی اقلیت وغیرہ پر توجہ دلائی اور اس خطرہ کی طرف اشارہ کیا کہ :-

"اب اگر کسی وقت ہندوستان میں خدانخواستہ انگریزی حکومت نہ رہے تو غور کرو کہ مسلمانوں کی حالت ہندوستان میں کیا ہو جائے گی۔ یقیناً ہم کو اس ملک میں جہاں کچھ عرصہ پیشتر فرماں روائی کر چکے تھے، ہندوؤں کا محکوم ہو کر رہنا پڑے گا اور اب خیال کرو کہ اس وقت ہماری کیا حالت ہو جائے گی، اس وقت ہماری جان ہمارا مال، ہماری آبرو، ہمارا مذہب سب خطرہ کی حالت میں ہوگا............

...... میرے عزیز نوجوانو! تم کو معلوم ہوگا کہ ابھی ابھی آنریبل مسٹر گوکھلے نے تمام ہندوستان میں ہندوؤں اور مسلمانوں کے اتفاق اور اتحاد پر لکچر دینے کے لئے دورہ کیا ہے ایک لکچر میں انہوں نے مسلمانوں کے اس خیال کا ذکر کیا تھا کہ چونکہ مسلمانوں کا گروہ تعداد میں ہندوؤں سے کم ہے، لہٰذا اُن کو خوف ہے کہ کہیں ایسا نہ ہو کہ ہم انگریزوں کی حکومت سے نکل کر ہندوؤں کی حکومت میں آجائیں، اُنہوں نے اپنے سامعین سے یہ بھی فرمایا کہ یہ خیال ایسا نہیں ہے جس کو مذاق میں اڑا دیا جائے اس کے بعد آنریبل مسٹر گوکھلے نے سامعین سے خطاب کر کے فرمایا کہ :-

جو حالت بلحاظ مردم شماری وغیرہ اُس وقت مسلمانوں کی ہے اگر یہی
حالت اتفاق سے ہندوؤں کی ہوتی تو کیا عجب ہے کہ یہی اعتراض
ہمارے دلوں میں خطور کرتا اور ہم بھی اسی خیال کو پیش نظر رکھتے اور
اسی پالسی پر عمل کرنے کو تیار ہوتے جس پر کہ اس وقت مسلمان عمل
کر رہے ہیں۔"

پھر اُس وقت تک مسلمانوں کی سیاسی مجلس کے نہ ہونے کے باعث جو
نقصانات ہوئے ان کو بیان کیا اور مسلم لیگ پر اطمینان ظاہر کرتے ہوئے قومی
پالیسی کی تشریح کی کہ مسلمانوں کی تمام ترقیوں اور کامیابیوں کا مدار ہے کہ برٹش
گورنمنٹ کے ساتھ ان کا دوستانہ تعلق ہو اور تاج برطانیہ کی حمایت میں اپنی جانیں
قربان کرنے اور اپنا خون بہانے کے لئے تیار رہیں۔"

اس کے بعد کہا کہ :-

"میرے عزیز نوجوانو! شاید کسی کے دل میں یہ غلط خیال پیدا ہو کہ
اس طرح ہم گویا نیشنل کانگریس کے حریف ہوں گے اور کانگریسی خیال
والوں کے ساتھ دشمنی اور مخالفت کا اظہار کریں گے۔ حاشا و کلا۔ ہم
مسلمان کانگریس کے دشمن نہیں ہیں۔ گو اہل کانگریس کے ساتھ ہم کو رائے کا
اختلاف ہو، مگر مخالفت ہرگز نہیں ہے۔ ہم تو صرف یہ چاہتے ہیں کہ اپنی
قوم کو اس نقصان سے محفوظ رکھیں جس کا ان کو اندیشہ ہے اور ان کے خاص
حقوق کو تلف نہ ہونے دیں اور ان کی خصوصیات کو ملیامیٹ ہونے سے
بچائیں اور ان کی مستقل اور بالذات ہستی کو معدوم نہ ہونے دیں۔ ہم اقرار
کرتے ہیں کہ کانگریس نے ہندوستان کی بہتری کے لئے بہتیری عمدہ
کوششیں کی ہیں اور ان کوششوں کی کامیابی سے ہندو اور مسلمانوں نے

یکساں فائدہ اٹھایا ہے۔ ۔
ایسی کوششوں میں کوئی وجہ نہیں ہے کہ ہم ان کی مخالفت کریں اور
کوئی وجہ نہیں ہے کہ ہم ان کے احسان مند اور شکر گذار نہ ہوں ۔ ۔

۔ ۔

جہاں تک میں نے غور کیا ہے مجھے معلوم ہوتا ہے کہ کانگریس کو جو کام زمانۂ
آیندہ میں انجام دینا ہے اُس کا منصوبہ قایم کر لیا ہے اور اس کا ایک مکمل
خاکہ وہ پہلے سے تیار کر چکے ہیں اب وہ رفتہ رفتہ اُسی منصوبہ کے مطابق
اپنا کام کر رہے ہیں اور اسی خاکہ کے موافق اپنی عمارت بنا رہے ہیں۔
وہ چاہتے ہیں کہ ان کی پولیٹیکل قوت روز بروز مستحکم اور مضبوط ہو۔ ان کی
تمنا ہے کہ باضابطہ ایجی ٹیشن کے ذریعہ سے ریپریزینٹیٹو گورنمنٹ حاصل
کریں ۔ میونسپل کمیٹیوں سے لے کر ویسرائے کی کونسل تک اُنھوں
نے یہ نظام قائم کر لیا ہے اسی طرح وہ ریپریزینٹیٹو گورنمنٹ حاصل کرنا
چاہتے ہیں۔ جس میں باشندگان ہندوستان کی عام آزادانہ رائے
اور مجارٹی سے ممبر منتخب کیے جائیں اور تمام قوانین ان ممبروں کی
کثرت رائے سے بنائے جائیں اور تمام انتظامات مجارٹی کے ہاتھ میں
آجائیں اس رائے کے محرک اور اس خیال کے علم بردار ہم مسلمانوں
سے کہتے ہیں کہ ہمارا یہ منصوبہ تمام ہندوستان کے حق میں مفید ہے۔
اور تمام اہل ہند کی بہتری ہمارا منتہائے خیال ہے ہم کسی خاص قوم
فائدہ کے لئے کوئی تحریک نہیں کرتے اور کسی خاص گروہ کی حمایت میں
اپنی آواز بلند نہیں کرتے پھر کوئی وجہ نہیں ہے کہ مسلمان ہماری نیک
دلی اور عام ہمدردی کی پالسی میں شریک نہ ہوں اور اپنی آواز

ہماری آواز کے ساتھ ملاکراس کو قوت نہ پہونچائیں اور ہماری رائے کی تائید اپنی رائے سے نہ کریں"۔ مگر اے نوجوان دوستو! یہ سراسر مغالطہ ہے اور ہماری قوم کے لئے ایک تباہ کن پالسی ہے اور مجھکو اپنی قوم کے سود بہبود کے لحاظ سے اس امر کے ظاہر کرنے میں ذرا بھی تامل نہیں کرنا چاہئے کہ اگر ہم اس مغالطہ کو نہ سمجھیں اور اس دہوکے کی ٹٹی کو اپنی آنکھوں کے سامنے سے ہٹنے دیں اور اس تحریک میں شریک ہوجائیں اور اس رائے پر عمل کریں تو ہماری قوم زمانہ آیندہ میں طرح طرح کے خطرات میں گھر جائیگی اور اس کی قومی ہستی ملیامیٹ ہوجائے گی اور اس کی خصوصیات قایم نہیں رہیں گی اور وہ اپنے تمام مقاصد اور فوائد کھو بیٹھے گی نوجوان دوستو ہماری اور ان کی حالت اس وقت بالکل ڈھلواں سطح کی ہے جس کے بالائی حصہ میں مسلمانوں کو جگہ ملی ہے جب اس پر پانی برستا ہے تو سارا پانی بہہ کر نیچے جاتا ہے اور اوپر کچھ نہیں رہتا۔ اسی طرح گورنمنٹ جو حقوق رعایا کو بخشتی ہے اس میں چونکہ کوئی حفاظت مسلمانوں کی نہیں ہوتی لہذا وہ بھی ہمارے دوسرے ابنائے وطن کے حصہ میں چلے جاتے ہیں اور ہم دیکھتے کے دیکھتے رہ جاتے ہیں۔ اسی طرح اگر اس ملک میں سیلف گورنمنٹ قایم ہوا اور اس کے ممبر باشندگان ہندوستان کی کثرت رائے سے منتخب ہوں اور مسلمانوں کے حقوق کی حفاظت گورنمنٹ کے قوانین کے ذریعہ سے نہ ہو اور مجارٹی کے منتخب شدہ ممبر ملک کے انتظام کے لئے قوانین بنایا کریں تو اس کا نتیجہ یہ ہوگا کہ وہ تمام فوائد جو عام انتخابی اصول کی حکومت سے حاصل ہوں گے ان کے مالک صرف وہی لوگ ہوں گے جن کی مجارٹی ہوگی اور جس گروہ کی تعداد قلیل ہے اُس کے خاص حقوق تلیاٹ

ہو جائیں گے اور اُس کے خاص فوائد پر پانی پھر جائے گا۔ مجارٹی کی قوت زبردست اور غالب ہو گی۔ منارٹی مغلوب اور کمزور ہو جائے گی۔ مجارٹی حاکم اور منارٹی محکوم ہو گی۔ مجارٹی کی طاقت اور جبروت کا اثر تمام صیغوں اور محکموں پر عالمگیر ہو گا اور اُس وقت کوئی چارہ اُس کے سوا نہیں ہو گا کہ منارٹی اپنے وجود کو معدوم سمجھے اور اپنے حقوق کے ضائع ہونے پر صبر کرے۔ یہی وجہ تھی کہ مسلمانوں کا جو ڈپوٹیشن شملہ پر حضور ویسرائے کی خدمت میں حاضر ہوا تھا اُس نے یہ خیال ظاہر کیا تھا کہ ہندوستان کے لئے ریپریزینٹیٹو گورنمنٹ کی ایک نئی بات ہو گی اور ہندوستان کی حالت ایسی گورنمنٹ قبول کرنے کے لئے موزوں نہیں ہے اور اگر گورنمنٹ کو یہ امر مدنظر ہو کہ اس مُلک میں ریپریزینٹیٹو سسٹم قائم کیا جائے، تو مسلمانوں کے خاص حقوق کا لحاظ رکھا جائے جن کی تعداد اس مُلک میں گو کم ہو مگر پولیٹیکل اہمیت کے لحاظ سے وہ ایک جداگانہ قوم ہونے کی مدعی ہیں اور بلا لحاظ مجارٹی و منارٹی اس کے حقوق کی حفاظت ہونی چاہئے ہمارا حق ہم کو دیا جائے اور ان کا حق ان کو عطا فرمایا جائے پوری احتیاط کی جائے کہ دونوں قوموں میں سے جو برٹش گورنمنٹ آف انڈیا کے وجود کے ضروری عنصر ہیں کسی قوم کو نقصان نہ پہنچے اور کسی گروہ کے خاص حقوق ضائع اور تلف نہ ہو پائیں ......

....

آج جب کہ انگریزی حکومت کا زبردست ہاتھ اپنی مختلف رعایا کے حقوق کی یکساں حفاظت کر رہا ہے، جو حالت ہماری ہو رہی ہے وہ ظاہر ہے کہیں ہمارے ساتھ ممبریوں کا جھگڑا ہے۔ کہیں گاؤکشی

کا قصہ ہے۔ کسی طرح ہم کو چین ہی نہیں ملتا تو خدانخواستہ اگر کسی دن ہم
اپنے ابنائے وطن کے محکوم ہو جائیں تو اس وقت جو کچھ ہماری حالت
ہو سکتی ہے وہ محتاج بیان نہیں ہے"۔

اسی طرح مسلمانوں کی موجودہ حالت اور اکثریت و اقلیت کے
توازن و تقابل پر اظہار خیال کر کے قومی پالیسی پر کاربند
رہنے کی ہدایت کی۔

دیگر مصروفیتیں نومبر میں شملہ ڈپوٹیشن کے میموریل، ویسرائے کے جواب اور لوکل گورنمنٹوں کے
نام گورنمنٹ آف انڈیا کے مراسلہ کو شائع کرایا تاکہ اہل الرائے غور کر سکیں کہ مسلمانوں
کے حقوق کی بہترین حفاظت کے خیال سے کس کس امر کی گورنمنٹ سے استدعا کرنا چاہیئے۔

دسمبر ۱۹۰۷ء میں بمقام کراچی مسلم لیگ کا دوسرا اجلاس منعقد ہوا اور لیگ کا
کانسٹی ٹیوشن بھی مکمل ہو گیا۔

اسکیم اصلاحات پر مسلم لیگ کی طرف سے غور کرنے کیلئے جو جلسے منعقد ہوئے اس
کے مباحث میں پورا حصہ لیا اور آخری وقطعی تجویز ان کے اور میجر ڈاکٹر سید حسن بلگرامی
کے دستخطوں سے گورنمنٹ میں بھیجی گئی۔ البتہ نواب صاحب نے گورنمنٹ کی ایڈوائزری
کونسل میں والیانِ ملک کے ممبر بنائے جانے سے اختلاف کیا جس کہ کونسل میں
دوسرے لوگ بھی اپنی قابلیت و تجربہ کی بنیاد پر ممبر بنائے جانے تجویز ہوئے
تھے کیوں کہ یہ کسی طرح مناسب نہ تھا کہ والیانِ ملک قانون پیشہ اور اسی درجہ
کے دوسرے ممبروں کے ساتھ یکساں حیثیت سے مباحثات میں شریک ہوں
جس سے اُن کا درجہ اُن کی رعایا کی نظروں میں گھٹ جاتا۔

انہوں نے اس رائے کو اپنی طرف سے علاحدہ لکھ کر گورنمنٹ میں بھیجا۔

لہ آخری صورت میں منٹو مارلے ریفارم اسکیم سے یہ کونسل قطعاً خارج کردی گئی۔

باب ہشتم

کالج کے متعلق مہمات امور سکریٹری شپ

سرسید کے بعد جب قرعۂ فال نواب محسن الملک کے نام نکلا تو انہوں نے اپنے زبردست تدبر اپنی جودت طبع اور پوری قوت ارادی کو کالج کی مالی حالت کے استحکام اور اُس کی وسعت و شہرت پر مبذول کر دیا۔ نواب وقار الملک ہر نازک موقع پر اپنے رفیق کی اعانت و حمایت کرتے رہتے تھے سر انٹونی میکڈانلڈ کے سرکلر اجراے ہندی سے جو ناگوار صورت پیدا ہو گئی تھی اور جو احتجاجی کارروائیاں ہو رہی تھیں اُن میں جب نواب محسن الملک کو سکرٹری کالج ہونے کے باعث شرکت کی ممانعت کی گئی جس کی بنا پر اُنہوں نے سکریٹری شپ سے استعفا دیدیا تو نواب وقار الملک نے اس کی واپسی پر سخت اصرار کیا اور ہر طرح معین و مددگار رہے ہنوز یہ کشمکش جاری تھی کہ سر جیمس لاٹوش کے ہاتوں میں عنانِ اقتدار آئی تو اُنہوں نے اولین موقع پر پرائیویٹ ملاقات کر کے صورت حالات بیان کی اور نواب محسن الملک کے سکرٹری رہنے کی ضرورت پر زور دیا۔

سر جیمس[۵۱] نہ صرف پالسی میں اپنے پیش رو سے اختلاف رکھتے تھے بلکہ مزاج کا بھی بڑا فرق تھا انہوں نے اس قسم کی پابندی مناسب نہیں سمجھی اور آنریری سکریٹری کو اپنی ذاتی رائے کے اظہار میں آزادی دیدی۔

---

[۵۱] سر جیمس لاٹوش نے ایم اے او کالج کے نہایت نازک حالات میں اور اس کی ترقی و استحکام جو مخلصانہ ہمدردیاں کی ہیں وہ اس ارادہ کی تاریخ میں ہمیشہ یادگار رہیں گی۔

اس کشمکش کے ختم ہوتے ہی ایک اندرونی کشمکش پیدا ہوگئی جو نہایت سخت تھی مسٹر ماریسن پرنسپل اپنی مدت معاہدہ ختم ہونے پر انگلستان جانے والے تھے لیکن ان کی خواہش و کوشش یہ تھی کہ مسٹر کارنا پروفیسر کو اپنے سامنے ہی اپنا جانشین منتخب کرا دیں مگر طلبا کے ساتھ ان کے بُرے برتاؤ کی متعدد شکایتیں تھیں نواب محسن الملک ان کے موید تھے اور ان شکایتوں کو مبالغہ آمیز تصوّر کرتے تھے لیکن عام رائے میں مسٹر کارنا ان صفات سے معرّا تھے جو اس قومی کالج کے پرنسپل کے لئے ضروری ہیں جس کی وجہ سے باخبر حلقوں میں اس انتخاب کو اندیشناک سمجھا جاتا تھا نواب وقار الملک کو بھی اس انتخاب سے اختلاف تھا اور وہ چاہتے تھے کہ ان شکایتوں کی تحقیقات کی جائے مگر اس سے پہلو تہی کی جاتی تھی ہنوز یہ مسئلہ ٹرسٹیز کمیٹی میں پیش نہ ہوا تھا کہ مسٹر ماریسن نے ٹرسٹیوں کو مرعوب و متاثر کرنے کے لئے ایک گشتی خط ان کے نام شائع کیا اور بعض واقعات بیان کرکے اپنے دلائل و براہین کے ساتھ مسٹر کارنا کے انتخاب پر زور دیا۔

مسٹر ماریسن کو اپنی خدمات جلیلہ اور اُن سے زیادہ حکومت کی جو تائید حاصل تھی اس سے ایک خاص اقتدار حاصل ہو گیا تھا اور ان کی رائے اکثر و بیشتر بہر صورت غالب رہتی تھی یہ موقع بہت نازک تھا نواب وقار الملک نے اس سرکلر لیٹر کے جواب میں اپنا خط شائع کیا اور مسٹر ماریسن کے دلائل اور مبینہ واقعات پر سخت تنقید کرکے مسٹر کارنا کے انتخاب کی مخالفت کی اور ٹرسٹیوں کی مجارٹی کو متفق الرائے بنا کر اس تجویز کو مسترد کرایا جس کے نتیجہ میں مسٹر آرچبولڈ انگلستان میں منتخب کئے گئے۔

بلاشبہہ ایم اے او کالج میں یورپین اسٹاف کی وہی حالت تھی جو کسی ہندوستانی ریاست میں ان یوروپین افسروں کی ہوتی ہے جن کی خدمات کو

اصلاحات کے لئے حکومت اعلیٰ ریاست کے سپرد کرتی ہے کہنے کو تو یہ عہدہ دار رولنگ چیف کے ملازم ہوتے ہیں لیکن درحقیقت وہ آقائی کرتے ہیں۔

نواب محسن الملک نے جس وقت سکرٹری شپ کا جائزہ لیا ہے تو یورپین اسٹاف ہر جزو کل پر حاوی تھا اور اگرچہ مسٹر بیک کا چند ہی ماہ بعد انتقال ہو گیا مگر ان کے جانشین مسٹر ماریسن جو دس سال سے کالج میں پروفیسر کی حیثیت سے تھے اور جن میں ایک بڑے مدبر کے کامل اوصاف موجود تھے ان کو پرنسپل ہوتے ہی اقتدار کُلّی حاصل کرنے میں کوئی دشواری نہ ہوئی اور انہوں نے اپنے پیش رو کے اقتدار کو زیادہ قوت مگر حکمت عملی کے ساتھ نہ صرف برقرار رکھا بلکہ اس میں اضافہ کیا۔ دوسری طرف کالج کے عام حالات بھی ان کے مُساعد تھے اور حکومت میں بھی ان کا خاصہ اثر تھا، مگر یہ حقیقت بھی ناقابل انکار ہے کہ یورپین اسٹاف کے اثر و نفوذ سے جہاں گوناگون فوائد تھے وہاں مطلق العنانی کے ساتھ اختیارات اور قومیت کے تباین سے اندر ہی اندر خرابیاں بھی پیدا ہو رہی تھیں، نواب محسن الملک گرچہ کانفرنس اور سرسید میموریل فنڈ وغیرہ کے متعلق انتہائی کامیاب تھے لیکن کالج کے اندرونی انتظامات کی اصلاح میں حسب دلخواہ کامیاب نہ ہو سکے تھے اس لئے انھوں نے یہ تجویز کی کہ نواب وقار الملک کالج کا کام کریں اور وہ کانفرنس اور سرسید میموریل کا کام کرتے رہیں۔ چنانچہ باہمی گفتگو اور رضامندی کے بعد یہ تجویز اجنڈا میں درج ہوئی اور نواب محسن الملک نے سکرٹری شپ سے استعفا دیدیا اجلاس میں جب یہ مسئلہ پیش ہوا تو ایک دو کے سوا باقی تمام ٹرسٹیان موجودہ اور غیر موجودہ نے رائے دی کہ نواب محسن الملک کا استعفا منظور ہونے کے بعد نواب وقار الملک کا تقرر عمل میں آئے مگر خود انہوں نے کہا کہ پبلک عام طور پر نواب صاحب ممدوح کے کالج سے علیحدہ ہونے کو پسند نہیں کرتی لہذا

ٹرسٹیوں کو بھی جو پبلک کے نمایندے ہیں وہی پہلو اختیار کرنا مناسب ہے جو پبلک کی مرضی کے مطابق ہے ٹرسٹیوں نے بھی نواب محسن الملک کی خدمات کا اعتراف کیا اور نتیجہ میں ان کا استعفا واپس ہوگیا۔

اس میں شک نہیں کہ اصلاحات کے لئے یہ انتظام مفید ہوتا اور قرینِ صواب بھی تھا لیکن جو فضا کہ قائم تھی اور وقار الملک کی نسبت جو سوءظنی اسٹاف میں پہلے سے موجود تھی اس کے لحاظ سے خطرات بھی تھے نواب محسن الملک حکومت میں جو مالی وسیاسی فوائد حاصل کرنے کی کوشش کر رہے تھے جس میں یورپین اسٹاف کی معاونت بھی کچھ اہم نہ تھی ان میں رکاوٹ پیدا ہو جاتی اور اس سے انکار نہیں ہو سکتا کہ ہز رائل ہائینس پرنس آف ویلز اور امیر افغانستان کی تشریف آوری اور شملہ ڈپوٹیشن وغیرہ کے متعلق انھوں نے یورپین اسٹاف سے کافی مدد حاصل کی اس لئے سے آخر وقت میں ان کو استعفا واپس لینے میں ہی مصلحت نظر آئی۔

کالج میں طلبا کی اسٹرایک[1] اور تحقیقاتی کمیشن کی ممبری

واقعات اپنی عام رفتار پر تھے مسٹر آرچبولڈ کو پرنسپلی کا جائزہ لئے ہوئے تھوڑا عرصہ گذرا تھا ان میں ایک پروفیسر کی پوری شان تھی لیکن وہ اپنے ماتحتوں کے اثر میں تھے اُن کو اسٹاف کے رویہ اور برتاؤ سے طلبا میں جو ناراضی تھی اس کو دور کرنے کی مطلق پروا نہ تھی بلکہ ڈسپلن کے پردہ میں سختی جاری تھی اور اس کے نتیجہ میں ناراضی کا برابر اضافہ تھا۔

اولڈ بوائز میں ایک جماعت تھی جو اپنے اثر و اقتدار اور یورپین اسٹاف کی پالیسوں کی متابعت وحمایت مطمحِ نظر بنائے ہوئے تھی اور ہر وقت موجود برموقع رہ کر کالج پر دوسرے درجہ کا اثر و نفوذ رکھتی تھی جس کے سامنے آنریری سکرٹری کو بھی بسا اوقات جھکنا پڑا

[1] کالج کی تاریخ کا یہ جانگداز واقعہ تذکرہ محسن میں تفصیل کے ساتھ درج ہے۔

تھا لیکن دوسری طرف ایک اور پارٹی بھی تھی جو اسٹاف کے اس اقتدار کو مبغوض نظروں سے دیکھتی تھی اور آنریری سکرٹری کی مسلّمہ عظمت کے باوجود ان سے انتہائی ناراض تھی اور اسکی طرف سی انگریزی اُردو اخباروں میں مسلسل مضامین شائع ہوتے رہتے تھے، ان دونوں پارٹیوں کی تشکیل تقریباً اولڈ بوائز سے ہی تھی جو کالج کے آئندہ محافظ اور قوم کے مایہ اُمید تھے مگر ان میں حد درجہ رقابت اور منافرت تھی اور پہلی قابو یافتہ پارٹی اس قومی ایوان میں دوسری پارٹی کی دخل کو کسی طرح پسند نہ کرتی تھی اور سختی وسرگرمی کے ساتھ مزاحم تھی، بعض ممبران اسٹاف کے برتاؤ سے طلبا کی طبائع میں سخت اشتعال تھا اور ڈسپلن میں کمزوری پیدا ہوگئی تھی آزاد خیال پارٹی کے لیڈر اُن کی حمایت میں مضامین لکھکر اخبارات میں شایع کراتے کالج کے نظام پر نکتہ چینیاں کرتے اور اس اشتعال پر تیل چھڑکتے۔

آنریری سکرٹری حکمت عملی سے کوشش کرتے کہ ان کی رائے سنی جائے مگر یورپین اسٹاف کے ساتھ کسی شدید اختلاف کے لئے تیار نہ تھے، بالآخر یہ مواد جو برسوں سے پک رہا تھا ۱۹۰۷ء میں پھوٹا اور معمولی واقعہ جس کا تعلق ڈسپلن سے تھا پرنسپل کی نامناسب سخت گیری کے ساتھ ملکر زبردست اسٹرائک کا سبب بن گیا۔

اس اسٹرائک کی تحقیقات کے لئے ٹرسٹیوں کا کمیشن مقرر ہوا نواب وقار الملک بھی اس کے ممبر تھے زبانی وتحریری شہادتیں پیش ہوئیں اور ان کی بنا پر کمیشن نے اپنی رپورٹ مرتب کی۔

ایک فریق کی طرف سے اسباب شورش میں اخبارات کے مضامین اور بالخصوص (مولانا) محمد علی مرحوم کے انگریزی مضامین کو بڑا سبب بتایا گیا۔

نواب وقار الملک نے اپنے رفقا کے ساتھ بعض امور مندرجہ رپورٹ سے اختلاف کیا اور اپنے اختلافی نوٹ میں بعض اصلاحالات پر زور دیا، یورپین اسٹاف

اور آنریری سکرٹری کے طرز عمل وطریق کار اولڈ بائز کے باہمی تنازعات اور طلبا کے ڈسپلن وغیرہ پر آزادانہ بحث کی۔

(مولانا) محمد علی کے مضامین کی نسبت انہوں نے لکھا کہ:-

مسٹر محمد علی صاحب اولڈ بوائے نے جو مضامین انگریزی اخبارات میں اس شورش سے قبل لکھے اور جن کو انھوں نے کمیشن کے سامنے اس بیان سے پیش کیا ہے کہ وہ ایک عرصہ دراز سے کالج کے ٹرسٹیوں اور اسٹاف کو موجودہ خرابیوں پر مطلع ومتنبہ کرتے چلے آتے ہیں میں ان کو اسباب شورش میں شامل کرنے سے قطعاً اجتناب کروں گا۔

مسٹر محمد علی صاحب اس کالج کے پرانے طلبا میں نہایت لایق اور نامی طالب علم ہیں انھوں نے بی اے کی ڈگری آکسفورڈ سے آنر کے ساتھ حاصل کی ہے اور ابھی کچھ عرصہ پیشتر تک یہ کوشش ہو رہی تھی کہ ان کی نہایت قیمتی خدمات کالج کے واسطے حاصل کی جائیں ان کو اپنے کالج سے ہمدردی ومحبت ہے ان کے مضامین کو اسباب شورش میں شامل کرنے کے صرف یہ معنی ہوں گے کہ ہم لوگ اپنی کسی نکتہ چینی کو ٹھنڈے دل سے سننا نہیں چاہتے یہ نکتہ چینیاں اگر غلط تھیں تو سب سے آسان طریقہ یہ تھا کہ معقول دلائل کے ساتھ اخباروں میں ان کی تردید کر دی جاتی تاکہ ناظرین اخبار کو کوئی غلط فہمی نہ ہونے پاتی اور اگر بدون اس طرف توجہ کئے ہوئے کہ وہ نکتہ چینیاں صحیح تھیں یا غلط محض اس بنیاد پر ان مضامین کو اسباب شورش میں شامل کیا جانا جائز ہو کہ طلبا کے دلوں میں ان کی وجہ سے کالج کے

انتظاموں کے متعلق نارضامندی کا پیدا ہونا ممکن تھا تو اسباب شورش میں ایک مدہم کو اس ترک فعل کے لئے اضافہ کرنی چاہیئے کہ کیوں ہم نے ان نکتہ چینیوں کی تردید مناسب وقتوں پر نہ کی۔

ڈسپلن کے متعلق انھوں نے لکھا کہ

مجھکو یہ بھی بیان کر دینا ضروری ہے کہ بہت عرصہ سے ہم سنتے چلے آئے ہیں کہ فلاں معاملے پر اس لئے زور دینا مناسب نہیں کہ کہیں یورپین اسٹاف بد دل ہو کر کالج نہ چھوڑ دے اور اب طلبا کی اس حال کی شورش سے ہمارے لئے ایک تازہ دھمکی یہ پیدا ہوئی ہے کہ کہیں طلبا اسٹرائک نہ کر دیں اس قسم کے حالات کے لحاظ سے میں صرف یہ کہہ سکتا ہوں کہ ہم کو اپنا انتظام کافی احتیاط اور غور کے ساتھ منصفانہ اور صحیح اصولوں پر قائم کرنا چاہیئے اور اس کے بعد ہم کو ڈسپلن پر مضبوطی سے قایم رہنا چاہیئے اور ہر ایک نقصان برداشت کرنے کے واسطے جو ڈسپلن قائم رکھنے کی غرض سے عاید ہو ہم کو تیار رہنا چاہیئے عام ازیں کہ طلبا کی طرف سے ایسی دھمکی ہو یا اسٹاف کی طرف سے یا ٹرسٹیز کی طرف سے۔

میں انتظام کو ضعیف اور کمزور دیکھنے کی بہ نسبت کالج اور بورڈنگ ہاؤس کے کمروں کا خالی دیکھنا اچھا سمجھتا ہوں۔

انھوں نے اخباری اعتراضات کے متعلق یہ رائے ظاہر کی تھی کہ

ہم کو اپنا انتظام درست رکھنا چاہیئے اس کے بعد کسی نکتہ چینی سے ہم کو ڈرنا نہیں چاہیئے جس کے جو جی میں آئے وہ کہے اور جس کے جو جی میں آوے لکھے۔ ہمارے لئے صرف یہ کافی ہو گا کہ اگر ہمارے

انتظام پر کوئی غلط حملہ کیا جاوے تو ہم نہایت ٹھنڈے دل سے اس
کے جواب میں اصلی واقعات کو پبلک کے سامنے ظاہر کر دیں اور فیصلہ
کو پبلک پر چھوڑ دیں۔

ہم کو اس بات کے لئے ہر وقت تیار رہنا چاہئے کہ اگر کوئی نقص
ہمارے انتظاموں میں ہے تو اس کا اعتراف کریں اور اس کی اصلاح
کریں اور اگر کسی دوسرے کی غلط فہمی ہے تو اس کو رفع کرنے کی
کوشش کریں اور یہ کسی طرح ٹھیک نہیں ہے کہ خود تو ہم کچھ نہ کریں
اور معترضین کے اعتراضات سے بُرا مانیں۔

کمیشن کے سامنے یہ سوال بھی بڑے زور دلائل کے ساتھ پیش ہوا کہ ٹرسٹیوں کے
حین حیاتی انتخاب کا قاعدہ منسوخ کیا جائے جو تمام خرابیوں کی بنیاد ہے۔ نواب
محسن الملک نے رائے دی کہ آئندہ انتخاب پنج سالہ ہوں اور نواب وقار الملک
نے مذکورۂ بالا تجویز کے لحاظ سے اپنا خیال ظاہر کیا کہ موجودہ ٹرسٹیوں کو بھی پانچ برس
کے لئے تصور کیا جائے لیکن ٹرسٹیز کمیٹی کے اجلاس نے جو کمیشن کی رپورٹ پر غور
و فیصلہ کرنے کے لئے منعقد ہوا اس مسئلہ پر کوئی رائے ظاہر نہ کی،

کمیشن کی رائے کے مطابق متعدد اصلاحات قابلِ منظوری و اجرا سمجھی گئیں مگر
پرنسپل اور اسٹاف کا اتنا وقار قائم رکھا گیا کہ بالاتفاق یک ممبر اسٹاف کو صریحاً
قصور وار تسلیم کر لینے کے باوجود بھی اس کا سارا معاملہ پرنسپل پر منحصر کر دیا گیا اور
نواب وقار الملک کی یہ رائے کہ اس کو پروفیسری کے عہدہ سے الگ کر دیا جائے
اور اضافہ روک دیا جاوے۔ مسترد کر دی گئی۔

نواب محسن الملک کا انتقال اور تحقیقات وصیت

اسٹرائک کے بعد نواب محسن الملک بہت دل شکستہ ہو گئے تھے، دائم المریض اور کمزور تو پہلے سے تھے اب مرض کا زبردست حملہ ہوا ۱۶ر اکتوبر ۱۹۰۷ء کی شام کو چند روزہ علالت کے بعد شملہ میں انتقال ہو گیا اس واقعہ کی فوراً (نواب بہادر ڈاکٹر سر) محمد مزمل اللہ خاں قائم مقام آنریری سکرٹری کو اطلاع دی گئی اور اس امر سے بھی مطلع کیا گیا کہ مرحوم کی وصیت کے مطابق لاش اٹاوہ جائے گی لیکن علی گڑھ میں ٹرسٹیوں نے ایک جلسہ کر کے متفقہ فیصلہ کیا کہ چونکہ نواب صاحب مرحوم کا وجود محض شخصی وجود نہیں بلکہ قومی وجود ہے اس لئے مدرسۃ العلوم میں سرسید کے پہلو میں اس کو دفن کیا جائے۔

شب کے دو بجے ٹرین علی گڑھ کے اسٹیشن پر پہنچی اور تابوت کی گاڑی جدا کر لی گئی مگر نواب صاحب مرحوم کے جو اعزا موجود تھے وہ وصیت کی تعمیل پر مُصر تھے اور دن کے دس بجے تک یہی حجت تھی کہ نواب وقار الملک بھی جو اُس حادثہ کی اطلاع پاتے ہی امروہہ سے روانہ ہو گئے تھے علی گڑھ اسٹیشن پر پہونچ گئے مرحوم کی بیگم صاحبہ کے تار کے مطابق انھوں نے وصیّت کی تحقیقات کی اور آخرالامر کالج میں ہی دفن کئے جانے کا فیصلہ کیا چنانچہ بعد نماز تین بجے وہ قومی وجود[۵۲] سپرد خاک کیا گیا۔

دونوں کی دوستی و تعلقات پر ایک نظر

نواب وقار الملک اور نواب مرحوم کے تعلقات پر چالیس سال کی مدت مدید گزر گئی تھی دونوں اپنی اپنی خصوصیات و صفات کے لحاظ سے نادرۂ روزگار تھے مگر قدرت نے بہت سے امور میں اختلاف مزاج و طبیعت کے باوجود اُن کو واقعات

---

۵۱ ولادت ۹ر دسمبر ۱۸۳۸ء رحلت ۱۶ر اکتوبر ۱۹۰۷ء

۵۲ افسوس ہے کہ اس وقت کے کارفرماؤں نے اس قومی وجود کو دفن کرتے وقت اس کے تمام احسانات، احترام اور اس کی عظمت کو نظرانداز کر دیا۔

زندگی کو ایسا یکساں اور مربوط کیا تھا کہ دوسری مثال ملنی مشکل ہے۔

دونوں تقریباً یکساں حالت میں محرری سے اپنی زندگی شروع کرتے ہیں ترقی کرکے ایک ڈپٹی کلکٹری پر اور دوسرا تحصیلداری پر پہنچتا ہے ایک ہی ساتھ دونوں کی قومی زندگی کی ابتدا ہوتی ہے دونوں ایک ہی مقصد کے لئے ایک ہی مرکز پر مجتمع ہوکر سرسید کے بازوے راست وچپ بن جاتے ہیں۔

دونوں ساتھ ساتھ حیدر آباد پہنچتے ہیں ملک کی اصلاحالات و انتظامات میں اپنی اپنی قابلیتوں کے جوہر نمایاں کرتے ہیں یکے بادیگرے بالادست وزیردست بھی رہتے ہیں اوران کو وہ عروج و اقتدار حاصل ہوتا ہے جو اب تک حیدر آباد میں ضرب المثل ہے۔

دونوں ایک سال کے وقفہ سے وظیفہ یاب ہوکر علی گڑھ کا رُخ کرتے اور اپنی زندگیاں قومی خدمت کے لئے وقف کر دیتے ہیں اور جس طرح دونوں کی دماغی وجسمانی قوتیں قومی ہمدردی کے کاموں میں مصروف عمل رہتی ہیں اسی طرح دونوں کی جیبیں ہر دور اور ہر حالت میں امدادوں کے لئے بھی کشادہ رہتی ہیں۔

لیکن حیدر آباد کی ملازمت اور قومی خدمت میں دونوں کا مزاج اور اصول وطریقہ کار ہمیشہ متباین رہا اور اس تباین سے بسا اوقات عوام ہی نہیں بلکہ خواص بھی دھوکہ کھا گئے کسی نے ان کو باہم رقیب جانا اور کسی نے ایک کو دوسرے کا حاسد اور زوال کا خواہشمند سمجھا۔ اکثر نے ان کے باہمی تصادم کی کوششیں کیں اور اخبارات کو آلہ کار بنایا مگر یہ سب کوششیں ہمیشہ ناکام اور غیر موثر رہیں۔

قومی کام کرنے والوں میں بھی ہیزم کش بدبختوں کی کمی نہیں ہوتی۔ چنانچہ قومی معاملات میں بھی ایسی ہی صورتیں پیش آئیں۔ انتظامی اختلافات ہوے اور اخبارات مین مضامیں بھی شائع ہوتے رہے۔ مگر ان دونوں کے دلوں

میں وہ چنگاری ہی نہ تھی جس سے شعلہ پیدا ہوتا..............

ان دونوں میں جو تعلقات تھے اور ان تعلقات میں جو محبت و احترام تھا وہ بجائے خود ایک مثال ہے اور جس کا اندازہ ان خطوط سے ہوتا ہے جو مکاتیب میں شائع ہو چکے ہیں۔

نواب وقارالملک میں جذبات کو مغلوب رکھنے کی پوری قوت تھی اعزاو احبا کے صدمات کے مواقع اور نازک اوقات پر بھی ان کے ضبط پر جذبات نے غلبہ نہیں پایا۔

اس عمر میں نواب محسن الملک کی موت بھی کچھ غیر متوقع نہ تھی لیکن جب ان کو دفن کیا ہے تو ضبط پر قابو جاتا رہا اور پھر جب ان کے تعزیتی جلسہ میں تقریر کرنے کو کھڑے ہوئے تو شدت غم سے آواز گلوگیر ہوگئی اور سب نے دیکھا کہ اس کوہ وقار شخص کی آنکھیں اُبلتا ہوا چشمہ تھیں وہ نواب محسن الملک کی خوبیوں کے بھی سب سے زیادہ قدرشناس تھے اور ان کی زندگی کو قوم کے لئے ایک قوت جانتے تھے۔ چنانچہ اس سانحہ کے پندرہ روز بعد مولوی[1] امام الدین صاحب کو ایک خانگی خط میں لکھتے ہیں کہ:-

نواب محسن الملک کے سانحے نے قوم کی کمر توڑ دی ہے اللہ تعالیٰ مرحوم کو اپنے جوار رحمت میں جگہ دے وہ اپنے بعد قوم میں کوئی

---

[1] مولوی صاحب ضلع گجرات (پنجاب) کے باشندے تھے جن کو علی گڑھ تحریک اور سرسید کے ساتھ وہ شیفتگی تھی جو عشق سے تعبیر ہو سکتی ہے۔ سرسید میموریل فنڈ اور ون روپی فنڈ میں بڑے شغف کے ساتھ کام کیا اور کبھی کسی صلہ کا خیال تک دل میں نہ لائے۔ اور ہمیشہ علی گڑھ تحریک کے زبردست مناد رہے۔

اپنی سی قابلیت کا شخص نہیں چھوڑ گئے۔ آسمان جب بہت کچھ چکر کھاتا
ہے تب کہیں اس طبیعت کے بزرگ پیدا ہوتے ہیں اور آیندہ تو اس
فیشن کے بزرگوں کا پیدا ہونا ظاہرا محال معلوم ہوتا ہے' لکچرار
ہوں گے۔ اسپیکر ہوں گے' فلاسفر ہوں گے' قوم کے ہمدرد بھی
پیدا ہوں گے' یہ سب کچھ ہوگا۔ لیکن افسوس نواب محسن الملک کی
سی خوبیوں کا بشر دیکھنے میں نہ آئے گا۔

سنہ ۱۹۱۳ء میں مؤلف کتاب ہذا نے جب نواب محسن الملک کی سوانح عمری لکھنے کے ارادہ سے اطلاع دی تو اس کے جواب میں اس قصد کو جزائے خیر کا مستحق قرار دیا اور مواد جمع کرنے میں امداد کا وعدہ کیا۔

سکرٹری شپ پر انتخاب

اسٹرائک کے بعد اکثر بہی خواہان کالج کی رائے تھی کہ علی گڑھ میں قیام کر کے اندرونی اصلاحات کا کام اپنے ہاتھ میں لیں بعض ناراض نوجوان بہت زیادہ مصر تھے کہ وہ سکرٹری شپ کے لئے آمادہ ہوں اخبارات میں مضامین اور مکالمے شائع ہوئے' نواب وقار الملک کو اگرچہ نواب محسن الملک کی بعض کارروائیوں سے اختلاف تھا اور بالخصوص اسٹاف کی مطلق العنانی کے سخت مخالف تھے اور انھوں نے ایک یادداشت میں جو ہمئی کے اجلاس ٹرسٹیان میں پیش کی تھی ان کارروائیوں پر نکتہ چینی کرتے ہوئے یہ فقرہ بھی لکھا تھا کہ

کالج کے لغت میں ڈسپلن اب صرف طلبا کے دبائے رکھنے کا
نام ہے اسٹاف ڈسپلن کے شکنجہ سے بالکل بری ہے۔

لیکن وہ ان حالات میں علی گڑھ کا قیام کسی طرح مفید تصور نہ کرتے اس کے متعلق ان کا بیان تھا کہ

میرے نزدیک میرا علی گڑھ میں جا کر رہنا گو کہ وہ آنریری سکرٹری کو مدد

دینے کی ہی غرض سے ہو بجائے مفید ہونے کے کالج کے حق میں مضر ہے
میری موجودگی علی گڑھ کے زمانہ میں میری نظر کالج کے ہر ایک کام پر
ہوگی اور جو نقصان مجکو اس میں دکھائی دیں گے ان میں مجکو ان ٹرسٹیوں
اور ممبران اسٹاف سے گفتگو کا موقع ملے گا جو علی گڑھ میں تشریف
رکھتے ہیں ممکن نہیں بلکہ یہ یقین سمجھنا چاہئے کہ ایسے معاملات بھی پیش
آئیں گے جن میں آنریری سکرٹری صاحب سے میرا شدید اختلاف ہوگا
اور جو نقصانات نظر آئیں گے ان میں بکثرت وہ امور ہوں گے. جو
آنریری سکرٹری کی بےخبری یا کمزوری کا نتیجہ ہوں گے اور اس طرح
پر ایک سلسلہ ناگوار نکتہ چینی کا قائم ہو جاے گا اور میرا گھر ایک برد ست
مورچہ آنریری سکرٹری کے خلاف سمجھا جانے لگے گا جہاں وہ تمام
لوگ جمع ہوا کریں گے جو میری راے سے متفق ہوں گے اور مجارٹی
یقیناً میری طرف ہوگی اور اس طرح پارٹی فیلنگ کا خاصہ نقشہ جم جاے گا،
جو کالج کے حق میں بے انتہا مضرت بخش ہوگا، لیکن اب نواب محسن الملک
کی وفات سے قدرتی طور پر موقع پیدا ہوگیا کہ کالج کی زمام اختیار ان ہی کے
ہاتھ میں آئے۔

اگرچہ قواعد و قوانین کالج کے لحاظ سے سکرٹری کے انتخاب میں ٹرسٹیوں کے
سوا اور کسی طبقہ یا جماعت کو کسی قسم کا حق راے دہندگی حاصل نہ تھا لیکن نواب محسن الملک
کے انتقال کے بعد ہر گوشۂ ہندوستان سے تمام مسلمانوں نے دلی جوش اور تمناؤں
کے ساتھ اس خواہش کا اظہار کیا کہ "نواب وقار الملک کو سکرٹری منتخب کیا جاے"
اسلامی پریس نے پُر زور مضامین شائع کئے کہ "اس عہدہ کے لئے ان سے زیادہ
کوئی موزوں نہیں" جابجا جلسے منعقد کئے گئے اور ٹرسٹیوں کو تاروں کے ذریعہ سے

کارروائیوں کی اطلاع دی گئی کہ :-

ان کے سوا اس جلیل القدر منصب پر کوئی اور مامور نہ کیا جائے ۔“

بقول نواب بہادر ڈاکٹر سر محمد مزمل اللہ خاں بہادر کے سی۔ ایس۔ آئی جو اس وقت قائم مقام سکرٹری تھے کہ :-

مجھ کو گزشتہ پچیس سالہ لائف میں کوئی ایسا واقعہ یاد نہیں ہے جس میں قوم کی طرف سے کسی امر پر اس قدر شد و مد اور ایسے جوش و خروش اور ایسے اتفاق کے ساتھ اظہار رائے کیا گیا ہو۔

ٹرسٹیوں کے دلوں میں بھی نواب صاحب کے اخلاق و قابلیت اور اُن کی قومی خدمات کی عزت و عظمت مرکوز تھی۔ اُنھوں نے ۱۵ر دسمبر ۱۹۰۷ء کی ایک مخصوص اجلاس میں بلا اختلاف ان کو آنریری سکریٹری کے عہدہ پر منتخب کیا۔

نواب صاحب کو اپنی عمر و صحت کے لحاظ سے اس عہدہ کو قبول کرنے میں بہت تامل تھا اور بعض دوستوں سے عذر بھی کیا لیکن شنوائی نہ ہوئی اس لئے وہ اس کو منظور کرنے پر مجبور ہو گئے اس انتخاب کے بعد ہی اُنھوں نے رفقائے کار سے امداد کی امید کا اظہار کر کے طلبا کو رقت آمیز لہجہ میں مخاطب کیا اور اعمال مذہب اور ڈسپلن پر توجہ دلاتے ہوئے کہا کہ :-

میں اس وقت صاف اور علی الاعلان کہتا ہوں کہ میں اس طرح ڈسپلن کی خلاف ورزی برداشت نہ کر سکوں گا میں مدرسۃ العلوم کے بورڈنگ ہاؤسوں کے تمام کمروں کا خالی دیکھنا بہ نسبت اس کے زیادہ پسند کروں گا کہ ان میں نافرمان اور ضابطہ کی پابندی نہ کرنے والے طلبا آباد ہوں۔

آخر دسمبر میں کانفرنس اور مسلم لیگ کے جو اجلاس منعقد ہوئے اُن میں

اور قوم کو مبارکیاں دی گئیں۔

نواب کا خطاب جائزہ لینے کے تین ماہ بعد یعنی ۲۲ اپریل ۱۹۰۸ء کو ہزاکسیلنسی لارڈ منٹو ویسرائے و گورنر جنرل جب کالج کے معائنہ کو تشریف لائے اور حسب معمول ایڈریس کے جواب میں تقریر کی تو بالکل غیر متوقع طور پر اُس میں آنریری سکرٹری کو نواب کے خطاب سے ممتاز کئے جانے کا اعلان تھا، ہزاکسیلینسی نے فرمایا کہ:-

مجھے ایک لفظ کے کہنے کی آپ اجازت دیں آپ کے سکرٹری مولوی مشتاق حسین نے نواب محسن الملک کی جگہ لی ہے میں ان کی اہم ذمہ داریوں اور ضروری کاموں کے ہجوم کو خوب جانتا ہوں۔ اس لئے مجھے یقین ہوتا ہے کہ میں ان کو نواب کا خطاب دے کر جو ان کے ممتاز پیش رو کو ایک مدید زمانہ سے حاصل تھا علی گڑھ والوں کی عام تمنا کو پورا کروں گا۔[1]

ہز آنر پیٹرن کی وزٹ محسن الملک میموریل فنڈ کا افتتاح، آنریری سکرٹری پر اظہار اعتماد فروری ۱۹۰۹ء میں ہز آنر سر جان ہیوٹ لفٹننٹ گورنر و پیٹرن کالج تشریف لائے حسب دستور ایڈریس پیش ہوا اور جواب میں کالج اور تعلیم کے بعض معاملات و نکات پر اظہار رائے کے ساتھ نواب محسن الملک کی وفات پر اظہار افسوس اور ان کی خدمات کا اعتراف کرتے ہوئے میموریل فنڈ کا افتتاح کیا اور موجودہ آنریری سکرٹری کے متعلق کہا کہ۔

---

[1] تعجب ہے کہ ہزاکسیلنسی کو اس مثال کا مغالطہ کیونکر ہوا جس طرح نواب محسن الملک کو یہ خطاب حاصل تھا اسی طرح نواب وقار الملک کو بھی۔ حیدرآباد میں ہر ایسے خطاب کے ساتھ لفظ "نواب" جزو لازم ہو جاتا ہے۔

میں ٹرسٹیوں کو اس امر پر مبارکباد دیتا ہوں کہ اس اہم عہدہ کے واسطے ان کو نواب مشتاق حسین ایک نہایت موزوں شخص دستیاب ہو گئے ہیں میرے دل پر ان کی اَن تھک کوششوں اور تدبر اور علاوہ فراست کا نقش ہے جس سے کہ وہ اپنے عہدہ کا کام سرانجام دیتے ہیں۔

.......—~~~—.........

بابِ نہم

پرنسپل اور آنریری سکرٹری کے اختیارات کا تنازعہ اور فیصلہ

یورپین اسٹاف کا رویہ

سرسید نے یورپین اسٹاف اور بالخصوص پرنسپل کو جن امیدوں کے ساتھ مقرر کیا تھا ان میں سب سے بڑی امید یہ تھی کہ ان کو بہ نسبت روپیہ کے لالچ کے مسلمانوں کی ترقی میں دلچسپی ہو، ہم سے دوستانہ یا برادرانہ برتاؤ رکھیں اور ہماری قوم کے بچوں پر پدرانہ شفقت رکھنے کے لائق ہوں ابتداءً ان کا ہندوستان میں ہی انتخاب کیا گیا جن میں مسٹر سڈنس اور مسٹر نسبٹ بہت ممتاز تھے لیکن خود سرسید اور مسٹر سڈنس میں اختلاف رائے پیدا ہوا جس کے نتیجہ میں ان کو مستعفی ہونا پڑا، اب مسٹر نسبٹ کو پرنسپل ہونا چاہئے تھا وہ نہایت قابل و مفید پروفیسر اور باوقار جنٹلمین تھے مگر طلبا سے سماجی تعلق رکھنا اور گھر پر کسی سے ملنا پسند نہ کرتے تھے اس لئے سرسید نے ان کو ترقی نہ دی اور انگلستان سے سید محمود کے مشورہ سے مسٹر بیک کو انتخاب کیا اگرچہ مسٹر بیک کم عمر اور ناتجربہ کار تھے لیکن سوشیل تعلقات کا نباہنا خوب آتا تھا اور ساتھ ہی بے انتہا اقتدار پسند تھے اُنھوں نے پرانے اسٹاف کو ایک ایک کر کے نکال دیا اور جدید تقررات کئے جن میں آنریبل سر تھیوڈر مارسین بھی تھے، سرسید نے اس جدید اسٹاف کے ساتھ حد درجہ مسامحت و رواداری برتی۔

۱۸۸۳ء میں جب کہ اسٹاف کا زیادہ تعلق درواسطہ تعلیم سے تھا اور بورڈنگ

میں محدود اختیارات تھے۔ تو اس زمانہ ایک معمولی بات پر خود سرسید کے حکم کے خلاف اسٹرائک ہوئی اور انجام کار چند طلبا کا بطور سزا اخراج کیا گیا۔ اس موقع پر مولوی سمیع اللہ خاں نے کوشش کی کہ ان طلبا کا بھی قصور معاف کر دیا جائے سرسید مائل ہوئے لیکن مسٹر بیک اور اُن کے رفقا نے متفقہ استعفے کی دھمکی دی، سرسید کو مصلحت یا مرعوبیت سے ان ہی کی مرضی کے مطابق فیصلہ کرنا پڑا اور اُس کے بعد بورڈرنگ ہاؤس بھی تمامہ پرنسپل کے قبضہ اقتدار میں آگیا۔ پھر جدید قانون ٹرسٹیان نے قانونی طور پر پرنسپل کو اہم اختیارات دیدئے اور جو کچھ کمی تھی اس کو پٹیرن کے اختیارات مشورہ و دست اندازی نے پورا کر دیا، چنانچہ سرسید کے آخری زمانہ میں مسٹر بیک ہی روح رواں تھے لیکن ان، دونوں میں بھی کشمکش شروع ہو گئی تھی جو زیادہ تر اضافہ مشاہرات کے متعلق تھی اور ۱۸۹۷ء میں جب کہ ۱۸۹۵ء کے غبن سے اور عام بددلی پیدا ہونے کی وجہ سے جس کا سبب خود اسٹاف تھا کالج کے مستقبل پر تاریکی چھا گئی تھی محض اضافہ کے لئے دھمکی دی گئی اور سرسید کو اپنی مرضی کے خلاف جھکنا پڑا۔ پھر ان کی رحلت کے بعد تو مسٹر بیک مختار مطلق ہی تھے اور اس وجہ سے نہایت افسوسناک واقعات بھی پیش آتے رہے، لیکن ستمبر ۱۸۹۹ء میں ان کی اچانک موت نے ان قضیوں کا فیصلہ کر دیا،

اب نواب محسن الملک کے عہد میں آنریبل سرتھیوڈر مارلین پرنسپل ہوئے ان کا عقیدہ تھا اور اس کو مسٹر کارنا کی تقریر پر زور دیتے ہوئے ظاہر کیا تھا کہ آنریری سکریٹری اسٹاف پر اثر نہیں ڈال سکتا نہ اس کی نگرانی کر سکتا ہے اور نہ سٹر سید سے یہ کام ہو سکا چنانچہ ان کے طرز عمل میں بھی یہی عقیدہ نمایاں تھا چنانچہ اُنہوں نے اپنے پیش رو کے مقابلہ میں زیادہ حکمت عملی اور زیادہ سنجیدگی کے ساتھ

زیادہ اقتدارات حاصل کر لئے تھے ۔

عام طور پر باخبر حلقوں میں یہ رائے تھی کہ نواب محسن الملک اسٹاف کی مرضی کے خلاف نہ کچھ کر سکتے ہیں اور نہ کرنا چاہتے ہیں عموماً ٹرسٹی بھی جن میں نواب وقار الملک بھی تھے مقتضائے مصلحت اسی میں سمجھتے تھے کہ جہاں تک ممکن ہو مخالفت کا موقع نہ آئے ۔ لیکن بعض واقعات سے طلبا کے ساتھ مسٹر مارلیسن کے سوشل برتاؤ میں بھی تبدیلی ہو گئی تھی اور رفتار حالات اس نوبت پر تھی کہ نواب وقار الملک نے مولانا حالی کو ایک خط میں لکھا کہ

"اب جو دن مسٹر مارلیسن کے تشریف لے جانے کے باقی ہیں خدا کرے وہ خیر و عافیت سے بسر ہو جائیں اور شکریوں کے نعروں میں ہی رخصت ہوں ورنہ بہت اندیشہ ہے کہ آئندہ اس پانچ چھ مہینے کی مدت میں وہ واقعات پیش نہ آجائیں جس سے علانیہ کشمکش پیدا ہو جائے اور بے لطفی ترقی کر جائے"

ان کو مسٹر کارنا کی جانشینی کے معاملہ میں بھی سخت ناکامی ہوئی تھی اور اور وہ اس خدمت سے ایک حد تک دل شکستہ ہو کر رخصت ہوئے تھے ، آخر زمانہ میں اُنھوں نے ٹرسٹیوں کی پالیسی کے متضاد ایک پالیسی اختیار کی اور نہایت مخفی طور سے اس پر عمل پیرا ہوئے جو اُنہوں نے سر شیخ عبدالقادر (ممبر انڈیا کونسل) سے اُسی زمانہ میں بیان کی تھی کہ :-

سب سے پہلے تو میں تمہیں ایک راز بتاتا ہوں اور وہ اس لئے بتاتا ہوں کہ اب میں آپ کی ملازمت سے آزاد ہوں وہ راز یہ ہے کہ میں نے گذشتہ دو تین سال میں مختلف اوقات پر بے شمار درخواستیں جو کالج میں داخل ہونے کے لئے آتی تھیں ٹرسٹیوں کے علم کے بغیر چپکے چپکے رد کی

ہوں گی مجھے ان کے روکنے سے بہت رنج ہوتا تھا لیکن میں مجبور تھا کیونکہ خوب جانتا تھا کہ جو تعداد اب ہے اگر اس کو زیادہ ہوتی تو نہ صرف کالج کی خصوصیات تعلیم معدوم ہو جائیں گی بلکہ انتظام ہمارے قابو سے باہر ہو جاوے گا میں یہ بھی خوب جانتا تھا کہ ٹرسٹیوں کی رائے درخواستوں کے روکنے کے خلاف ہو گی میں ان کی اس رائے سے ہمدردی رکھتا لیکن اس پر عمل کرنا کالج کے حق میں اس قدر مضر سمجھتا تھا کہ چپکے چپکے اصول پر کاربند رہا اور کالج کے طلبا کی تعداد بڑھنے نہ دی۔"

ان کے بعد مسٹر آرچبولڈ آئے متقدم جانشین کی روایات اور پالیسی بطور امانت ملی، اور انھوں نے اپنی پہلی تقریر میں ٹرسٹیوں کو نصیحت کی کہ جب کسی قسم کا اختلاف پیدا ہو تو کامل اعتماد اسٹاف پر ہونا چاہئیے پھر ان کے زمانہ میں جو اسٹرائک ہوئی اس کے نتیجہ میں بھی اسٹاف بے قصور ہی تسلیم کیا گیا اور جو قصور مانے بھی گئے ان کے مداوا کا انحصار بھی پرنسپل پہ رہا۔

نواب وقار الملک کا طرز عمل

ان حالات میں نواب وقار الملک آنریری سکریٹری ہوئے کوئی شک نہیں کہ وہ اسٹاف کے طرز عمل اور پرنسپل کے اقتدار کو نامناسب اور حد سے متجاوز جانتے تھے اور اس کو نقطۂ اعتدال پر لانے کے خواہشمند تھے لیکن وہ انگریز ماتحتوں کے ساتھ برتاؤ اور خوشگوار تعلقات رکھنے کے طریقوں کو بھی خوب جانتے تھے اور عرصہ تک کالج کے پرنسپل سے بہت زیادہ مشاہرہ یاب یورپین عہدہ داروں پر ایک بڑی گورنمنٹ کے سکریٹری کی حیثیت سے اپنے اختیارات کو کامل وقار کے ساتھ جس میں خوشگواری بھی شامل تھی استعمال کر چکے تھے، اسٹاف بھی ان کے افتاد طبیعت اور گزشتہ

حالات سے واقفیت کی بنا پر اپنے اختیارات کا تحفظ ضروری جانتا تھا ساتھ ہی متقدم جانشینوں کی پالسی اور بالخصوص داخلوں کے متعلق طرز عمل کو زیادہ موثر قائم رکھنا چاہتا تھا اس کو ڈائرکٹر آف پبلک انسٹرکشن، یونیورسٹی ایکٹ اور پیٹرن کے مشورہ سے بڑی تقویت تھی۔

آنریری سکریٹری نے جائزہ لینے کے بعد انتظامی امور کے متعلق اپنی گہری توجہ مبذول کی، وہ اکثر طلبا سے بھی ملتے تھے کیوں کہ ایک طرف تو اس ملنے کو اپنا قومی و منصبی فرض تصور کرتے تھے دوسری طرف طلبا کے والدین اور خود طلبا کی خواہش ہوتی تھی کہ وہ آنریری سکریٹری سے جن کی عظمت و عزت تمام قوم کے قلوب پر مرتسم تھی ملتے رہیں جس کو وہ اپنی سعادت بھی سمجھتے تھے، ان ملاقاتوں میں شاذ طور پر کبھی بعض طلبا اسٹاف کی کچھ شکایتیں کرتے تو وہ ان کو مطمئن کر دیتے کہ اسٹاف کی کارروائی ٹھیک ہے البتہ کبھی کبھی بعض شکایات کے متعلق جن کو وہ صحیح جانتے پرنسپل سے مناسب طور پر دوستانہ گفتگو کر لیتے کیونکہ ان کے نزدیک ناراضی کا بڑھنا ڈسپلن کے لیے بھی مضر تھا ان ملاقاتوں میں اس بات کا بہت زیادہ لحاظ رہتا کہ کوئی اثر پرنسپل کے رعب و داب کے خلاف نہ پڑے اور عموماً یہ ملاقاتیں فرداً فرداً ہوتی تھیں لیکن پرنسپل اور اسٹاف کو ناگوار ہوتی تھیں۔

نواب وقارالملک اپنی استقامت رائے کے لئے ایک نمونہ تھے اور اُنہوں نے کسی حاکم اور افسر کی رائے سے متاثر ہو کر کبھی اپنی رائے نہیں بدلی اس میں ان کو بسا اوقات دشواریاں پیش آئیں اور استعفے بھی پیش کرنے پڑے لیکن رفتار طبع یکساں رہی مگر آنریری سکریٹری ہونے کے بعد اُنہوں نے محض کالج کا کام عمدگی سے جاری رہنے کی خاطر بارہا پرنسپل کی اُس رائے سے اتفاق کر لیا

جس کے ساتھ وہ درحقیقت متفق نہ ہوتے ان کا خیال تھا کہ اگر فی صدی پانچ ایسی چھوٹی باتوں میں اتفاق کرلیا جائے گا تو فی صدی ۹۵ باتوں میں کوئی اختلاف نہ ہوگا اور یہ سب مقصد کالج کے لئے ضروری تھا انہوں نے اپنے اس جدید اصول کو پرنسپل پر واضح بھی کردیا تھا لیکن بالمشافہ گفتگو میں جب کبھی منشائے گفتگو ان کی رائے کے خلاف ہوتا تو بسا اوقات ان کا چہرہ غصہ سے لال ہوجاتا اور یہ بات نواب وقارالملک کے لئے تو کسی طرح بھی قابل برداشت نہ تھی اس ناگواری سے بچنے کے لئے مجبوراً مراسلت سے ہی زیادہ کام لینا پڑتا۔

بعض واقعات متعلقہ

چند سال قبل سے عام رجحان تھا کہ مسلمان نوجوانوں کو جو یورپ میں تکمیل تعلیم کریں اسٹاف میں داخل کیا جائے اور اسی مقصد کے لئے فارن اسکالرشپ فنڈ بھی قائم ہوا تھا سنہ ۱۹۰۶ء میں ٹرسٹیوں نے ایک رزولیوشن پاس کیا کہ مسٹر عبدالحفیظ سے جو انگلستان میں سائنس کی تعلیم پا رہے ہیں یہ معاہدہ کیا جائے کہ جب کامیابی کے ساتھ اپنی تعلیم ختم کریں تو ہمارے کالج میں سائنس کی پروفیسری کا ایک عہدہ قبول کریں۔ پرنسپل کو جب اس کا علم ہوا تو انہوں نے اس پر اعتراض کیا اور لکھا کہ اس انتظام کے متعلق مجھ سے بھی مشورہ لینا چاہئے تھا آنریری سکریٹری نے بتایا کہ ابھی کوئی انتظام نہیں ہوا ہے لیکن ان کی خوشی خاطر کے لئے اعتراض کا اعتراف کرلیا اور معاملہ ختم ہوگیا۔

ڈاکٹر سعیدالظفرخان جب باتفاق رائے پرنسپل اسسٹنٹ سرجن مقرر کئے گئے تو آنریری سکرٹری نے ان سے یہ انتظام بھی کیا کہ میڈیکل کالج میں داخل ہونے والے طلبا کو وہ بیالوجی کے لکچر بھی دیا کریں اور اس کے متعلقہ کاغذات پرنسپل کے پاس بھیجدیے گئے اس پر انہوں ذا عتراض کیا کہ یہ انتظام میرے مشورہ سے ہونا چاہئے۔

تھا اگرچہ یہ کوئی ایسی بات نہ تھی اور جب لکچروں کا وقت آتا تو ہر ایک انتظام پرنسپل کے ذریعہ سے ہی ہوتا پھر بھی آنریری سکریٹری نے افسوس و معذرت ظاہر کرتے ہوئے اطلاع دی کہ لکچرار کا تقرر نہیں کیا گیا بلکہ اس انتظام کا مقصد صرف یہ ہے کہ ایسے لکچروں کی صورت میں کوئی معاوضہ دینا نہ ہوگا اور اب پرنسپل یونیورسٹی قواعد وغیرہ پر غور کرنے کے بعد مناسب تجاویز کریں۔

تین سال قبل ڈھاکہ میں ایجوکیشنل کانفرنس کے اجلاس میں مسلمانوں کی تعلیمی پستی ملحوظ رکھ کر باہم مشورہ کے بعد مسٹر آرچبولڈ سے یہ اعلان کرایا گیا تھا کہ اگر وہاں کے طلبا کالج کلاسوں میں تعلیم حاصل کرنے کے لئے ایم اے او کالج میں آئیں گے تو ہر ایک ضلع کے لئے کالج کی طرف سے ایک وظیفہ دس روپیہ ماہانہ کا دیا جائے گا اس اعلان کے بعد ایک طالب علم عبدالرحمٰن نامی فرسٹ ایر میں داخل ہوا جس نے فارسی بطور زبان ثانوی لی بدقسمتی سے امتحان کے وقت بعض مضامین میں فیل ہوا جن میں فارسی بھی تھی مگر مکرر امتحان میں وہ سب میں کامیاب ہوا اور فارسی میں ایک نمبر کم رہا، مولوی خلیل احمد صاحب پرشین پروفیسر نے تحریری سفارش کی کہ سکنڈ ایر کے امتحان کے وقت وہ فارسی میں ضرور کامیاب ہو جاوے گا۔ لیکن پرنسپل نے ترقی دینے سے انکار کر دیا یہ معاملہ جب آنریری سکریٹری کے علم میں آیا تو اُنھوں نے پرنسپل کو مشرقی بنگال کے مسلمانوں کی تعلیمی حالت اور اس تمام کوشش کو یاد دلایا جو کانفرنس کے ذریعہ سے کی گئی تھی مگر وہ اپنی رائے پر قایم رہے اور طالب علم اپنے وطن جانے پر مجبور ہوا وہاں سے اس نے آنریری سکریٹری کو ایک دردناک خط لکھا جس میں مفلسی کی وجہ سے ترک تعلیم کے ارادہ کی اطلاع اور ایک سارٹیفکٹ کی درخواست تھی، آنریری سکریٹری نے اس خط کو پرنسپل کے پاس بھیجدیا اور خواہش کی کہ وہ اول اس کی نسبت رائے ظاہر کریں پرنسپل نے لکھا کہ:۔

عبدالرحمٰن ایک اچھا لڑکا ہے وہ مجھ سے سارٹیفکٹ طلب نہیں کرتا بلکہ آپ سے درخواست کرتا ہے میں آپ سے نہایت خوشی کے ساتھ کہتا ہوں کہ اس کو بلا تردد سارٹیفکٹ دیدیں اور مسٹر ٹول جنہوں نے اس کے کام کو خوب دیکھا ہے میرے ساتھ متفق الرائے ہیں۔

اس تحریر پر آنریری سکریٹری نے اپنا اور مسٹر ٹول کا سارٹیفکٹ بھیجدیا اور پرنسپل کو اطلاع دیتے ہوے لکھا کہ:۔

"یہ وہ ہی لڑکا ہے کہ جو فارسی کے ایک نمبر کی کمی کی وجہ سے فرسٹ ایر سے سکنڈ ایر میں نہیں چڑھایا گیا اور پرنسپل کے کام میں مداخلت کے بغیر یہ ضرور کہنے کی معافی چاہتا ہوں کہ مجھکو اس کارروائی کا بہت قلق رہے گا جس کو میں زبانی بھی آپ سے کہہ چکا ہوں۔

ایک اور طالب علم ———— پہلی مرتبہ بی اے میں فیل ہوا مگر جب دوبارہ داخلہ کے لئے آیا تو پرنسپل نے انکار کیا آنریری سکریٹری نے اس موقع پر سفارش کی مگر پھر بھی منظور نہیں کیا حالانکہ بطور ڈے اسکالر انتظام ہو سکتا تھا، اُسی زمانہ میں اسکول سے بدچلنی میں ایک طالب علم کا اخراج ہوا جس کی نسبت پرنسپل نے اطلاع دی آنریری سکریٹری نے لکھا کہ:۔

انسوس ہے کہ ایسے واقعات پیش آے جو ایسا حکم دینا پڑا میں مشکور ہوں گا اگر اس کے اخراج کے متعلقہ کاغذات میرے دیکھنے کے لئے بھیجدئے جائیں گے اور مجھکو اُمید ہے کہ اخراج سے قبل اس لڑکے کا تحریری جواب لے لیا گیا ہوگا!!

میں آپ کے اختیارات میں دست اندازی نہیں کرتا لیکن چوں کہ طلبا کے والدین اور پبلک مجھ سے ایسے وقتوں میں حالات دریافت کرتی ہے

لہذا میں بھی واقعات پر مطلع رہنا ضروری سمجھتا ہوں۔

مگر نہ کاغذات بھیجے گئے اور نہ واقعات سے اطلاع دی گئی اور آنریری سکریٹری کی خارجی تحقیقات میں معلوم ہوا کہ سزا سخت ہو گئی اور جس الزام کو پہلے بد چلنی کہا جاتا تھا اب ہیڈ ماسٹر اس کو انتہا درجہ کی بے تہذیبی قرار دیتے ہیں مگر اصلی واقعات سے اعراض ہی رہا۔

مسٹر ٹول کو سینیر ٹیوٹری اور ڈائننگ ہال کی خدمات کا اور مسٹر رسیس کو انگلش ہاؤس کی نگرانی کا الاؤنس ملتا تھا اِن دونوں نے چھ چھ مہینے کی رخصت لی اور خواہش کی کہ ان کا الاؤنس بھی جاری رہے آنریری سکریٹری نے بروئے قانون انکار کیا کہ یہ ذاتی الاؤنس نہیں بلکہ معاوضہ خدمات کا ہے اور اس مسئلہ کے متعلق قانون نہایت صاف ہے اس پر پرنسپل اور اسٹاف کی طرف سے اصرار ہوا تو آنریری سکریٹری نے لکھا کہ یہ مسئلہ ٹرسٹیوں کے سامنے پیش کیا جائے گا اور ان کو اختیار ہے کہ وہ قانون کے الفاظ بدل دیں یا کسی معاملہ کو خاص مسئلہ کے طور پر طے کریں اور خواہ قانون کے الفاظ کی وہی تعبیر کریں جو اسٹاف کرتا ہے لیکن بحیثیت محافظ قانون ٹرسٹیان میں الفاظ قانون کے وہی معنی لوں گا جو میرے نزدیک واجبی ہوں۔

پرنسپل نے پھر اصرار کیا اور مسٹر مارلین کے زمانہ کی مثال پیش کی تو آنریری سکریٹری نے یہ دیکھ کر کہ اسٹاف زیادہ بُرا مانتا ہے فنانس کمیٹی کا اجلاس منعقد کیا جس میں یہ طے ہوا کہ جب تک ٹرسٹی کوئی دوسرا فیصلہ کریں سابقہ عملدرآمد کی وجہ سے ٹیوٹری وغیرہ کا الاؤنس بدستور ملتا رہے۔ داخلہ طلبا کے متعلق اسٹاف اور آنریری سکریٹری کی پالیسی کا اختلاف بھی موثر تھا اسٹاف طلبا کی تعداد محدود رکھنا چاہتا تھا اور آنریری سکریٹری کا مطمع نظر تھا کہ کالج کا دائرہ وسیع ہو انفرادی داخلہ کا

اختیار پرنسپل کو رہے اور اجتماعی یعنی داخلہ کی تعداد کا تعین آنریری سکریٹری کا حق ہے۔

حالات کی یہ رفتار تھی کہ ہز آنر سر جان ہیوٹ پیٹرن نے کالج کا معائنہ کیا اور ٹرسٹیوں کے ایڈریس کی جوابی تقریر میں اسٹاف کو ضرورت کے لحاظ سے ناکافی بتایا اس بنا پر آنریری سکریٹری نے اسٹاف کا ٹائم ٹیبل دیکھ کر حسب قواعد یونیورسٹی پروفیسر کے چار اور اسسٹنٹوں کے پانچ پیریڈ روزانہ قائم کئے جانے کی ہدایت کی مگر پرنسپل نے ایسے تعین کو اپنے اختیارات کے تحت میں قرار دے کر انگلش پروفیسروں کے لئے تین پیریڈ رکھے جانے پر اصرار کیا، آنریری سکریٹری کا جواب تھا کہ پرنسپل کا کام یہ تجویز کرنا ہے کہ کون پروفیسر کس گھنٹے میں کس کلاس کو کس مضمون کی تعلیم دے یہ اختیار نہیں کہ جس قدر چاہے کسی پروفیسر سے کام لے۔

پرنسپل کا استعفا اور اسٹاف کا احتجاج و مراسلت باہمی

اس اختلاف کے باعث ۲۰ مارچ کو پرنسپل نے ایک خط کے ذریعہ اپنے اختیارات میں مستقل طور پر مداخلت کی پالسی برتی جانے کا بیان کر کے بطور احتجاج استعفا پیش کر دیا اور بلا انتظار جواب کالج کے پیٹرن کو بھی اطلاع دی،

آنریری سکرٹری نے فوراً ہی ایک نہایت ملائم جواب میں لکھا کہ :-

اگر آپ کی بددلی میری کسی ناواجب کارروائی سے ہوئی ہے تو میں آپ کو یقین دلاتا ہوں کہ بلا ایک لمحہ کی تاخیر کے اپنی غلطی کا اعتراف کرنے کو تیار ہوں، میں التجا کرتا ہوں کہ مہربانی سے آپ ان واقعات کی تفصیل سے مجکو مطلع کیجئے، جن سے آپ اتنے بددل ہو گئے ہیں تاکہ میں خود بھی ان پر غور کروں اور اگر ضرورت ہو تو پریسیڈنٹ صاحب اور ٹرسٹیوں کے سامنے پیش کروں۔“

مگر اس خط کے جواب کی جگہ دوسرے دن پرنسپل نے انگلش اسٹاف کے ایک متفقہ خط کی نقل ارسال کی جو اس نے ان کو لکھا تھا کہ

ہم نے نہایت دلی افسوس کے ساتھ سُنا کہ آپ کو اپنے عہدہ پرنسپلی سے استعفا دینے کی ضرورت پیش آئی لیکن اس ضرورت پر تاسف کرتے ہوئے جس کی وجہ سے آپ کو یہ طریقہ اختیار کرنا پڑا ہم کو اس امر کا اعتراف کرنا پڑتا ہے کہ آنریری سکرٹیری کی جانب سے مستقل طور پر دست اندازی کے اس طرز عمل نے جو ایک سے زیادہ مواقع پر خلاف قانون ہوا ہے آپ کی اس کارروائی کو لابدی کر دیا ہے۔ کالج کے نفع کے خیال سے ہم کو بااین ہمہ اُمید ہے کہ یہ معاملہ دوستانہ طریقہ سے اب بھی طے ہو جاوے گا جو کہ اس بات کی پختہ ضمانت ہوگی کہ آیندہ انسٹیٹیوشن کا انتظام قابل اطمینان رہے گا ورنہ ہم یہ خیال کرنے کی جرأت کرتے ہیں کہ ایسی شدید ضرورت لاحق ہوگئی ہے کہ جو دفعات ۱۳۹ و ۱۴۱[۵۱] قانون ٹرسٹیان کی بموجب کارروائی طلب ہے۔"

اس متفقہ خط کے موصول ہونے کے بعد آنریری سکرٹیری نے لوکل ٹرسٹیز کے سامنے معاملہ پیش کیا اور ان کے مشورہ سے مکرر مستقل اور بے ضابطہ مداخلت کی مثالیں بالوضاحت طلب کیں اور امکانی تلافی کا بھی یقین دلایا جواب میں پرنسپل نے طولانی خط لکھا اور اندرونی معاملات میں اپنے سب سے اعلیٰ اور انتہائی اختیار پر زور دیا لیکن باوجود بار بار لکھنے کے مداخلت و دست اندازی کی فہرست نہیں بھیجی گئی۔

واقعات کی اشاعت قبل ازیں کہ ٹرسٹیوں کے سامنے معاملہ پیش ہو جو ابھی تک صیغہ راز میں تھا اخبار پانیر میں ایک بے چینی پیدا کرنے والی خبر شایع

---

[۵۱] ان دو دفعات میں پیٹرن کے اختیارات مداخلت و مشورہ کا بیان ہے۔

ہوگئی جس میں لوکل گورنمنٹ کے سامنے معاملات پیش ہونے کی اطلاع کے ساتھ اسٹاف کی بھی تائید تھی، آنریری سکریٹری نے بھی پبلک اور ٹرسٹیوں کی اطلاع وطمانیت کے لئے ایک مختصر بیان مختلف صوبوں کے اخبارات میں شایع کرا دیا۔ تمام خط و کتابت کی نقول ہیٹرن کے پاس بھیجدیں اور ٹرسٹیوں کو مفصل واقعات سے اطلاع دیتے ہوئے لکھا کہ :۔

اگر کبھی وہ وقت آیا کہ اسٹاف نے اپنی شکایتوں کی فہرست ٹرسٹیوں کے سامنے پیش کی تو اس وقت میں بھی اُن بعض اہم ترین شکایتوں کو ٹرسٹیز کے سامنے پیش کروں گا جو مجکو اس طریقہ کی نسبت ہیں جس سے وہ اپنی خدمات کے فرائض انجام دے رہے ہیں اور جن کے لحاظ سے میرے دل کو بہت تکلیف پہنچتی رہتی ہے اور جن کو زبان پر لانے سے میں نے اب تک برابر احتیاط کی ہے مگر بہرحال اب ضرورت ہے کہ ایک دفعہ مضبوطی کے ساتھ اس کا فیصلہ ہوناچاہئے کہ آیندہ کام کیوں کر چل سکتا ہے“

اس کے ساتھ ہی ایسٹر کی تعطیل میں ایک ضروری اجلاس کے انعقاد کا نوٹس جاری کیا۔

ہیٹرن کی مداخلت

۲۷ مارچ کو جب لکھنؤ میں لیجسلیٹو کونسل کا اجلاس ختم ہوا تو ہز آنر نے نواب فیاض علی خان پریسیڈنٹ ٹرسٹیز کمیٹی سے دریافت کیا کہ جو اختلافات کہ اس وقت آنریری سکریٹری اور اسٹاف کے درمیان پیدا ہو گئے ہیں اور اخبارات میں ان کی خبر چھپنے سے پریشانی پھیل گئی ہے ان کے متعلق میرا مشورہ سنیں گے نواب ممدوح نے جواب دیا کہ ہز آنر کے مشورہ کو تمام ٹرسٹی قدر کی نگاہ سے دیکھیں گے۔

چنانچہ ہز آنر کی ہی رائے سے پریسیڈنٹ کمیٹی کے ذریعہ سے آنریری سکریٹری کو اور ڈائرکٹر کے ذریعہ مسٹر آرچبولڈ کو طلب کیا گیا۔ لکھنؤ پہنچ کر جب اس طلبی کا سبب معلوم ہوا تو آنریری سکریٹری نے ہز آنر سے ٹرسٹیز میٹنگ کے فیصلہ تک مداخلت ملتوی رکھنے کی درخواست کی اور لکھا کہ جو بحث پیدا ہو گئی ہے وہ کالج کے قانون اور اُس کی بنیاد پر موثر ہے اور اس کو ٹرسٹی ہی طے کر سکتے ہیں ساتھ ہی یہ بھی خواہش کی ٹرسٹیان موجودہ لکھنؤ میں سے راجہ سر تصدق رسول خاں شیخ نوشاد علی خاں اور مسٹر محمد رفیق بیرسٹر کو ہمراہ آنے کی اجازت دی جائے دوسرے دن گورنمنٹ ہاؤس میں یہ اجتماع ہوا آنریری سکریٹری نے اس نوبت پر ہز آنر کے مشورہ کو قبل از وقت بتایا لیکن ہز آنر نے اس کو تسلیم نہیں کیا اور ٹرسٹی بھی ہز آنر سے متفق تھے لہذا گفتگو شروع ہو گئی، مسٹر آرچبولڈ نے شکایات پیش کیں کہ :-

(۱) آنریری سکریٹری لڑکوں کی شکایات بطور عدالت اپیل سنتے ہیں

(۲) داخلوں میں اور مشتبہ ترقی کے درجہ کے بارے میں مداخلت کرتے ہیں اور حق سمجھتے ہیں کہ کسی طالبعلم کے عدم داخلہ کے فیصلہ سے قبل اگر کچھ کہنا چاہیں تو کہہ سکیں۔

(۳) ڈسپلن کی بنا پر اخراج طلبا کے متعلق اپنے مشورہ کی خواہش کرتے ہیں۔

(۴) پروفیسروں کا میقات تعلیم معین کرنا ٹرسٹیوں کا حق سمجھتے ہیں اور اسٹاف میں ملازمت کی نسبت امیدواروں سے بلا استمزاج پرنسپل مراسلت کرتے اور تقررات کر لیتے ہیں۔

(۵) مسٹر ٹول کا الاؤنس جاری رکھنے سے انکار ہے۔

(۶) کالج کا انتظام عامۃً خراب ہے مختلف کمیٹیوں کے جلسے منعقد نہ ہونے

سے کاموں میں رکاوٹ پیدا ہوتی ہے۔

(۷) آنریری سکریٹری کو یورپین اسٹاف پر اعتماد نہیں اور اُن کی فعل کو بغیر دریافت غلط تصور کر لیتے ہیں۔

آنریری سکریٹری نے ان شکایات کے جواب دئے ہز آنر نے جہاں تک کہ پرنسپل کے اختیارات کا تعلق تھا اُس کی حمایت کی اور آنریری سکریٹری کی اس چٹھی کے مفہوم کو جو ایک طالب علم (عبدالرحمن) کو ترقی نہ دینے کے بارہ میں تھی ملامت آمیز قرار دیا جدید تقررات کے بارہ میں بھی شکایت کی صحت تسلیم کی اور آنریری سکریٹری نے درخواستوں کی نامنظوری اور سزا کے متعلق جو کاغذات طلب کئے، اس کو بیرون اختیار قرار دیا۔ البتہ اتنی رعایت کی کہ علی گڑھ کی مخصوص حالت کے سبب پرنسپل ایک رپورٹ جس میں کہ ان طلبا کے نام ہوں جو کہ داخل نہیں کئے گئے یا ان کو درجہ میں ترقی نہیں دی مع اپنی وجوہات کے پیش کریں مگر اخراج شدہ طالب علم کے والدین پرنسپل سے ہی مراسلت کریں پروفیسروں کے کام کے متعلق آنریری سکریٹری کی رائے کو غلط قرار دیتے ہوئے اپنی رائے ظاہر کی کہ پرنسپل کی رائے کے خلاف اعتراض و اصرار ملامت کے مرادف ہے اور اس کا لازمی نتیجہ استعفا ہے البتہ مسٹر ٹول کے الاؤنس کے متعلق آنریری سکریٹری کی تائید کی اور اس بات کو بھی صحیح تسلیم نہیں کیا کہ آنریری سکریٹری کو یورپین ممبران اسٹاف پر اعتماد نہیں ہز آنر نے صاف اور پرزور طریقہ سے مشورہ دیا کہ آنریری سکریٹری کو صفائی سے سب پر یہ ظاہر کر دینا چاہئے کہ اس کا منشا پرنسپل کی تائید ہے اور اگر طلبا کی شکایات سنی جاویں گی تو پرنسپل کے اختیارات کمزور کر دیں گے اور پرنسپل کی کارروائی کے خلاف حکمراں جماعت کے سامنے کبھی اپیل نہیں کیا جا سکتا۔ ۱۹۰۷ء کی اسٹرائک کا سبب اس وقت کے آنریری سکریٹری کی مداخلت قرار دے کر مشورہ دیا کہ پرنسپل اور طلبا کے درمیان مداخلت اس کے منصب سے باہر ہے،

اس موقع پر ہز آنر نے پرنسپل اور آنریری سکرٹیری کو دو ہندوستانی پہلوانوں سے مشابہ بتایا جو ابتدا میں بغیر اس کے کہ ایک دوسرے سے قریب آکر مڈبھیڑ کریں۔ دور رہ کر مُنہ بناتے اور جسم کو حرکت دیتے ہیں،

ہز آنر نے یورپین اسٹاف کے بے موقع اور نامناسب دخل دینے پر افسوس ظاہر کرتے ہوئے پرنسپل کو ہدایت کی کہ اس پر اپنی ناپسندیدگی ظاہر کریں،

ہز آنر کے مشورے اور گفتگو سے حاضرالوقت ٹرسٹیوں نے دلی اتفاق ظاہر کیا لیکن سکرٹیری اپنی مداخلت ترک کرنے پر مائل نہیں ہوئے اس گفتگو اور کارروائی کی کیفیت مسٹر ڈیلافوس ڈائرکٹر قلمبند کرتے جاتے تھے اور گورنمنٹ ہاؤس سے واپس آکر خود آنریری سکریٹری نے بھی مرتب کی۔

دوسرے دن ۱۳ مارچ کو مقامی ٹرسٹیوں کے اصرار سے آنریری سکرٹیری نے ہز آنر کو ایک مفصل چٹھی لکھی کہ :-

> مجھ کو جو خود بھی سب سے زیادہ ہز آنر پیٹرن کالج کے احسانات کا شکر گذار ہوں جو کچھ عذر تھا وہ اس بنا پر نہ تھا کہ بلحاظ موجودہ قواعد وقوانین ٹرسٹیان اور یونیورسٹی ایکٹ کے حضور ممدوح کے ارشادات میں کوئی عذر ہے ان ارشادات کے تسلیم کرنے میں نہ اس وقت مجھکو کوئی عذر تھا اور نہ آئندہ ہو سکتا ہے اور ہز آنر کو یقین دلاتا ہوں کہ جو کچھ ہز آنر نے ارشاد فرمایا اس کو دوسرے ٹرسٹیوں کے ذہن نشین کرنے میں سب سے زیادہ میں حصہ لوں گا، میرا جو اصلی مقصد اس وقت کی گزارشات سے تھا وہ صرف یہ تھا کہ پرنسپل اور آنریری سکرٹیری دونوں کے ایسے مستحکم دوستانہ تعلقات ہونے چاہئیں کہ ایک دوسرے کو اپنی مفید صلاح ومشورہ سے مدد پہنچا سکیں اور کام بھی اچھی طرح چلے۔۔۔۔

میں چٹھی علی گڑھ پہنچکر اور لوکل ٹرسٹیز سے مشورہ کرکے لکھنا چاہتا تھا اور اُس وقت میں یہ رائے بھی دینا چاہتا تھا کہ اگر پرنسپل صاحب اپنا استعفا واپس لے لیں تو ہم کو ایسٹر کی تعطیلوں میں کانسٹٹیوشن میٹنگ کا طلب کرنا بھی ضرور نہو گا بلکہ امور طے شدہ کو کسی آیندہ میٹنگ کے امور اطلاعی میں درج کیا جائے جس کی یادداشت ان ٹرسٹیوں کے دستخط سے جو اس گفتگو کے وقت موجود تھے منسلک ہذا ہے۔ لیکن نواب آنربل پریسیڈنٹ اور سر راجہ صاحب اور راجہ نوشاد علی خان اور مسٹر محمد رفیق کا مشورہ یہی ہوا کہ چٹھی ابھی بھیجدی جائے لہذا یہیں سے بھیجتا ہوں اور میں ۱۲ بجے علی گڑھ کو روانہ ہوتا ہوں۔

جنانچہ وہ علی گڑھ روانہ ہو گئے اور اُنہوں نے جو یادداشت مرتب کی تھی وہ بھی ہز آنر کے پاس بھیجدی لیکن ڈائرکٹر کی یادداشت جب وصول ہوئی تو دونوں میں بہت فرق تھا اور اُس کی اطلاع بھی آنریری سکریٹری نے دیدی۔

ٹرسٹیوں کے جلسے۔ ان حالات میں ۱۲ اپریل کو ٹرسٹیوں کی مجلس مشورت منعقد ہوئی آنریری سکریٹری نے تمام امور کو بالتفصیل بیان کیا اور تبادلہ خیالات کے بعد جس میں (موید الملک سر) سید علی امام بیرسٹر پٹنہ نے زبردست حصّہ لیا یہ طے ہوا کہ ٹرسٹیوں کی ایک معمولی میٹنگ منعقد ہو اور جو رزولیوشن پاس کیا جائے اُسی پر عمل کرنے کا عزم مصمم کر لیا جاسے اور ہز آنر کے پاس اطلاعاً بھیجا جائے۔

اس جلسے میں آنریری سکریٹری پر بھی اعتراض ہوا کہ اُنہوں نے امور نزاعی کے متعلق ٹرسٹیوں کے باقاعدہ فیصلہ سے

پہلے کیوں ہز آنر کو خط لکھا اور رضامندی ظاہر کی اور جب کہ وہ ۲۹ مارچ کو لکھ چکے تھے کہ اولاً یہ معاملہ ٹرسٹیوں کے سامنے پیش ہونا چاہیئے۔ آنریری سکرٹیری نے جواب میں اس امر کو اپنی ذاتی رائے کا اظہار اور مسٹر محمد رفیق جیسے قانون دان کی توضیح مطالب اور ٹرسٹیان موجودہ گورنمنٹ ہاؤس کے اصرار پر مبنی کیا لیکن اجلاس نے اس جواب کو ناقابل قبول قرار دیتے ہوئے طے کیا کہ جماعت ٹرسٹیان کے قائم مقام کے لئے مناسب تھا کہ ایسے معاملہ میں ذاتی رائے سے احتراز کیا جاتا آنریری سیکرٹیری نے بھی اپنی غلطی کا اعلی الاعلان اعتراف کیا اور اسی بنا پر ہز آنر کو صاف لکھدیا کہ :۔

جو یادداشت اب موصول ہوئی ۔ اس میں بعض امور ایسے بھی ہیں جن کے قبول کرنے میں مجھے تامل ہے اور میں ٹرسٹیوں سے ان کے منظور کرانے میں کوئی حصّہ نہ لے سکوں گا۔"

اس کے بعد ہز آنر اور آنریری سکرٹیری کے مابین مراسلت جاری رہی جس میں زیادہ تر ہز آنر نے اپنے مشورہ یا فیصلہ کی تعمیل پر توجہ دلائی تھی اور آنریری سکرٹیری نے اس سے اس وقت تک کے لئے معذرت کی تھی جب تک ٹرسٹیز کوئی فیصلہ نہ کریں۔

اس سلسلہ میں ہز آنر نے دوبارہ آنریری سکرٹیری کو رام نگر بھی بلایا لیکن بحالات موجودہ ٹرسٹیوں کے فیصلہ تک اُنہوں نے ملنا اور گفتگو کرنا مناسب نہ سمجھ کر معذرت کرلی۔

اس کے بعد دوسرا جلسہ اپریل میں منعقد ہوا جس میں معمول سے زیادہ ٹرسٹی شریک ہوئے اس جلسہ میں بعض ان اصول مسلمہ کو جن کا تعلق پرنسپل کے اختیارات سے تھا مکرر تسلیم کر کے ٹرسٹیوں کے حقوق اور آنریری سکرٹیری

کی پوزیشن اور اس کے اعلیٰ اختیارات کی وضاحت کی گئی اور آنریری سکرٹیری کی مداخلت کی اس نوعیت کو جو وجہ شکایت بنائی گئی تھی صحیح و جائز قرار دیا۔

پرنسپل اور اسٹاف کے طرزِ عمل کی ناز یبائی پر بھی نکتہ چینی ہوئی اور اُن کی روش کو مصالحت کے طریقہ سے دور اور کالج کی تمام روایات کے مخالف قرار دے کر آیندہ کے لئے اپنی صاف و صریح رائے کا اظہار ضروری سمجھا گیا۔

ہزآنر نے لکھنو کے جلسہ مشاورت میں پرنسپل اور آنریری سکریٹری کو دو ہندوستانی پہلوانوں سے جو تشبیہ دی تھی اُس پر نہایت صاف طور پر ناپسندیدگی کا اظہار کر کے یہ رائے ثبت کی گئی کہ :۔

"وہ اس تمثیل کو آنریری سکرٹیری اور پرنسپل دونوں کے اعلیٰ مرتبہ اور عہدہ کے لئے مناسب نہیں سمجھتے جن کی پوزیشن ہندوستان کے مسلمانوں کی نگاہ میں بہت اہم ہے۔ ٹرسٹیان موجودہ کو اندیشہ ہے کہ کم از کم ہندوستانی خیال کے مطابق اس تمثیل سے آنریری سکریٹری کے دل کو تکلیف پہنچی ہوگی جنھوں نے سوائے اس کے کچھ نہیں کیا کہ کالج اور قوم کے مقاصد کی حفاظت میں کوشش کر کے اپنا فرضِ منصبی ادا کیا اور جس کے لئے ٹرسٹی اور قوم ان پر کامل اعتماد اور بھروسہ کرتے ہیں۔"

اس مجلس مشورہ نے بالآخر یہ تجویز کیا کہ جملہ کاغذات طبع کرا کے ٹرسٹیوں کے پاس بھیجے جائیں اور زیر بحث معاملات اور آیندہ کے لئے کارروائی کے طریقہ کی نسبت فیصلہ کرنے کے لئے ایک اسپیشل میٹنگ طلب کی جائے۔

سکرٹیری کے اقتدار کی حمایت اور ایک اعلان ہنوز معاملات اس نوبت پر تھے کہ

ان واقعات کی اشاعت سے تمام قوم میں ایک عام ہیجان پیدا ہو گیا تمام قومی اخبارات نے اس مبحث پر مسلسل مضامین لکھے نہ صرف قومی انجمنوں اور سوسائٹیوں نے بلکہ ہر جگہ اعیان واشراف نے پبلک جلسے منعقد کیے جن میں آنریری سکرٹیری پر اظہار اعتماد کر کے باتفاق کامل آنریری سکرٹیری پر اعتماد اور اس رائے کا اظہار کیا گیا تھا کہ اس کے ہاتھ قوی کئے جائیں اور کالج پر قومی نگرانی قائم رہے۔

مسلمانان مقیم انگلستان نے جن میں سابق طلبا اور دیگر معزز اصحاب شامل تھے جلسے کر کے آنریری سکرٹیری کی تائید میں رزولیوشن پاس کئے ہز ہائی نس سر آغا خان رائٹ آنریبل سید امیر علی اور میجر سید حسن بلگرامی نے بحری تار کے ذریعہ سے آنریری سکرٹیری کی تائید اور اِن پر کامل اعتماد کا اظہار کیا اس کے علاوہ اول الذکر دو اصحاب نے براہ راست ہز آنر کو خط لکھا جس میں آنریری سکرٹری کی خصوصیات اور اوصاف پر روشنی ڈالنے کے بعد کالج کی آزادی قائم رکھے جانے کا صاف صاف تذکرہ تھا لیکن بعض خوف زدہ ٹرسٹی ہز آنر کے مشورہ کو اتنی اہمیت دیتے تھے کہ گویا اس کو مسترد کرنا کالج کو خطرہ میں ڈالنا ہے اور بعض نے اس مقصد کا ایک رزولیوشن بھی پیش کر دیا تھا مگر اس پر مجارٹی نے توجہ نہ کی البتہ ٹرسٹیوں نے یہ اعلان بھی ضروری تصور کیا کہ:۔

> من جملہ کالج کے مقاصد اہم کے یہ مقصد نہایت اہم ہے کہ یہاں کے طلباء کے دلوں میں حکومت برطانیہ کی برکات کا سچا اعتراف اور انگلش کیرکٹر کا نقش پیدا ہو اور اس سے خفیف سا انحراف بھی حق امانت سے انحراف کے مرادف ہے۔

اور اسی حق امانت کو سالم برقرار رکھنے کے لئے اِن اختلافات

کے اثنا میں اس درجہ فکر و احتیاط سے کام لینا پڑا۔ ٹرسٹیوں کے طرز عمل کی جو کلیتہً صرف ادائے فرائض کے ایک مضبوط اور اعلیٰ احساس پر مبنی ہو کسی اور طرح تعبیر کرنا نہایت بے دردی اور صداقت و انصاف سے خالی ہے۔

پیٹرن کی معذرت

ٹرسٹیوں کی اس مضبوطی کا یہ نتیجہ نکلا کہ اسی سلسلہ کی مراسلت میں ہز آنر نے اپنے خط موسومہ پریسیڈنٹ میں اس تشبیہہ پر اظہار افسوس کر کے یقین دلایا کہ ان کا منشا آنریری سکرٹیری کی دل آزاری نہ تھا نیز امور متعلقہ پر عام بحث کرنے کے بعد اس بدگمانی کو جو اس بے موقع مداخلت سے پھیل گئی تھی اس طرح رفع کیا کہ :۔

"اخباروں میں مجھے یہ دیکھنے سے افسوس ہوا کہ کس قدر یہ خیال پھیل رہا ہے کہ گورنمنٹ کی یہ خواہش ہے کہ ایم اے او کالج کو سرکاری بنالے میں ٹرسٹیوں کو یقین دلاتا ہوں کہ میری خواہش یا ارادہ سے زیادہ دور اس معاملہ میں اور کچھ نہیں ہے۔

کالج کی ترقی محض اس بات پر منحصر ہے کہ مثل ماضی کے وہ آیندہ ایسا ہی افادہ گاہ تعلیمی رہے کہ جس کی حیات و بقا اور عزم و ہمت صرف مسلمانوں کی جماعت کی خود دارانہ کوشش اور سعی پر مبنی رہے اور اس افادہ گاہ تعلیمی کو سرکاری بنانے کا ارادہ یا کوشش کرنا نقصان سے مملو ہوگا اور ایسا نقصان سے مملو ہوگا کہ میں خود اس میں کسی طرح کا حصّہ لینا پسند نہ کروں گا موجودہ دشواریوں کی حالت میں میرا بیچ میں پڑنا اس نیت سے نہ تھا کہ میں کالج کے انتظام میں مداخلت کروں۔ مجھ کو تو صرف اس بات سے تحریک ہوئی کہ اگر مجھ سے ممکن ہو تو میں سٹی

صاحبان کو مدد دوں۔

نتیجہ

جلسے سے قبل بعض ٹرسٹیوں کے انتہائی اصرار سے ۱۹ اگست کو ہز آنر کی خدمت میں بمقام آگرہ ایک ڈپوٹیشن پیش ہوا، ایڈریس میں ہز آنر کی رائے سے اختلاف اختلاف کے وجوہ، سکریٹری کی پوزیشن اور اس کا قومی تعلق اُس کے فرائض اور مطمح نظر قوانین کالج کی تشریح جو ان امور پر موثر تھی اور تمام دیگر مراتب جو کالج کے نظم و نسق اور ڈسپلن سے متعلق تھے ان کو دل نشین پیرایہ میں بیان کیا گیا تھا۔ ہز آنر کا جواب نہایت مہربانی آمیز تھا اور اختلافات کے متعلق پہلے کے مقابلہ میں رائے زیادہ نرم تھی اور بعض امور میں آنریری سکریٹری کی مداخلت کو بھی تسلیم کیا۔

اس کے بعد ۲۲ اگست کو ٹرسٹیوں کی آخری میٹنگ منعقد ہوئی ان تمام امور متنازعہ کا فیصلہ کر دیا گیا یعنی سکریٹری کو سب سے اعلیٰ افسر عامل اور تمامی امور میں پرنسپل اور دوسرے افسروں سے ہر قسم کی اطلاعات حاصل کرنے طلبا سے ملنے اور ان کے خیالات سے واقف رہنے ہر سال طلبہ کی تعداد داخلہ مقرر اور حسب قواعد اسٹاف کی تعداد معین کرنے کا مجاز تسلیم کیا گیا۔ اور انتظامی معاملات میں پرنسپل اور ممبران اسٹاف کو ہز آنر، پیٹرن یا ڈائرکٹر سے براہ راست مراسلت کی ممانعت کی گئی۔

اسٹاف کے جائنٹ نوٹ کو نامناسب قرار دے کر ہدایت کی گئی کہ اس کو واپس لیا جائے اور پرنسپل کا استعفا منظور کر لیا جائے۔

غرض اس کارروائی کا یہ نہایت مفید نتیجہ نکلا کہ اسٹاف کو اپنے فرائض کے حدود معلوم ہو گئے اور اس کے اثر و اقتدار کی ایک مناسب تحدید ہو گئی۔

عام اطمینان اور جدید پرنسپل کا تقرر

اس فیصلہ پر تمام ملک میں اطمینان کا اظہار کیا گیا انگریزی اخبارات بھی اس سے مطمئن ہو گئے چنانچہ ٹائمز آف انڈیا نے ان معاملات پر ایک مضمون لکھا اور اس کے آخر میں یہ اعتراف کیا کہ

ٹرسٹیوں اسٹاف اور گورنمنٹ کے تعلقات آج ایسے محفوظ و مامون بنیاد پر قائم ہیں کہ گذشتہ دس سال سے ایسے کبھی نہ ہوئے تھے۔

اسٹاف نے اپنا نوٹ واپس لے لیا اور نواب وقار الملک آنریری سکریٹری نے اس اصول پر کہ معذرت اور اعتراف غلطی کے بعد اس کو بھلا ہی دینا بہتر ہے پرنسپل کے عہدہ پر مسٹر ٹول کا انتخاب کیا جو اسٹاف میں سب سے سینیر تھے اور تقرر سے قبل اس پالیسی کی متابعت کا جو ٹرسٹیوں نے قرار دی تھی ایک صاف اقرار اُن سے لے لیا گیا۔

اس انتخاب کے وقت جو امید کی گئی تھی وہ پوری ہوئی اور مسٹر ٹول نے ہمیشہ آنریری سکریٹری کے ساتھ ہم آہنگی اور اُس کے اختیارات اور مرتبہ کو ملحوظ رکھ کر اپنے فرائض انجام دیئے۔

مسٹر آرچبولڈ پرنسپل کا نواب وقار الملک کے کیرکٹر پر تبصرہ

اس تمام اختلاف و تنازعہ میں مسٹر آرچبولڈ کے دل کو جو تکلیف ہوئی ہو گی وہ محتاج بیان نہیں لیکن بایں ہمہ نواب وقار الملک کی ایک خاص عظمت اُن کے دل میں قائم تھی یہ عظمت کیوں قائم تھی اور اس کے کیا اسباب تھے اس کا جواب ان ہی کے قلم سے زیادہ دلچسپ ہو گا۔

راقم تذکرہ نے سنہ ۱۹۲ء میں جناب موصوف کی خدمت میں ایک خط لکھ کر ان واقعات کے متعلق کچھ حالات دریافت کئے تھے جس کے جواب میں تحریر کیا کہ:۔

نواب وقار الملک مرحوم سے مجھے ہمیشہ دلچسپی رہی ہے وہ پُرانے خیالات کے آدمی تھے لیکن ارادہ میں پکے دیانت دار اور اعلیٰ کیرکٹر کے شخص تھے وہ نئے طریقوں اور نئے خیالات سے زیادہ واقف نہ تھے اس لئے ایم اے او کالج علی گڑھ جیسی تعلیم گاہ کے معاملات میں ان کو دشواری پیش آتی تھی۔ باوجود اس واقعہ کے اور باوجود اس امر کے کہ میں نے اپنے عہدہ کو محض اس وجہ سے ترک کر دیا کہ کالج کے انتظامی معاملات میں میرا ان کے ساتھ نباہ ممکن نہ تھا۔ میں نے ہمیشہ ان کی عزت کی بلا شبہ میں نے اکثر یہ خیال کیا کہ مجھے کبھی کسی دوسرے ہندوستانی شخص سے ملنے کا موقع نہیں ملا جو اس درجہ مضبوط کیرکٹر کا ہو۔ جس انہماک سے اُنھوں نے اپنے راحت و آرام کو قربان کر کے قوم کی خدمت کی ہے وہ کسی طرح چُھپائی نہیں جا سکتی اگر ضرورت ہو تو میں ان تعلقات کو جو میرے ان کے ساتھ بسلسلۂ کالج تھے تفصیلی طور پر بیان کر سکتا ہوں لیکن ایسے واقعات اختلاف آرا کا باعث ہو سکتے ہیں اس لئے نظر انداز کر دینا بہتر ہے مجھے پُرانے جھگڑوں کے اعادہ کا افسوس ہوگا۔

متعدد وجوہ سے وہ ایک اعلیٰ معمر ہستی تھی جس نے ہمیشہ ہر معاملہ میں صداقت کے ساتھ جنگ کی میری تمنا ہے کہ فی زمانہ نواب صاحب کی قوم میں ان جیسے اور افراد بھی ہوں۔ عام اس سے کہ ان کی رائے غلط ہو یا درست ہو۔ وہ نہایت دیانت داری سے غور و فکر کرتے تھے۔

........——ـ ٭ ـ——........

باب دہم

ایک اندرونی حملہ

سنڈیکیٹ کے قیام، ٹرسٹیوں میں با اثر اور قابل اصحاب کا اضافہ کالج کے ساتھ ہر طبقہ میں دلچسپی اور اس کی قبولیت عام، طلبہ کی غیر معمولی کثرت، پرنسپل کی مداخلت کے فیصلہ اور اختیارات کی تحدید اور دوسری متفرق اصلاحات سے جو اس قلیل عرصہ میں ہوئیں۔ اگرچہ ہر طرف اور ہر شعبہ میں ترقی و طمانیت کے آثار نمایاں ہو رہے تھے کہ یکایک جولائی ۱۹۱۰ء میں صاحبزادہ آفتاب احمد خاں (مرحوم) نے ممبر انچارج بورڈنگ ہاؤس کی حیثیت سے ایک مفصل رپورٹ پیش کی جس میں بورڈنگ کے متعلق متعدد اصلاحی تجاویز مندرج تھیں مگر اس کا ایک حصہ طلبہ کے ڈسپلن اور اُس کے وجوہ و اسباب کے لئے مخصوص اور نہایت شدید نکتہ چینی سے معمور تھا اور اس کا تمام تر زور اولڈ بوائز کی اس جماعت کے جانب تھا جو مقامی اولڈ بوائز کی متقابل اور مخالف تھی ساتھ ہی خود آنریری سکرٹیری کی ذات پر بیرونی اصحاب اور موجودہ طلبا کی ملاقاتوں سے متاثر ہوتے رہنے کا بھی سخت اعتراض تھا۔ اخبارات کے بعض مضامین کو بھی خرابی کی ایک وجہ قرار دیا گیا تھا۔

یہ رپورٹ اگرچہ ضابطہ سے سنڈیکیٹ میں پیش ہوئی لیکن اس کو کافی شہرت دیدی گئی تھی۔

آنریری سکرٹیری اُس زمانہ میں اپنے فرزند کی تشویشناک علالت کے

باعث کالکا(دہلی میں) مقیم تھے اور (نواب بہادر ڈاکٹر سر) محمد مزمل اللہ خاں صاحب قایم مقام سکریٹری کی حیثیت سے کام کر رہے تھے اُنھوں نے اس رپورٹ کو سنڈیکیٹ کے سامنے پیش کرنے سے قبل آنریری سکریٹری کے پاس بھیجدیا۔

رپورٹ میں جو اندازِ بیان اختیار کیا گیا تھا وہ ہیبت ناک تھا اور اُس سے مترشح ہوتا تھا کہ کالج کے ڈسپلن کی حالت نہایت خراب اور کالج کسی سخت خطرہ میں ہے اور یہ رپورٹ اس خطرہ کی گھنٹی ہے چنانچہ ایک فقرہ کا آغاز حسب ذیل عبارت سے تھا کہ

جب کئی واقعات میری آنکھوں کے سامنے ہیں اور سچائی کے ساتھ میں اُن کو کالج کی تخریب اور ابتری کا سبب سمجھتا ہوں تو میرا فرض ہے کہ ان کی طرف توجہ دلاؤں اگر میری عرض پر توجہ کی کی گئی تو بہت اچھا ورنہ اگر ان اسباب کی وجہ سے آیندہ حالت لاعلاج ہو گئی تو اس کی ذمّہ داری ان لوگوں پر ہوگی جو باوجود مُتنبّہ ہونے کے اس طرف متوجّہ نہ ہوں گے۔"

جس وقت یہ رپورٹ آنریری سکریٹری نے پڑھی تو ان کے دل کو بہت تکلیف پہنچی کیونکہ وہ ان کی ڈھائی سال کی محنت، کالج کی ترقی اور علی گڑھ کی مرکزیت کے لیئے ایک کاری ضرب تھی اُنھوں نے یہی مناسب سمجھا کہ واقعات کو صاف صاف ٹرسٹیوں کے سامنے پیش کر دیا جاے۔

چنانچہ اس رپورٹ پر ایک مفصل اور مطول یادداشت لکھی اور چونکہ وسط ستمبر میں سالانہ بجٹ میٹنگ ہونے والی تھی اس لیئے قائم مقام سکریٹری سے خواہش کی کہ دونوں کو طبع کرا کر ٹرسٹیوں کے پاس بھیجدیا جاے۔

آنریری سکریٹری نے ان کاغذات کا ٹرسٹیوں کے سامنے اس غرض

سے پیش کیا جانا اور بھی ضروری سمجھا کہ :-

> جب ایک طرف سے آگ لگا دی گئی ہو تو اس سے محفوظ رہنے کے لئے
> ہر ممکن اور لازمی کوشش ضروری ہے .... اس
> پھوڑے کو (جو کالج کے جسم میں پیدا ہو گیا ہے) شگاف ہی دینا چاہیئے
> اس کو کسی دباؤ سے دبا دینا مصلحت کے خلاف ہے"

نیز ٹرسٹیوں سے تاریخ معینہ سے دو تین دن قبل آنے کی درخواست کی گئی تاکہ مناسب تدبیروں پر اطمینان کے ساتھ غور کیا جا سکے۔ اور صاف طور لکھ دیا کہ :-

> ممکن ہے کہ جو حملہ کیا گیا ہے اسی میں واجبیت ہو اور جو مدافعانہ پہلو میں نے اختیار کیا ہے اور جو کچھ میں کہہ رہا ہوں وہ غلط ہو پس اگر ٹرسٹی صاحبان کی نزدیک میری ہی رائے خطا پر ہو تو اس کے بعد ایک منٹ بھی اپنے موجودہ عہدہ پر رہنا خدا کا گناہ سمجھوں گا۔ کالج کو مشکلات سے نکالنا سب سے زیادہ مقدم ہے۔ سو مشتاق حسین اور زید عمر بکر اگر اس پر قربان ہو جاویں تو اس کی پروا نہ کرنی چاہیئے۔

معہذا یادداشت میں صاحبزادہ صاحب کی چند تجاویز کے ساتھ اتفاق بھی تھا اور جو تجاویز یا شکایات غیر صحیح اطلاعات پر مبنی تھیں اُن کی نسبت اطمینان کر دیا تھا اور جو بعض تجاویز پہلے سے زیر غور تھیں اس کی بھی کیفیت لکھ دی تھی۔ لیکن رپورٹ کے اس اہم حصہ پر جو درحقیقت جان سخن تھا نہایت صفائی کے ساتھ حسب ذیل خیالات ظاہر کئے تھے کہ :-

> آنریبل ممدوح کا یہ ایک بہت صاف صاف بیان ہے جس کو اُنھوں نے اپنے علم ذاتی کی بنیاد پر لکھا ہے۔ لہذا ہر ایک ٹرسٹی کا یہ فرض ہے (اور آنریری سکریٹری کا یہ فرض اعظم ہے) کہ آنریبل صاحبزادہ صاحب کی اس رائے کے متعلق صاف صاف اپنی رائے ظاہر کرے

اور میں اپنے گزشتہ ڈھائی سال کے کامل تجربہ کے بعد اس موقع پر اپنی معلومات اور اپنے خیالات کو اب صاف صاف ظاہر کرنے پر مجبور ہوں۔

واقعات یہ ہیں کہ اولڈ بوائز میں باہم پارٹی فیلنگ قائم ہے ایک پارٹی میں کالج کے بعض وہ لوکل ٹرسٹیز شامل ہیں جن کو کالج کے کاموں میں اکثر اوقات قابو حاصل رہا ہے۔ اس پارٹی میں ہمارے ایک معزز دوست صاحبزادہ آفتاب احمد خاں صاحب بھی ہیں اور وہی اس پارٹی کے لیڈر ہیں دوسری پارٹی کے لیڈر میرے معزز دوست مسٹر شوکت علی خاں صاحب اور مسٹر محمد علی صاحب (آکسن) ہیں آخر الذکر پارٹی کو ہمیشہ یہ شکایت رہی ہے کہ اول الذکر پارٹی تمام اختیارات کو اپنے ہاتھ میں رکھنا چاہتی ہے اور جو لوگ اُن کے ہم خیال نہیں اُن کو کالج کے کاموں میں حتی الامکان دخل دینا نہیں چاہتی۔ اور جہاں تک مجھکو تجربہ ہوا میں نے بھی اس شکایت کو ایک حد تک ضرور صحیح پایا خاص آنریبل ممدوح کی نسبت یہ بھی میرا ذاتی تجربہ ہے کہ جب تک کام اُن کی مرضی کے مطابق ہو اُس وقت تک وہ ہر ایک طرح کام کرنے کے لئے مستعد ہیں لیکن اگر کام کرنے والوں کو اُن کی رائے سے اتفاق نہو تو پھر وہ اُس کام پر جہاں تک ہو سکتا ہے اعتراض کرتے ہیں۔ اگرچہ انسانی فطرت عام طور پر ایسی ہی واقع ہوئی ہے۔ لیکن جب کسی انسان میں اس قسم کی عادت اعتدال سے متجاوز ہوتی ہے تو وہ ناگواری کی حد تک پہنچ جاتی ہے۔ متعدد مواقع پر میں نے یہ بھی دیکھا ہے کہ آنریبل موصوف اُس وقت تک جبکہ کسی جلسہ میں موجود رہ کر آزادی کے

ساتھ اپنے خیالات کا اظہار کر سکتے) باوجود قادر ہونے کے بھی جلسہ میں شریک ہونے سے طرح دے جاتے ہیں۔ اور جب وقت گزر جاتا ہے تو اُس جلسہ کی کارروائیوں پر اعتراض کی بوچھار کر دیتے ہیں۔

آنریبل صاحب زادہ صاحب آنریری سکرٹیری کی غیبت میں لوگوں کے سامنے موجودہ انتظام کی وہ خرابیاں کرتے ہیں جو درحقیقت موجود نہیں ہوتیں آنریبل صاحبزادہ صاحب سے اختلافات کی تعداد روز افزوں ہے۔ اور یہ اختلاف (جہاں تک میں اپنی یاد سے کہہ سکتا ہوں) زیادہ تر دو قسم کے کاموں میں ہوتا ہے۔ یا ایسی تجویزوں میں جن میں صاحب زادہ کی طبیعت پہ پارٹی فیلنگ کا رنگ غالب ہوتا ہے اور یا ایسے مواقع پہ جہاں اُن کو محسوس ہوتا ہے کہ فلاں تجویز سے اُن کے قدیم اختیارات اور قابو میں کچھ کمی ہوتی ہے۔ باہر والے ان باریکیوں سے واقف نہیں ہیں یا بہت کم واقف ہوں گے۔

اس کے بعد اپنی پالسی کا کہ میں نے کوئی پارٹی نہیں بنائی اور ہر موافق اور مخالف رائے کو سُنا اور جو مقاصد کالج کے لحاظ سے مفید تھے اُس سے اتفاق کیا بیان کر کے لکھا کہ:۔

لیکن یہ ظاہر ہے کہ جن صاحبوں کی خواہش ہمیشہ یہ رہی ہو کہ جو کچھ ہو ہماری مرضی کے مطابق اور ہماری رائے سے ہو اُن کو میرا یہ طرز کارروائی کیوں پسند آتا۔ ایسے حضرات دل ہی دل میں پیچ و تاب کھاتے رہے اور انتظام کو بدنام کرتے رہے میں نے اُن کی ایک اور قسم کی خطرناک کارروائیاں بھی دیکھیں اور وہ یہ تھیں کہ جب وہ مجھ سے مایوس ہوئے تو براہ راست اسٹاف کے دل میں یہ خیالات پیدا کرنے چاہے اگر ہم کسی بات میں متفق نہ ہوں تو آنریری سکرٹیری کچھ

نہیں کر سکتا۔ اور میں نے نہایت صاف لفظوں میں صاحب زادہ صاحب
کو یہ جتلا دیا کہ یہ کارروائیاں کالج کو نقصان پہنچانے والی ہیں اور وہ
کارروائی (جس سے آنریری سکرٹیری کی قوت کو ضعف پہنچے) بدترین کارروائی
ہے گو وہ آپ ہی کی طرف سے کیوں نہ ہو۔ آخر میں صاحب زادہ
صاحب کو یہ میں نے اُس وقت جتلایا جب مجھکو معلوم ہوا کہ جناب
ممدوح نے کالج کے معاملات پر گفتگو کرنے کی غرض سے کالج اور سکول
اسٹاف کو اپنے دولت خانہ پر جمع کیا اور دیر تک اُن سے کالج کے
معاملات میں گفتگو کی اور اُن کو ہدایتیں کیں اور اُس میں وہ یہاں تک
بڑھ گئے کہ آنریری سکریٹری کو اپنے اس ارادہ کی بھی کوئی اطلاع
نہیں کی۔ میں نے صاحب زادہ صاحب سے کہا کہ اول تو آپ کو
ضرور تھا کہ آپ آنریری سکریٹری کو بھی اُس جلسہ میں شریک کرتے
یا شریک ہونے کا موقع دیتے اور دوم پرنسپل کالج کی بلا اطلاع
اُن کے ماتحتوں کو کسی ایسے جلسے میں بُلانا خلاف مصلحت تھا جس سے
اسٹاف کو نہایت غلط طور پر یہہ خیال کرنے کا موقع ملتا تھا کہ اب
انتظامی حکومت کا جھنڈا کہاں لہلہا رہا ہے۔ صاحب زادہ صاحب
کا جواب اس کی نسبت اس کے سوا کچھ نہ تھا کہ میں نے اپنے گھر پر
یہہ میٹنگ کی تھی۔ اور ہر شخص سمجھ سکتا ہے کہ یہ جواب کس قدر ناقابل
اطمینان تھا اور اُس کے دوسرے ہی دن مجھکو معلوم ہوا کہ پرنسپل
صاحب کو بھی اس کارروائی کی نسبت (کہ اُن کے ماتحت بلا اُن کے
علم کے کالج کے انتظامی معاملات پر گفتگو و مشورہ کرنے کے لئے بُلائے
گئے) اعتراض ہے۔ ....

دوسری تجویز آنریبل صاحبزادہ صاحب نے یہ پیش کی ہے (ملاحظہ ہو فقرہ ۲۱) کہ طلبا اور آنریری سکرٹیری اور پرنسپل بیرونی اثر سے متاثر نہ ہونے پائیں۔ یہہ خیالات ایک حد تک شاید درست ہوں۔ لیکن ناممکن العمل ہیں۔ طلبار کو اگر شکایتیں ہونگی ضرور اُن کی اطلاع ٹرسٹیوں اور سربرآوردگان قوم تک پہونچے گی اور دوسرے لوگ آنریری سکرٹیری سے بھی اُس کا ذکر کریں گے۔ ان باتوں کو کوئی کہاں تک روک سکتا ہے۔ البتہ طلباء کی طرف سے اپنی تکلیفوں کا اظہار نامناسب طور سے نہ ہونا چاہئے۔ اور وہ نامناسب طریقہ یہہ ہے کہ ڈپوٹیشن بناکر کسی کے پاس جاویں۔ اور اُس کو تو یہاں تک روک دیا گیا ہے کہ حال ہی میں چند طلبار نے متفق ہوکر پرنسپل صاحب کے سامنے اپنی بعض شکایات کو پیش کرنا چاہا تو پرنسپل صاحب نے اور میں نے بالاتفاق یہ قرار دیا کہ جب کسی طالب علم کو پرنسپل صاحب سے اپنی کسی تکلیف کا اظہار کرنا ہو تو چاہئے کہ وہ اپنی تکلیف کا اظہار خود ہی علٰحدہ کرے۔ یہ اجازت نہ ہوگی کہ دو طالب علم بھی متفق ہوکر اپنی شکایت پیش کریں گو وہ شکایت ایک ہی قسم کی ہو۔ باقی جو کچھ صاحب زادہ صاحب نے اس کے متعلق لکھا ہے کہ آنریری سکرٹیری پر بھی کوئی اثر نہ ڈالنے پاوے میں اُس کا مشکور ہوں۔ لیکن اس قدغن کی اپنے نزدیک کوئی ضرورت نہیں سمجھتا۔ اور نہ صرف یہ کہ ضرورت نہیں سمجھتا بلکہ اُس کو مضر سمجھتا ہوں۔ کالج کا آنریری سکرٹیری کوئی بچہ نہیں ہوتا جو دوسروں کی رائے سے متاثر ہوکر سیدھے راستہ سے منحرف ہو جاویگا۔ دوسرے لوگوں اور آنریری سکرٹیری کی گفتگو کا نتیجہ ہمیشہ یہی ہوگا کہ لوگ بخوبی مطمئن ہو جاویں گے اور اگر اُن کو آزادی

کے ساتھ آنریری سکریٹری سے گفتگو کا اور اپنے خیالات کا اظہار کا موقع نہ ملے گا تو کبھی وہ مطمئن نہ ہونگے اور میں تو اپنے آپ کو نہ صرف ٹرسٹیوں کا سکرٹری سمجھتا ہوں بلکہ معاملات کالج میں تمام قوم کا سکریٹری سمجھتا ہوں۔ اور میری طرف سے آزادی ہے کہ جن صاحب کا جی چاہے معاملات کالج میں مجھ سے گفتگو کریں۔ جہاں تک میری فرصت مجھکو اجازت دیتی ہے میں دلچسپی کے ساتھ اُن سے گفتگو کرنا اپنا خوشگوار فرض سمجھتا ہوں۔

اس کے بعد صاحبزادہ صاحب نے جو کچھ بطور تیسری دقت کے رقم فرمایا ہے اُس کا خلاصہ یہ ہے کہ اولڈ بوئز کی صحبت سے طلباء کو محفوظ رکھا جاے۔ اس تجویز میں اُس پارٹی فیلنگ کا اثر دیکھتا ہوں جو اولڈ بوئز کے باہم موجود ہے۔ گو صاحبزادہ صاحب نے اس کو محسوس نہ کیا ہو اور اُنھوں نے جو کچھ لکھا ہو نیک نیتی کے ساتھ لکھا ہو لیکن جس وقت وہ چند سطریں لکھ رہے تھے ضرور اُن کا روئے سخن اُن چند اولڈ بوئز کی طرف تھا جن کو وہ دوسری پارٹی کا سمجھتے ہیں اور اگر وہ اُن اولڈ بوئز کا نام ظاہر کرنے پر کسی وقت مجبور ہوں تو سب دیکھ لیں گے کہ پہلے نام جو اُن کی زبان سے نکلیں گے وہ شوکت علی اور محمد علی ہونگے لہذا میں ٹرسٹی صاحبان کو ہرگز یہ مشورہ نہ دونگا کہ وہ اس قسم کے خیالات کا اتباع کریں جو اولڈ بوئز کے گروہ کی توہین میں داخل ہے۔ اس سے زیادہ انسان کی کوئی کمزوری نہیں ہو سکتی کہ وہ اپنے خیالات کو دلائل سے قوی نہ کرے اور یہہ کوشش کرے کہ کوئی مخالف آواز بلند نہو۔ مسٹر آر جے بولڈ نے

اس قسم کا ایک نادر شاہی حکم امتناعی مسٹر محمد علی خاں کے خلاف جاری کرنا چاہا تھا۔ لیکن میں نے اُن سے اتفاق نہ کیا اور بہت اصرار کے ساتھ اُن کو ایسا کرنے سے روکا۔ اور تھوڑے ہی دنوں بعد ان کو معلوم ہو گیا کہ کس قدر غلط راستہ پر چل رہے تھے۔ گذشتہ سالانہ اولڈ بوائز میٹنگ کے وقت یہی سوال موجود پرنسپل مسٹر ٹوں کے اور میرے سامنے پیش ہوا کہ اولڈ بوائز کو موجودہ طلبار کے ساتھ قیام کرنے کی اجازت دینی چاہیئے یا نہیں۔ اور ہم دونوں نے یہی فیصلہ کیا کہ اس قسم کی مزاحمت بے فائدہ ہی نہیں بلکہ مضر ہوگی۔ لہذا عام اجازت دی گئی کہ جو طلبار کسی اولڈ بوائے کو اپنے پاس ٹھیرانا چاہیں وہ اولڈ بوائے اُن طلبار کے ساتھ ٹھیر سکتے ہیں۔ یہ رائے اس بنیاد پر قایم ہوتی کہ جن طلبار کے تعلقات قرابت یا دوستی کے کسی اولڈ بوائے کے ساتھ ہونگے وہ ہر طرح اُن سے مل سکیں گے۔ ایک مکان میں ٹھہریں یا نہ ٹھہریں۔ اور ہر موقع پر کوئی پہرہ اُن پر تعینات نہ ہو سکے گا۔ جو اُن کی باہمی گفتگو سُن سکے۔ یہی تجویز تھی جس کی ناراضی سے اُس یادداشت کی صورت میں یہ اپیل پیش کیا گیا ہے اور اُس حکم کو منسوخ کر دیا جاتا ہے سخت ہی غلطی ہوگی اگر کبھی ہم اس قسم کی پارٹی فیلنگ میں مبتلا ہوں۔ ہم کو اپنے گھر میں انتظام درست رکھنا چاہیئے۔ اُس کے بعد نکتہ چینی سے ہم کو کوئی خوف نہ کرنا چاہیئے۔

فقرہ ۲۹ میں آنریبل صاحب زادہ صاحب تحریر فرماتے ہیں کہ جو کچھ چند سال سے بورڈنگ ہاؤس میں ہو رہا ہے اور تقریروں

اور تحریروں کے ذریعہ سے جو کچھ اثر طلبا کے خیالات پر ڈالے جا رہے ہیں اُن کے نتائج میری راے میں کالج اور خود طلبا کی زندگی کے لئے نہایت مضر ہیں" لہٰذا میں ممنوں گا اگر صاحبزادہ صاحب صراحت سے ارشاد فرمائیں کہ چند سالوں سے مراد کون سے سال ہیں۔ آیا اُن کا مقصد یہ ہے کہ جب سے میں آنریری سکریٹری مقرر ہوا ہوں۔ اور یہ بھی کہ جن تحریروں اور تقریروں کی طرف اُنھوں نے ٹرسٹیاں کو توجہ دلائی ہے وہ کونسی تحریریں اور تقریریں ہیں جب تک یہ نہ معلوم ہو اُس وقت تک جناب ممدوح کی اس تحریر کے متعلق کچھ راے میں اپنی ظاہر نہیں کرسکتا۔

گذشتہ اسٹرایک کے اسباب کی تحقیقات کی طرف جو اشارہ صاحب زادہ صاحب نے اس رپورٹ میں فرمایا ہے اور جتلایا ہے کہ "کمیشن تحقیقات اسباب شورش نے منجملہ اور اسباب کے اُن مضامین کو بھی شورش کا ایک سبب قرار دیا تھا جو چند سال بیشتر سے کالج کے متعلق لکھے جا رہے تھے"۔ اس کے متعلق اس وقت اگر کچھ کہہ سکتا ہوں تو صرف یہ کہ میں معترضین کی زبان بند کرنے کی پالسی سے کبھی متفق نہیں ہوا۔ میں نے اُس کمیشن کی رپورٹ کے ساتھ جس کا صاحب زادہ صاحب نے ذکر کیا ہے اپنی ایک رپورٹ بھی شامل کی تھی۔ اُس میں میں نے اس اعتراض کی پوری تردید کردی تھی کہ اخباری مضامین کی وجہ سے طالب علموں میں شورش کا مادہ پیدا ہوا۔ اُس بحث میں میں نے یہ بھی بیان کیا ہے کہ اگر وہ مضامین ذریعہ شورش قرار پا سکتے ہیں تو وہ لوگ بھی ملزم قرار پائیں گے

جنھوں نے اُن مضامین کی تردید اخباروں میں نہیں کی۔ اب بھی میری وہی راے ہے۔ ہم کو اپنا انتظام درست رکھنا چاہیئے۔ اُس کے بعد کسی نکتہ چین کی نکتہ چینی سے ہم کو ڈرنا نہیں چاہیئے جس کے جو جی میں آئے وہ کہے۔ ہمارے لئے صرف یہ کافی ہوگا کہ اگر ہمارے انتظام پر کوئی غلط حملہ کیا جاوے تو ہم کو نہایت ٹھنڈے دل سے اُس کے جواب میں اصلی واقعات کو پبلک کے سامنے ظاہر کردیں اور فیصلہ کو پبلک پر چھوڑ دیں۔ دیکھو کہ جناب سر سید صاحب کے وقت میں کیا ہوتا تھا۔ اُس وقت آج کی نسبت کالج کے معاملات پر بہت زیادہ اعتراضوں کی بوچھار رہتی تھی لیکن سید صاحب نے یہ کوشش کبھی نہیں کی کہ لوگوں کی زبان بند کریں یا وہ اعتراضات کا جواب دیتے تھے یا فضول اعتراض کو نظر حقارت سے دیکھکر خاموشی اختیار کرتے تھے۔ اب بھی ہم کو وہی طرز اختیار کرنا چاہیئے۔ میں نے بارہا اس بات کو ظاہر کر دیا ہے کہ میری طبیعت جمہوریت پسند ہے۔ میں کسی کی آزادی راے پر روک قایم کرنا پسند نہیں کرتا اور اس کو تو میں کسی طرح بھی جائز نہ رکھوں گا کہ اولڈ بوائز ایسوسی ایشن کے باہمی پارٹی فیلنگ کا رنگ ٹرسٹیز کمیٹی میں داخل ہو جس میں (صاحب زادہ صاحب مجھے معاف کریں) اُن کی رپورٹ کا اکثر حصہ رنگا ہوا ہے۔

آخر میں مجھکو یہ بھی بیان کرنا ضروری ہے کہ۔ موجودہ انتظامات کالج کو میں خود مکمل نہیں سمجھتا۔ ساتھ ہی اس سے بھی انکار کرنا ظلم میں داخل ہوگا کہ ہر ایک صیغہ میں ترقی ہو رہی ہے۔ طلبا کی ڈسپلن کا

ایک لفظ ہے جس کی نسبت جس کا جی چاہے وہ یہ کہدے کہ وہ قابل اطمینان نہیں ہے مگر میں اُس سے بھی متفق نہیں۔ جس چیز کو میں ہر روز اپنی آنکھوں سے دیکھتا ہوں اور ہر ایک آواز اُس کے متعلق میرے کانوں میں پہونچتی ہے اُس کے لحاظ سے میں کہہ سکتا ہوں کہ موجودہ ڈسپلن سوا اس کے کہ ترقی کی ضرورت ہے اُس کو خراب کسی طرح نہیں کہا جا سکتا۔ طالب علموں کی ایک جم غفیر بہت اطاعت اور اعتدال سے بسر کر رہی ہے۔ خاص خاص کسی طالب علم سے کسی خطا کا سرزد ہو جانا یہہ عام ڈسپلن کو بدنام نہیں کر سکتا۔ میرے دوست مسٹر ٹول بخوبی واقف ہیں کہ میں کس قسم کی ڈسپلن کا خواہش مند ہوں اور اُن کی موجودگی میں عام طور سے میں نے طلبہ پر اپنا خیال ظاہر کر دیا ہے کہ میں بورڈنگ ہاؤس کی ڈسپلن کو ایک فوجی کیمپ کی ڈسپلن میں دیکھنا پسند کرتا ہوں اور جہاں تک مجھ سے ممکن ہے اس کالج کی پرنسپل کو ڈسپلن کی ترقی میں پوری مدد دیتا رہتا ہوں۔

اس یادداشت کی اشاعت کے بعد صاحب زادہ صاحب نے ٹرسٹیوں کے سامنے پیش کرنے کے لئے ایک جواب مرتب کیا لیکن میٹنگ میں جب معاملہ پیش ہوا تو نتیجہ میں صاحب زادہ صاحب نے پہلی رپورٹ واپس لے لی اور خوردانہ و بزرگانہ ادب و شفقت کے ساتھ معاملہ ختم ہو گیا۔

یہ واقعہ تذکرہ کے اجمال کو ملحوظ رکھ کر بہت مختصر لکھا جا سکتا تھا لیکن اس موقع پر مولف نے پیمانہ سے زیادہ تفصیل اس لئے ضروری تصور کی کہ اس کے اندر ایک ایسی عبرت موجود ہے کہ وہ نوجوان جو قومی کاموں کا ولولہ و جوش رکھتے ہیں ذرا چشم بصیرت سے دیکھیں۔

کالج کے متعلق جو واقعات ۱۸۹۹ء سے اس وقت تک پیش آئے اور اپنے زمانہ میں نواب محسن الملک کو جن تکالیف کا سامنا کرنا پڑا اور جو جو باتیں خاموشی اور بے نظیر صبر و تحمل کے ساتھ اُنھوں نے ایسے نوجوان زعمائے ملت سے سنیں جنھوں نے زبان و قلم کے زور دکھانے کے سوا کچھ بھی نہ کیا تھا۔ ان سب کو اسی کشمکش کا نتیجہ سمجھنا چاہئے۔ جو اس واقعہ میں نظر آتی ہے۔

نواب وقارالملک نے اگرچہ اپنی پالیسی کی قوت سے پیش آمدہ خطرات کی پیش بندی کر دی۔ تاہم اس جذبہ کو نیم مردہ حالت میں چھوڑ دیا جو نواب اسحٰق خاں (مرحوم) کے زمانہ میں پوری قوت کے ساتھ اُبھرا اور اس نے سیاسی معاملات کو بھی اپنی لپیٹ میں لے لیا جس سے ان کو اپنے پیشروؤں کے مقابلہ میں زیادہ تکلیفیں اور زیادہ روحانی اذیتیں برداشت کرنی پڑیں۔

۱۹۱۸ء میں جب موت نے ان کا زمانہ ختم کر دیا اور قوم کے سیاسی و تعلیمی ادارے ان زعمائے ملت کے ہاتھوں میں آئے جب کہ اُنھیں زمانہ کی نشیب و فراز کا پورا تجربہ حاصل ہو چکا تھا اور بڑھاپے کی دانائی نے جوش بھی سرد کر دیا تھا تاہم اس جذبہ[۱] میں کوئی کمی نہ ہوئی بلکہ ترقی پذیر ہی رہا۔

---

[۱] یہی جذبہ تھا جو ۱۹۲۰ء میں ترک موالات کی صورت میں ظاہر ہوا جس کی مدافعت کر کے پس پا جماعت نے مایوس ہو کر پرانے میدان کو چھوڑ دیا مگر فاتح جماعت سیاسی مورچہ پر حملہ آور ہوئی تاآں کہ ۱۹۲۵ء میں کالج کی پنجاہ سالہ جوبلی کے موقع پر ایک ابلیسی کانفرنس قائم کر کے خطبۂ صدارتِ ابلیس" میں ایک انداز خاص کے ساتھ غلاظت اُچھالی گئی مگر یہ کیسا عبرتناک واقعہ ہے کہ ایک ہی سال میں یہ فاتح جماعت آپس میں متصادم ہوئی جس تصادم کا شرارہ اس ادارہ کے لئے برق خرمن بن گیا، باہمی کشمکش، مسلم یونیورسٹی کی اصلی یا فرضی تباہی، حکومت کو دعوت مداخلت، رحمۃ اللہ کمیشن سب اسی جذبہ کے نتائج ہیں۔

باب یازدہم

اصلاحات و ترقیات

تعداد ٹرسٹیان میں اضافہ ٹرسٹیوں کی تعداد ابتدا سے ستر چلی آتی تھی اور چوں کہ ان کا تقرر حین حیاتی ہوتا تھا اس لئے خواہ جدید ضرورتیں پیدا ہوں یا بعض اصحاب کا اپنے ایثار اور قومی خدمات کے لحاظ سے اس جماعت میں شامل کیا جانا کتنا ہی ضرور ہو اس کے لئے بہت ہی کم موقع ملتا تھا، علاوہ بریں اب کالج کا حلقہ اثر بھی بہت وسیع ہو گیا تھا اس لئے نواب صاحب نے قواعد میں ترمیم کرا کے ایک سو بیس تعداد مقرر کرائی اور مختلف صوبوں کے تعلیم یافتہ اور ہمدرد اصحاب کو منتخب کرایا جس سے اس جماعت کی قوت میں اضافہ ہو گیا

سر سید اور مولوی سمیع اللہ خاں کے اختلافات نے دو فریق قایم کر دئے تھے اور بالآخر دوسرا مخالف فریق کالج کے معاملات سے کلیۃً علٰحدہ ہو گیا تھا اس کے ذی وجاہت و باثر اصحاب اکثر یکے بعد دیگرے اس دنیا سے رخصت ہو چکے تھے تاہم بعض افراد اور بعض کی اولاد موجود تھی نواب وقار الملک نے ان کو معاملات کالج میں شریک کرنے اور ہمدرد بنانے پر بھی توجہ کی حاجی محمد موسیٰ خاں صاحب اس سلسلہ میں لکھتے ہیں کہ

جب خواجہ محمد یوسف[1] صاحب کے فرزند مسٹر عبدالمجید خواجہ بیرسٹرایٹ لا

---

[1] خواجہ صاحب ابتدا سے رفیق کار تھے ان کی خدمات کالج کے دفتر میں ہی نہیں بلکہ کالج کی عمارت پر بھی منقوش ہیں۔

انگلستان سے واپس آگئے اور یہ وہ زمانہ تھا کہ جماعت ٹرسٹیان کا سواد اعظم (مجارٹی) مولوی سمیع اللہ خان صاحب مرحوم اور اُن کی جماعت کا سخت مخالف تھا اس وقت نواب وقار الملک نے دلائل و بُرہان کے ساتھ مجھے جماعت مخالف کا ہمدرد بنا لیا اور حکم دیا کہ میں مسٹر عبد المجید خواجہ کی ٹرسٹی شپ کی تحریک کروں اور میں نے تحریک کی اور وہ چند روز کے بعد ٹرسٹی ہو گئے۔"

سنڈیکیٹ کا قیام اسٹرائک کے تحقیقاتی کمیشن نے ٹرسٹیوں کا ایک سنڈیکیٹ کا قائم کیا جانا بھی تجویز کیا تھا لیکن ہنوز اس کی نوبت نہ آئی تھی، اب سب سے پہلے اس کے قیام پر توجہ کی گئی اور کارروائی کے لئے قواعد وضع کئے گئے مختلف شعبے مختلف ممبروں کو تفویض ہوئے لیکن جب شعبوں کی تقسیم ہوئی تو بعض ممبروں نے کام کا اتنا جوش ظاہر کیا کہ متعدد صیغوں کا بار اپنے ذمہ لے لیا حالاں کہ نواب آنریری سکریٹری نے اُسی وقت تنبیہہ کی کہ کام کی مقدار اور وقت کو ملحوظ رکھا جائے۔ لیکن اس کا کوئی لحاظ نہ کیا گیا اور آخر الامر وہی دقت رونما ہوئی اور دوبارہ جدید تقسیم عمل میں آئی۔

تہذیب دفتر دفتر ابتدا سے بہت ابتر حالت میں تھا کیوں کہ ما سبق جانشینوں کو اس کی ترتیب کا وقت نہ ملا تھا سید محمود (مرحوم) نے اگرچہ سرسید کے زمانہ میں ایک عطیہ بھی اس مقصد کے لئے دیا تھا مگر اس کی نوبت نہ آئی اب نواب آنریری سکریٹری نے بذات خاص توجہ اور محنت سے اس کی تہذیب و

---

۵۱ صاحب زادہ آفتاب احمد خاں بارات لانے کانفرنس کے علاوہ تعلیم تعمیرات اور بورڈنگ ہاؤس کے اور خان بہادر شیخ عبد اللہ صاحب ایڈوکیٹ نے تعلیم نسواں اور سرسید میموریل فنڈ کے علاوہ فنانس کے شعبے اپنے نگرانی میں لئے۔

تنظیم کر دی

کالج اور بورڈنگ کے عام حسابات کا تعلق پرنسپل اور ہیڈ ماسٹر سے تھا جس کی وجہ سے حسابی اُلجھنوں کے علاوہ ان دونوں کا بہترین وقت ضائع ہوتا تھا اس لئے ایک رجسٹرار کا تقرر کر کے اس سے تمام حسابات متعلق کئے گئے۔

کثرت طلبا، ہاسٹلوں کا اضافہ وظائف اور دیگر انتظامات

چوں کہ تمام حصص ہند میں ایم اے او کالج مشہور و ہر دلعزیز ہو گیا تھا اور نوجوان طلبا کے لئے اُس میں ایک زبردست کشش تھی علاوہ بریں غربا کے لئے بھی خاص آسانیاں اور وسائل امداد مُہیا تھے اس لئے نواب محسن الملک کے زمانہ سے ہی سے ہر سال یہ کثرت درخواستیں آتی تھیں، اور پرنسپل اپنی پالیسی کے ماتحت نامنظور کرتے رہتے تھے لیکن اب صورت حال بدل گئی تھی نواب وقار الملک نے فنانشل حالت کے لحاظ سے جدید ہاسٹلوں کا انتظام کیا۔

نئی عمارت کے علاوہ صاحب باغ اور ایک بنگلہ فلر ہاؤس خریدا گیا اور چند مکانات جو کالج کے قریب میں واقع تھے کرایہ پر لئے گئے چنانچہ ۱۲-۱۹۱۱ء کی رپورٹ کے مطابق جملہ تعداد طلبا (۱۱۳۵) تھی اور سات سو درخواستیں مسترد کرنی پڑی تھیں۔

اُسی زمانہ میں ایک ایسا داخلہ ہوا جو نوع بنوع فوائد و برکات کا سرچشمہ ثابت ہوا یعنی علیا حضرت سرکار عالیہ (نور اللہ مرقدہا) فرمانروای بھوپال کے فرزند اصغر حمید اللہ خاں بہادر (ہز ہائی نس افتخار الملک سکندر صولت جی، سی، ایس، آئی، جی، سی، آئی، ای، سی، وی، او فرماں روائے بھوپال) بحیثیت طالب علم کے اپنی قومی درس گاہ میں داخل ہوئے۔

ابتدا سے بانی کالج اور اُن کے رفقاکی توجہ غربا کے لئے وظائف فراہم کرنے پر رہی اور جہاں تک ممکن ہوا سرمایہ جمع کیا گیا اسی مقصد کے لئے ڈیوٹی یعنی انجمن الفرض قائم کی گئی جس کی سعی مشکور کی بدولت ہر سال ہزاروں روپیہ کی رقم ملنے لگی لیکن سالہا سال سے امدادی وظائف کا تعلق بھی پرنسپل سے ہو گیا تھا اور بعض اوقات پرنسپلوں کا برتاؤ ان غریبوں سے توہین آمیز ہو جاتا تھا نواب صاحب اس کو محسوس کرتے تھے اور ۱۹۱۰ء سے کوشش کر رہے تھے کہ انجمن الفرض کے وظائف کو قرض حسنہ کی شکل میں مبدل کر دیا جائے تاکہ مسلمان نوجوان خیرات کے خوگر نہ ہوں اور اُن کی غیرت و حمیت کی حفاظت رہے اور ایک مستقل ذریعہ امداد قائم ہو جائے۔

اسٹراکی کے تحقیقاتی کمیشن نے اس ضرورت کو اور بھی واضح کر دیا تھا اور اس نے سفارش کی تھی کہ وظیفہ کی اصطلاح ترک کر دی جائے اور قرض حسنہ نام رکھا جائے۔

نواب صاحب نے جائزہ لیتے ہی اس پر عمل درآمد شروع کر دیا۔ پرنسپل سے تعلق منقطع کیا گیا اور چند قواعد کے تحت میں باقاعدہ تحریری معاہدہ ہونے لگا۔ اور اب تک وہ ایک مستقل ذریعہ آمدنی و امداد بنا ہوا ہے۔

اس زمانہ میں اگرچہ متعدد فنڈ جاری تھے اور یونیورسٹی کا چندہ بھی شروع ہو گیا تھا لیکن انجمن الفرض کے وفود نہایت کامیاب ہوتے تھے اور اپنے اخلاق و شائستگی سے مسلمانوں کے دلوں میں کالج کی محبت کے نقوش قائم کرتے تھے۔

انجمن الفرض نے اپنا ایک مستقل فنڈ قائم کر دیا تھا اور تجویز یہ تھی کہ قرض حسنہ کی امداد کر کے اس کا سرمایہ اس مقدار کا کر لیا جائے کہ صرف منافعہ ضروریات کو پورا کر سکے لیکن نواب صاحب نے اس تجویز در ائے کی سخت مخالفت کی اور یہ رائے پیش

کہ پبلک جو چندہ دیتی ہے وہ اِس خیال سے نہیں دیتی کہ اس سے ایک مستقل فنڈ قائم کیا جائے اور اس کے منافعہ سے مدد دی جائے بلکہ مقصد یہ ہوتا ہے کہ جو کچھ وہ دے رہے ہیں قوم کے ہونہار بچوں پر صرف کیا جائے جس کے بدون ان کی تکمیل تعلیم نہیں ہو سکتی لہٰذا اگر کالج کے منتظم کالج کے خزانہ میں اس مد کا کچھ روپیہ جمع ہونے کے بعد باوجود کسی مستحق طالب علم کو مدد دینے سے انکار کر دیں تو جائز نہیں۔

چنانچہ اسی اصول پر جس قدر ضرورت ہوئی اور فنڈ میں گنجائش دیکھی طلبار کو امداد دلوائی اور اس کی وجہ سے ایک مرتبہ تو خدام الفرض کے ساتھ سخت کشمکش بھی پیدا ہو گئی لیکن اپنے زمانہ میں اُنہوں نے اس اصول کو ترک نہیں کیا۔

اسی سلسلہ میں فیلوشپ قائم کی تاکہ فارغ التحصیل طلبا میں علمی تحقیقات کا ذوق و شوق پیدا ہو اور وہ اطمینان کے ساتھ اپنی تحقیقات میں مصروف رہیں۔

یہ اسکیم بھی منظور کی گئی کہ جہاں تک مالی حالت کا اقتضا ہو قابل مسلمانوں کو بشرطیکہ وہ کالج میں معاہدہ ملازمت کریں قرض حسنہ دے کر تکمیل تعلیم کے لئے یورپ بھیجا جائے۔ چنانچہ پہلی مرتبہ مسٹر کریم حیدر کو آرٹس کے لئے اور مسٹر ولی محمدؐ کو سائنس کے لئے منتخب کیا گیا۔

اس موقع پر بھی آنریری سکریٹری کو بعض رفقائے کار کی اس ذہنیت کا سخت مقابلہ کرنا پڑا کہ ایسے وظائف کا استحقاق صرف ایم اے او کالج کے ہی طلبا کا رہنا چاہئے ان کے پاس اس ذہنیت کا جواب یہ تھا کہ

> جب ہم نے قوم کے فائدہ کی غرض سے قوم سے مدد لے کر کالج قائم کیا ہے نہ یہ کہ علی گڑھ کی زمین یا یہاں کی اینٹ پتھر کی حرمت کے لحاظ سے تو اگر کسی اور کالج کا مسلمان طالب علم زیادہ لائق میسر آتا ہو تو کیوں اس کو ہم غیر سمجھیں البتہ ایک قابلیت کے دو شخص ہمارے

سامنے ہوں ایک ہمارے کالج کا اور دوسرا کسی اور کالج کا تو اس وقت
ہم ضرور اپنے کالج کے شخص کو ترجیح دیں گے۔"

چنانچہ وہ غالب آئے اور ہر لائق تر مسلمان خواہ وہ کسی کالج کا ہو مستحق سمجھا گیا۔

ان وظائف کے علاوہ انجینیری اور ڈاکٹری کے وظائف بھی قایم و جاری کئے گئے نیز نوجوان گریجویٹوں کے لئے جو مذہبی تعلیم کی تکمیل کریں ایک خاص وظیفہ منظور کیا گیا۔

تعداد طلبا کی زیادتی کے ساتھ اسٹاف کے ممبروں میں بھی حسب ضرورت اضافہ کیا گیا پروفیسروں کی گریڈڈ اسکیم منظور کی گئی اور یوریپین اسٹاف کی تعریف میں ہندوستانی پروفیسروں کو شامل کیا گیا جنھوں نے یورپ میں تعلیم پائی ہو اسکول کے ماسٹروں کو تین سال تک اسکول میں رہنے کے معاہدہ پر ٹریننگ کالج میں بھیجنے کا انتظام کیا گیا اور اُن کے گریڈ بھی معین کئے گئے۔

سائنس کی تعلیم کی ضرورت و اہمیت کے لحاظ سے ۱۹۱۱ء میں پورے انتظامات کے ساتھ ایم۔ ایس۔ سی تک ترقی دے کر الحاق منظور کرایا گیا۔

اگرچہ ایک شفاخانہ ہاسپٹل اسسٹنٹ کے چارج میں موجود تھا اور عام نگرانی علی گڑھ کے سول سرجن کی تھی جس کو الاؤنس ملتا تھا مگر تعداد طلبا کی لحاظ سے یہ انتظام کافی نہ تھا آنریری سکریٹری نے اس انتظام کی توسیع و عمدگی پر توجہ کی اور اسی سلسلہ میں ایک یونانی مطب بھی قائم کیا۔

تجویز کے اس دوسرے حصہ پر سخت اختلاف ہوا اور خاص کر صاحبزادہ آفتاب احمد خاں نے سخت اعتراض کئے کہ دو مقابل طریق علاج کا اجرا خلاف مصلحت ہوگا حتیٰ کہ اس سے طلبا میں باہمی اختلاف رائے پر شورش کا خطرہ

ہوسکتا ہے اور اگر ایک علاج سے آرام نہ ہو تو دوسرے طریقہ کی طرف رجوع کیا جائے گا اور اس صورت میں ڈاکٹر یا طبیب کوئی بھی اپنے کو ذمہ دار تصوّر نہ کرے گا۔

آنریری سکریٹری نے ان اعتراضات کے مُسکت جواب دئے اور ڈاکٹر و طبیب کی ذمہ داری کے متعلّق لکھا کہ:۔

"میں معافی چاہتا ہوں یہ عرض کرنے کی ذمہ داری کا مسئلہ میری سمجھ میں اچھی طرح نہیں آیا آج تو کوئی یونانی مطب کالج میں نہیں ہے اور ڈاکٹری ہی طریقہ کا علاج ہو رہا ہے اور میری آنکھوں کے سامنے تھوڑے ہی دنوں میں تین ایسی موتیں واقع ہوئی ہیں کہ ان کا رنج شاید کبھی میرے دل سے نہ جاوے گا۔ ایک نوجوان نے زہر کھا کر خودکشی کی اور دو معصوم بچے ہیضہ کے نذر ہوئے اب میں دریافت کرتا ہوں کہ ان موتوں کی ذمہ داری کس پر ہے ....

..... موت حیات سب خداوند تعالیٰ کے اختیار میں ہے دونوں قسم کے طریق علاج میں مریض اچھے بھی ہوتے ہیں اور مرتے بھی ہیں ہمارا کام یہ ہے کہ حتی الامکان کافی احتیاط سے کام لیں یہی ہماری ذمہ داری ہے اور بس انھیں مذکورہ موتوں سے متاثر ہو کر میں نے مصمم قصد کر لیا تھا کہ آیندہ بجٹ کی تیاری کے وقت ایک اسسٹنٹ سرجن کا تقرر کالج میں ضرور کیا جائے۔ اور پبلک کے عام رجحان اور طلبا کے راحت و اطمینان خاطر کے خیال سے ایک یونانی مطب کا بھی کالج میں قائم کر دینا ہر طرح مناسب اور ضروری خیال کیا گیا ہے۔

بالآخر ٹرسٹیوں کی اکثریت نے نواب صاحب کے ساتھ اتفاق کیا ایک طبیب کا تقرر اور مطب یونانی کا اجرا عمل میں آیا اور ایک اسسٹنٹ سرجن بھی مقرر ہوا۔

مذہبی تربیت و تعلیم آنریری سکریٹری جس طرح خود اعمال مذہب کے پابند اور اخلاق حسنہ کے نمونہ تھے اسی طرح ان کی خواہش تھی کہ تعلیم یافتہ مسلمان نوجوانوں میں بھی وہ یہی عمل اور خوبی دیکھیں سمہ میں جب کہ کچھ مدت کے لئے بورڈنگ ہاؤس کی نگرانی ان کے سپرد تھی ان امور پر زیادہ توجہ رکھتے تھے ان کی کوشش سے دینیات کے وظائف و انعام بھی مقرر ہوئے تھے، اب کہ زمام اختیار ان کے ہاتھ میں آئی تو پوری ذمہ داری کے ساتھ ان امور پر توجہ کی، جائزہ لینے کے وقت اُنھوں نے نہایت سختی سے تنبیہ کی کہ طلباء مذہبی معاملات میں سستی کا اظہار کریں یہ تنبیہ موثر ہوئی اور کچھ عرصہ بعد طلبا کی مذہبی حالت پر ایک جلسہ عام میں اظہار اطمینان کیا اور نمازمیں غیر حاضری پر جرمانہ جو سالہا سال سے بطور قاعدہ جاری تھا منسوخ کردیا کیوں کہ ان کے نزدیک یہ جرمانہ نماز کا استہزا تھا مگر یہ بھی جتا دیا کہ جو پابند نماز نہ ہوگا اس کو کالج سے علحدہ ہونا پڑے گا وہ اس تنبیہ کے ساتھ موعظہ حسنہ سے کام لیتے اور طلبا کے مذہبی جذبات سے بھی اپیل کرتے رہتے تھے، ایک جلسہ میں اُنھوں نے دوران تقریر میں کہا تھا کہ:۔

> آپ جانتے ہیں کہ زمانہ تغیر پذیر ہے پرانوں کی جگہ نئے آتے ہیں قومی عمارت کے پُرانے ستون رخصت ہوتے جاتے ہیں اب یہ بار آپ کی کاندھوں کو اُٹھانا پڑے گا یہ زمانہ آپ کی تحصیل کا ہے یہی وہ زمانہ ہے کہ آپ اُس آیندہ وقت کے لئے تیار ہوں کوشش کیجئے اور سخت کوشش

کہ آپ مسلمانوں کے لئے اعلیٰ درجہ کا نمونہ ہوں وہ روش اختیار کیجئے
ایسے پاک وصاف مذہبی طریقہ پر جس سے کہ مسلمان آپ پر پورا بھروسہ
رکھیں حقیقت میں آپ کسی طرح قومی لیڈر نہیں ہو سکتے اگر اسلامی شعار
کے پابند نہیں ہیں یہ لال لال ٹوپیاں کالے کالے کوٹ پبلک جلسوں
میں کانفرنس کے پنڈال میں بہت دکھائی دیں اور کس قدر جائے
افسوس ہے کہ اگر ان کی تعداد مسجد میں کم ہو الفرض الفرض کی پکار ہو تو
بہت ہے لیکن سب سے مقدم جو فرض مسجد کا ہے وہی نہوا تو سب
ہیچ ہے۔

چونکہ طلبا کی مذہبی پابندی کا دارومدار اساتذہ اور پراکٹوریل اسٹاف کی حالت پر
ہوتا ہے اس لئے اُنہوں نے شروع سے اس بات پر زور دیا تھا کہ :۔

اگر خود مسلمان پروفیسر اور پراکٹر وسب پراکٹر اپنے مذہبی و اخلاقی چال
چلن کا نمونہ طلبا کے سامنے عمدہ پیش نہ کرینگے تو وہ طلبا کے حق میں سم قاتل
ہوگا اور علیٰ ہذا القیاس یہی نتیجہ خود ٹرسٹیوں اور دوسرے افسروں
کی مذہبی بے پروائی سے پیدا ہوگا جس کا اظہار ان کی طرف سے کالج
کمپونڈ میں ہو۔ یہ کہدینا بہت آسان بات ہے کہ ناظم امور دینیات
کو رفق و ملائمت کے ساتھ اپنا اثر طلباء کے دل میں بٹھلانا چاہئے
لیکن جب طلبا کے گرد و پیش دوسرے موثر نظارے اس کے خلاف
موجود ہوں تو کوئی اُمید نہیں ہو سکتی کہ ان بزرگان دین کے رفق و
ملائمت سے کچھ کام نکلے۔

اب اُنہوں نے قاعدہ کی رو سے ہر ایک سب پراکٹر کے لئے نماز میں شرکت
لازم کردی اور مانیٹروں پر بھی قیود عائد کیں طلبا کی سہولیت کا بھی لحاظ

رکھا اور چوں کہ رقبہ کالج کی وسعت کے سبب سے بورڈنگ ہاؤس مسجد سے فاصلہ پر بنانے پڑے تھے اس لئے جدید پیش اماموں کا تقرر کیا کہ ہر بورڈنگ ہاؤس میں نماز باجماعت ادا ہوسکے۔

تعلیم دینیات کے لئے اساتذہ میں اضافہ کیا اور امتحان کے قاعدہ کو اتنا سخت کر دیا کہ طلبا کو کامیابی حاصل کئے بغیر چارہ نہ رہا۔ ایک طالب علم کا داخلہ محض اس بنا پر رکوا دیا کہ اس کے باپ نے ہدایت کی تھی کہ اس پر نماز اور روزہ کی تاکید نہ کی جاے، اس میں کوئی شک نہیں کہ خود اُن کی مذہبی زندگی اور اُن کے اخلاق ایک موثر نمونہ تھے جس سے طلبا میں غیر محسوس طور پر مذہبی پابندی اور مذہبی شعائر کا احترام پیدا ہوگیا تھا۔ نیز اُن کی سادہ زندگی و طرز معاشرت نے فیشن پر بھی اثر ڈالا۔

غیر کافی انتظام کا اعتراف باایں ہمہ وہ اس حالت پر مطمئن نہ تھے اور اس بات کو اُنھوں نے کبھی پوشیدہ بھی نہیں رکھا اور ایک موقع پر صاف لکھ دیا کہ:۔

> موجودہ حالت میں اس پر اطمینان ظاہر کرنا پبلک کو دُھوکا دینا ہے
> ... میں مقر ہوں کہ نصاب تعلیم دینیات کافی نہیں ہے اور بہت کچھ ناکافی ہے اور ضرور اس میں ایسی توسیع ہونی چاہئے جس سے طلبا میں دل چسپی پیدا ہو عمدہ اخلاق پیدا ہوں اور فلسفہ کے ذریعہ سے مذہبی احکام وعقائد و اخلاق حسنہ طلبا کے دل و دماغ میں سما جائیں یہ سچ ہے کہ میرے وقت میں کوئی معتد بہ ترقی ان لحاظات سے نہیں ہوئی۔

ایک اور موقع پر قوم کی تعلیمی معاملات میں بے پروائی کی شکایت پر عام تعلیم یافتہ طبقہ کی مذہبی بے پروائی کے متعلق اظہار خیال و افسوس کرتے ہوئے لکھا کہ

"آج بھی جو مشکل مجھکو بہ حیثیت آنریری سکریٹری کالج قوم کو متوجہ کرنے میں پیش آتی ہے وہ زیادہ تر اپنے کالج کے نوجوان طلبا کی طرف سے ہے جن کو میں کامل اطمینان کے ساتھ کالج کے بہترین نمونہ کے طور پر قوم کے سامنے پیش کرنے سے قاصر بلکہ شرمندہ ہوں۔

لعل اللہ یحدث بعد ذالك امرا۔ قوم کو یہ الزام دینا بہت آسان ہے اور الزامی جوابوں سے ہر کوئی اپنا دل خوش کر لینا چاہتا ہے۔ لیکن کسی وقت تو ہم کو اپنی غلطیوں پر بھی غور کرنا چاہئے ان نوجوانوں میں سے اگر کسی نے درحقیقت یہ سمجھ لیا ہے کہ نماز روزہ میں جو غفلت ہوتی ہے اس کے مواخذہ میں خدا کے سامنے تھوڑا بہت سرخ رو ہونے کا ذریعہ ہمارے پاس یہ ہے کہ ہم قومی نیک کاموں کی بنیاد ڈال رہے ہیں تو وہ حضرات یقین رکھیں کہ یہ محض ایک شیطانی وسوسہ ہے اور اس سے توبہ کریں اور خداوند تعالیٰ سے اپنے گناہوں کی معافی چاہیں وہ ارحم الرحمین ہے اس کی رحمت وسیع ہے مگر اس کو سبق نہ پڑھائیں وہ تمھارے ان بیہودہ سبقوں کا محتاج نہیں ہے وہ اپنی مصلحتوں کو آپ ہی خوب جانتا ہے صحابہ رضی اللہ تعالیٰ عنہم اجمعین سے زیادہ آپ حضرات قومی نیک کاموں کی بنیادیں قایم کرنے والے نہیں ہیں کس کو ان میں سے اس کے معاوضہ میں نماز معاف ہوئی تھی جس قدر معافیاں نماز میں ہو سکتی تھیں وہ شرع میں خود موجود ہیں...... لیکن آپ تو اپنے آپ کو دنیا بھر سے زیادہ سمجھنے پر بھی نماز روزے سے پہلو تہی کرتے ہیں کہ مسلمان آپ کو عزیز رکھیں، ایں خیال است و محال است و جنوں، آپ کیا مسلمانوں کو درست کریں گے پہلے اپنے آپ کو درست کر لو ڈیوٹی پر جان دیتے ہیں

لیکن فرض کے معنی بھی تو ڈیوٹی کے ہیں ؛ فاین تذھبون ۔

کالج کی مرکزیت

نواب محسن الملک نے اپنے زمانہ میں پوری کوشش کی تھی کہ کالج ایک قومی مرکز بن جائے اور بڑی حد تک وہ کامیاب ہوئے رؤسا وامرا کو کالج کے ساتھ دلچسپی پیدا ہوگئی نواب وقار الملک نے اس دلچسپی اور خیال کو درجہ کمال تک پہنچایا اور ہر طبقہ و فرقہ کے مسلمانوں میں ایک خاص گرویدگی ہوگئی او بلا اختلاف وہ صحیح معنوں میں قومی مرکز بن گیا۔

اِس کے متعلق اُن کا اصول کار یہ تھا کہ وہ پبلک سے ایک عہدہ دار کی حیثیت سے نہیں بلکہ ایک خادمِ قوم کے طور پر برتاؤ کرتے تھے نکتہ چینی اور اعتراض کو خندہ پیشانی سے سُنتے اپنی غلطی ہوتی تو آزادی سے اعتراف کرتے یا دلائل اور اظہارِ واقعات سے معترضین کو مطمئن کر دیتے۔ مراسلات و تحریرات میں مخاطب کے احترام کو بدرجہ غایت ملحوظ رکھتے معمولی تحریر بھی حفظِ مراتب کا نمونہ ہوتی تھیں۔ اسسٹنٹوں کو ہدایت تھی کہ یہ قومی خدمت کا دفتر ہے اس میں شانِ تحکّم نہیں آنی چاہیئے۔

انھوں نے اس اصول اور پبلک سے تعلقات کے متعلق ایک موقع پر یہ بیان کیا تھا کہ :۔

”پھر کالج کا سکریٹری ایک ایسا مرکز ہے جس کا محیط کل ہندوستان ہے اور اس لحاظ سے کالج کے سکریٹری کے تعلقات کل ہندوستان سے قائم ہیں۔ بسا اوقات یہ ہوتا ہے کہ لوگوں کی جن خواہشات کو پورا نہیں کیا جا سکتا اس سے معذوری کا اظہار کرنا ہوتا ہے مگر اس طرح کہ خالی انکار نہیں کیا جاتا بلکہ اس انکار کا فلسفہ بھی بتانا ہوتا ہے اور اس لئے تحریروں میں بسا اوقات طوالت سے کام لینا پڑتا ہے تاکہ مخاطب کے دل پر کوئی تکلیف دہ اثر پیدا نہ ہو اور کالج کے تعلقات قوم کے ساتھ خوشگوار حالت میں رہیں۔ یہ ہی لحاظ

مجھ کو ملاقاتوں کے وقت رکھنا پڑتا ہے جو کبھی طلبا کے ساتھ ہوتی ہیں اور کبھی اسٹاف کے اور کبھی دیگر افراد قوم کے ساتھ۔

یہی وہ اصول اور طریقہ کار تھا کہ جس سے کالج کو زبردست مرکزیت حاصل ہوگئی انھوں نے اس امر کی بھی بہت کوشش کی کہ علماؤ مشائخ وغیرہ کو بھی اس قومی انسٹیٹیوشن کی طرف توجہ ہو اور وہ مغائرت جو ابتدا سے اس طبقہ میں قائم ہے دُور ہو جائے۔

اس کوشش میں بھی وہ کامیاب ہوئے اور اس کی سب سے بڑی وجہ ان کی خود مذہبی زندگی تھی جو ان کے پیشروؤں سے خاص امتیاز رکھتی تھی۔

چنانچہ مولانا اشرف علی صاحب تھانوی کالج میں تشریف لائے اور انھوں نے وعظ بھی کہا۔

مولانا احمد میاں صاحب نے بھی جو مولانا شاہ فضل الرحمان صاحب رحمۃ اللہ علیہ (گنج مرادآبادی) کے سجادہ نشین تھے کالج کا ملاحظہ کیا اور مولانا عبد الباری صاحب رحمۃ اللہ علیہ جو فرنگی محل کے انشہور اور بااثر اور روشن خیال علما میں سے تھے جنھوں نے اپنے زمانہ کی سیاسیات پر بھی اثر ڈالا تھا کالج کے دلی ہمدرد بن گئے اور اپنے صاحبزادوں کی تعلیم کے لئے علی گڈھ کو ہی انتخاب کیا۔

مولانا عبد الباریؒ فرنگی محلی کا ایک خط

اس موقع پر ہم مولاناؒ کے ایک خط کا اقتباس پیش کرتے ہیں جو انھوں نے اپنے ایک دوست کو لکھا تھا اور جس میں قدیم مغائرت کے اسباب پر روشنی ڈال کر نواب محسن الملک اور نواب وقار الملک پر ایک مختصر تبصرہ کیا ہے:۔

"یہ امر ظاہر ہے کہ سرسید کے ساتھ ہم لوگ نہ تو معاندانہ پیش آئے نہ مویدانہ پیش آئے۔ ان کی مذہبی فروگذاشت سے زیادہ ہمارے اکابر کو اُن کی سیاست سے بیگانگت تھی اُن کے استقلال طبع کے باعث جو خود رائی تھی اس کا تدارک ناممکن

تھا اس وجہ سے اکثر مواقع پر تنافر ہو جاتا تھا اس کے اندفاع میں نواب سید مہدی علی خاں صاحب کے ایسے صلح جو اور متانت مزاج شخص کی ضرورت تھی اور خدا کی حکمت نے ان کو انتخاب کیا تھا مگر دفع مغائرت عامہ کافی نہ تھی بلکہ ان امور کی اصلاح ضرور تھی کہ جو سر سید کی صلابت طبع کے باعث اُن کے مفید کاموں میں حارج ہوتی تھی۔ اس کے اصلاح کے واسطے قدرت نے وقار الملک ایسے فرد کو ہمیشہ سے سر سید کے گروہ میں منتخب کر رکھا تھا۔ اُن کی بے لوث کوشش نے سوائے اُس حُریت مذہبی کے جس کو زمانہ و حکومت و تعلیم انگریزی سے نشو و نما ہے مذہبی خود داری کی ایک رُوح پھونک دی جس کے مٹنے کا افسوس ہمارے اکابر کو سر سیّد کے طریقۂ عمل کے نتائج پر غور کرنے سے تھا۔ اس حیاۃ ملّی کا مسیح وقار الملک ہی جیسا شخص ہونا چاہیئے جس سے مُردہ دلوں میں اور زندہ جاوید لوگوں میں امتیاز ہو گیا......

....

کالج کی مرکزی حیثیت کا سرکاری اعتراف

اگرچہ ایم اے او کالج ابتدا سے ایک مرکزی ادارہ تھا اور اس میں صوبۂ متحدہ کے علاوہ دوسرے مقامات کے طلبہ بھی داخل ہوتے رہتے تھے لیکن ۱۹۰۰ء تک اس کا حلقۂ اثر چنداں وسیع نہ تھا۔

نواب محسن الملک نے اس کو تمام ہندوستان میں وسعت دی اور ہر سال ہر ایک صوبہ کے طلبا معقول تعداد میں آنے لگے اور روز بروز کالج کی مرکزی حیثیت وسیع و مضبوط ہوتی رہی۔

نواب وقار الملک نے جائزہ لینے کے پہلے ہی سال نینی تال میں ہز آنر سر

جان ہیوٹ سے ملاقات کے دوران میں کالج کی ضرورتوں پر توجہ دلاتے ہوئے دیگر صوبوں کی گورنمنٹوں سے بھی امداد کا استحقاق پیش کیا اور یہ مطالبہ کیا کہ چونکہ ایم اے او کالج کو آل انڈیا حیثیت حاصل ہے لہذا امپریئل گورنمنٹ سے بھی مدد ملنی چاہیئے۔ سر جان ہیوٹ نے اس مطالبہ سے ہمدردی ظاہر کی اور دوسرے سال انھوں نے کالج وزٹ کے موقع پر ایڈریس کے جواب میں اعتراف کیا کہ :۔

"اگرچہ آپ کا کالج اس صوبہ میں واقع ہے اور اس کے تعلقات اسی صوبہ کی گورنمنٹ سے ہیں لیکن پراونشل تعلیم گاہ ہونے کے مقابلہ میں امپریئل تعلیم گاہ کہلانے کا زیادہ مستحق ہے۔"

اس کے بعد وائسرائے کی خدمت میں ایک میموریل بھیجا گیا جس میں پراونشل اور امپریئل گورنمنٹوں سے مالی امداد کے علاوہ دیگر صوبجات کے طلبا کو ان صوبوں کے سرکاری وظائف سے متمتع ہونے کا استحقاق اور لاگریجویٹوں کو دیگر صوبوں میں پریکٹس کی اجازت کی درخواست تھی اور اس سلسلہ میں ایک ڈپوٹیشن کی باریابی کی اجازت بھی چاہی گئی تھی۔

یہ درخواست جب پیش ہوئی تو میموریل کے ساتھ پوری ہمدردی ظاہر کی گئی لیکن ڈپوٹیشن کی حاضری غیر ضروری سمجھی گئی۔

اسی سلسلہ میں ڈائرکٹر سررشتہ تعلیم نے علی گڑھ آکر اس مسئلہ پر گفتگو کی اور یہ مشورہ دیا کہ میموریل میں اس قدر ترمیم کر دی جائے کہ گورنمنٹ ہند اور صرف صوبہ متحدہ کی گورنمنٹ سے امداد طلب کی جائے۔ چونکہ اس وقت ہر ایک صوبہ میں اسلامی کالج قائم کئے جانے کا مسئلہ زیر غور تھا اور اس صورت میں دوسرے صوبوں کی گورنمنٹوں کو اپنے اپنے صوبہ میں اُن کالجوں کو مالی مدد دینی لازمی تھی اس لئے ڈائرکٹر کے مشورہ کو قبول کرنا اور صرف امپریئل گورنمنٹ سے مدد مانگنا مناسب و کافی سمجھا گیا۔

اس ترمیم پر آنریری سکریٹری کو اپنے رفقائے کار کے مقابلہ میں جو اس کے خلاف تھے بہت جد وجہد کرنی پڑی مگر آخر الامر انھوں نے اتفاق رائے حاصل کرلیا اور میموریل میں ترمیم کردی گئی۔

گورنمنٹ نے میموریل سے ہمدردی ظاہر کی اور اس امر کو تسلیم کیا کہ:۔

"ہندوستان کے مسلمانوں کی اعلیٰ تعلیم کے لئے فی زمانہ یہ کالج سب سے بڑی تعلیم گاہ ہے اور اس حیثیت سے جو خدمات انجام دیتا ہے وہ کسی ایک صوبہ یا علاقہ تک محدود نہیں۔"

مگر فنانشل حالت کے لحاظ سے گرانٹ دینے سے مجبوری کا اظہار کیا اور ساتھ ہی دوسرے صوبوں کے اسلامی کالجوں کے متعلق لکھا کہ:۔

"گورنمنٹ ہند مختلف صوبجات کی معمولی ضروریات کو علی گڈھ کے انداز پہ وہاں لوکل کالجوں کے قیام سے پورا ہوتے ہوئے دیکھنا زیادہ پسند کرتی ہے اور اس کو امید ہے کہ اس قسم کے کالجوں کے قیام کی توقع امید معقول کے دائرہ سے باہر نہیں ہے مع ہذا گورنمنٹ تسلیم کرتی ہے کہ علی گڈھ فارغ التحصیل مسلمان گریجویٹوں کی تعلیم کا بخوبی مرکز رہ سکتا ہے اور یہ کہ اس صورت میں بھی اس کی مسلمانی حیثیت سے (امپریل کیریکٹر) قائم رہے گا۔

دیگر امور جو میموریل میں مندرج تھے اُن کی نسبت یہ جواب ملا کہ:۔

"دیگر سوالات جن کا ٹرسٹیوں نے تذکرہ کیا ہے ہائی کورٹوں یونیورسٹیوں اور لوکل گورنمنٹ کے تعلق کے ہیں، تاہم خاص صورتوں میں جو دشواریاں پیش آئیں اُن کے متعلق عرضداشتوں پر غور کرنے کے لئے گورنمنٹ ہند آمادہ رہے گی۔"

اگرچہ اس جواب میں شاہی امداد کی جانب سے ایک قسم کی ناامیدی تھی لیکن آنریری سکریٹری نے اپنی کوشش جاری رکھی انھوں نے شملہ میں وایسرائے اور ارکانِ حکومت سے ملاقاتیں کیں اور کالج کی امپیریل حیثیت اور خزانۂ عامرہ سے امداد دیئے جانے پر توجہ دلائی اور اگرچہ اس سال کوئی مدد نہ مل سکی لیکن ۱۱-۱۹۱۲ء کے امپیریل بجٹ سے جو رقم تعلیمی امداد کے لئے صوبوں کو عطا کی جانی تجویز ہوئی اس میں ایم اے او کالج کا حصہ بھی رکھا گیا اور دو لاکھ روپے عطا ہوئے۔

طلباء کے سیاسی وملّی جذبات کا نشوونما

ایم اے او کالج اگرچہ ابتدا سے نیم سیاسی ادارہ تھا لیکن یہ خاص سیاست حکومت کی وفاداری اور انگریزوں کے ساتھ دوستانہ تعلقات پر محتوی تھی اور طلبا کو کسی قسم کی ایسی سیاست میں بحث ومباحثہ کی اجازت نہ تھی جس میں حکومت سے اختلاف یا مطالبۂ حقوق کا شائبہ بھی ہو، نواب وقار الملک کا سب سے اہم بالشان کارنامہ یہ تھا کہ انھوں نے طلبا کے سامنے سیاسی مباحث کا دروازہ کھولا اور ان میں جذبات و احساساتِ ملّی پیدا کئے۔

دسمبر ۱۹۰۶ء میں مسلم لیگ قائم کرنے کے بعد مارچ ۱۹۰۷ء میں سب سے پہلے علیگڈھ آکر طلبا کے ایک بڑے مجمع میں مسلمانانِ ہند کی سیاست پر ایک نہایت مؤثر اور معنی خیز تقریر کی۔ اِس تقریر میں انھوں نے ہندوستان میں مسلمانوں کی پوزیشن کا تذکرہ کیا اور اُن نتائج کو جو مسلمانوں نے اپنی تنظیم سیاسی سے غفلت کے باعث برداشت کئے بیان کرتے ہوئے کہا کہ

> اب تک ہمارا خاموش رہنا اور اپنی پولیٹکل مجلس نہ بنانا اور اپنے قومی نفع ونقصان پر غور نہ کرنا اور تعلیم یافتوں کو آزادی کے ساتھ ان مسائل پر بحث کرنے کا موقع نہ دینا جن پر ان کی قوم کی بقا وثبات کا دارومدار ہے ایک ایسی حالت تھی کہ جس کی وجہ سے ہم کو بہت کچھ نقصان اُٹھانا پڑا ہے اور بدقسمتی سے اِس خاموش

پالیسی نے ہمارے بہت سے حقوق غصب کر ڈالے ہیں۔"

اِس سلسلہ میں آل انڈیا مسلم لیگ کی تاسیس اور اسکی اہمیّت ظاہر کر کے یہ غلط فہمی دُور کی کہ لیگ اور کانگریس میں کوئی رقابت ہوگی انھوں نے صاف طور پر واضح کیا کہ ہم مسلمان کانگریس کے دشمن نہیں ہیں گو اہل کانگریس کے ساتھ ہم کو رائے کا اختلاف ہو مگر مخالفت ہرگز نہیں ہے۔ ہم صرف یہ چاہتے ہیں کہ اپنی قوم کو اس نقصان سے محفوظ رکھیں جس کا اس کو اندیشہ ہے اور ان کے خاص حقوق کو تلف نہ ہونے دیں خصوصیات کو ملیامیٹ ہونے سے بچا دیں اور ان کی مستقل اور بالذات ہستی کو معدوم نہ ہونے دیں۔

پھر مجارٹی (اکثریت) کی حکومت اور مینارٹی (اقلیت) کی محکومی وغیرہ پر بحث کر کے طریقۂ قائمقامی میں مسلمانوں کے خاص حقوق کے محفوظ کئے جانے کی ضرورت پر زور دیا اور سیاسی حقوق سے استفادہ کے متعلق کہا کہ "ہماری اور ان کی حالت اس وقت بالکل ایک ڈھلواں سطح کی ہے جس کے بالائی حصّہ میں مسلمانوں کو جگہ ملی ہے جب اس پر پانی برستا ہے تو سارا پانی بہ کر نیچے چلا جاتا ہے اور اوپر کچھ نہیں رہتا اسی طرح گورنمنٹ رعایا کو جو حقوق بخشتی ہے اس میں چونکہ کوئی حفاظت مسلمانوں کی نہیں ہوتی لہذا وہ بھی سب ہماری دوسرے ابنائے وطن کے حصّے میں چلے جاتے ہیں اور ہم دیکھتے کے دیکھتے رہ جاتے ہیں۔

آخر میں کہا کہ :-

آج جب کہ انگریزی حکومت کا زبردست ہاتھ اپنی مختلف رعایا کے حقوق کی یکساں حفاظت کر رہا ہے جو حالت ہماری ہو رہی ہے وہ ظاہر ہے کہ کہیں ہمارے ساتھ ممبریوں کا جھگڑا ہے کہیں گاؤ کشی کا قصہ ہے کسی طرح ہم کو چین ہی نہیں ملتا تو خدانخواستہ اگر کسی دن ہم اپنے اِن ابنائے وطن کے محکوم ہو جائیں تو اسوقت جو کچھ ہماری حالت ہوسکتی ہے وہ محتاجِ بیان نہیں ہے۔

عزیز نوجوانو۔ ایک زمانہ تھا کہ بازاروں میں منادی کی جاتی تھی خلق

خدا کی ملک بادشاہ کا حکم کمپنی بہادر کا" اس زمانہ میں ایک برائے نام مسلمان بادشاہ
دہلی میں موجود تھا ہندوستان کے عام آدمی یہی خیال کرتے تھے کہ بادشاہ سے
دہلی کا بادشاہ اور کمپنی سے انگریز مراد ہیں۔ ہندو پلٹنوں نے بھی جب بغاوت کی
تو انھوں نے بھی دہلی کا راستہ لیا، مگر اب وہ زمانہ نہیں رہا جب کہ خلیل خاں
فاختہ مارتے تھے تاریخ کا ورق الٹ گیا مسلمانوں کی حکومت جا چکی اُن
کے جاہ وجلال کا زمانہ رخصت ہو چکا حکومت کے ساتھ علم اور دولت نے بھی
ہماری قوم سے منہ پھیر لیا، اس وقت حالت یہ ہے کہ ہماری طاقت پژمردہ ہے
ہم پر جہالت کی گھٹا چھائی ہوئی ہے، ہمارے افراد میں اتفاق اور اتحاد کا سلسلہ
نہیں ہے ہماری قوم کے اکثر آدمی نان شبینہ کے محتاج ہیں، غیر قومیں جو ہندوستان
میں پھیلی ہوئی ہیں ہمارے حقوق ہضم کرنے کے لئے مُنہ کھول رہی ہیں، نہ دیگر
ابنائے وطن کے مقابلہ میں ہماری مردم شماری زیادہ ہے نہ ہم کو تعلیم میں ان سے
کوئی نسبت ہی نہ ہم دولت میں ان کا مقابلہ کرسکتے ہیں نہ صنعت وحرفت میں ہمارا
کوئی حصہ ہے اس صورت میں اگر ہم ہندوستان کی کسی زبردست اور طاقتور قوم
کی تقلید کرنا چاہیں تو سمجھ لینا چاہیئے کہ یہ ہماری شامتِ اعمال ہے کیونکہ تمام چیزیں
کھو کر صرف ایک سہارا ہمارے لئے باقی رہ گیا ہے اور وہ برٹش گورنمنٹ کی حمایت
اور حفاظت کا سہارا ہے، نہایت بدبختی ہوگی اگر ہم اس سہارے کو بھی کھو بیٹھیں
اور خدا کی اُن برکتوں اور رحمتوں کی بھی قدر نہ کریں جو اس گورنمنٹ کے سایہ میں ہم کو حاصل ہیں
ہم کو سمجھ لینا چاہیئے کہ اس مبارک گورنمنٹ کے وجود کو ہندوستان میں خدانخواستہ کوئی صدمہ
پہنچے یا کسی اور وجہ سے اس کو ضعف ہو جائے تو وہ قوم جس کی نسبت بمقابلہ دیگر قوم کے
ایک اور پانچ کی ہے کبھی سرسبز نہیں رہ سکتی اور اس کو اپنی ترقی اور کامیابی کے لئے
کوئی چانس نہیں ملے گا۔"

اس تقریر کے چند مہینے بعد جب وہ آنریری سکریٹری منتخب ہو گئے تو انھوں نے طلبا کو ہدایت کی کہ یونین میں اگر کوئی سیاسی مضمون زیر بحث ہو تو آزادی کے ساتھ اپنے اصلی خیالات ظاہر کریں مگر چونکہ اس زمانہ میں سیاسی شورشیں برپا تھیں اس آزادی سے ہی خواہانِ کالج کے ایک طبقہ میں سخت تردد پیدا ہو گیا اور بالآخر اس قسم کا مباحثہ پرائیوٹ صحبتوں تک محدود رکھنا پڑا نواب وقارالملک نے اس ہدایت کے متعلق اپنے ایک مفصل بیان میں توضیحاً کہا تھا کہ "اگر کانوں اور آنکھوں پر مُہر کی جاسکتی ہے تو زبان پر بھی مُہر لگانا شاید جائز ہو سکتا لیکن جب کان کُھلے ہوئے ہیں اور آنکھیں کُھلی ہوئی ہیں اور اُن کے ذریعہ سے مختلف خیالات دماغ میں پہنچتے ہیں تو ان کی زبان کو بند رکھنا سخت مضر ہوگا"

لیکن اس زمانہ میں طرابلس و بلقان کے واقعات نے حسیاتِ اسلامی کی بیداری میں قدرتی طور پر زبردست کام کیا، مسلمانوں میں جو عام بے چینی پھیلی طلبا بھی اس سے متاثر ہوئے اور انھوں نے ترکی یتیموں بیواؤں اور مصیبت زدوں کی امداد کے لئے ایک فنڈ کھولا اور غیر معمولی کھانے اور ایک وقت کے گوشت کو ترک کر کے اس کی بچت اس میں داخل کی روزے رکھے اور گریہ و زاری سے دُعائیں کیں، اگرچہ یہ ایثار و ہمدردی اسی طبقہ میں پسندیدہ و مقبول نہ تھی لیکن خود نواب وقارالملک ان کے ساتھ شریک تھے اس لئے اعتراض کی جرأت نہ ہو سکی، یہ چندہ حکومت ہی کے ذریعہ سے ترکی وزیر اعظم کے پاس بھیجا گیا۔

نواب وقارالملک کا عہد اگرچہ ساڑھے چار سال ہی رہا لیکن طلبا میں ایک لہر پیدا ہو گئی جو روز بروز بڑھتی ہی رہی۔

اغراض کالج کے لئے دَورے

ضعیف العمری و عوارض لاحقہ کے باوجود نواب وقارالملک نے جابجا متعدد دَورے کئے رؤسا و تجّار اور خواص و عوام کو زیادہ تر پرائیوٹ ملاقاتوں میں قومی تعلیم اور امداد کالج پر مائل کیا اور علی العموم کامیاب ہوئے بالخصوص بھوپال میں علیا حضرت

نواب سلطان جہاں بیگم (فردوس آشیاں) کے حضور میں کالج کے حالات اور قومی ضروریات گوشش گذار کیں اور وہ مسلسل فوائد جو بھوپال سے کالج کو حاصل ہوئے اسی کوشش کے نتائج تھے۔

کالج کے وزیٹر اور مہمان

کالج کو ہمیشہ اعلیٰ حکام سلطنت، رؤسا و امرا کی تشریف آوری سے بڑے بڑے مالی و اخلاقی فوائد حاصل ہوئے ہیں نواب وقار الملک کے زمانہ میں بھی یہ سلسلہ جاری رہا۔

ہز اکسلنسی لارڈ منٹو والیسرائے ہند، صوبہ متحدہ کے لفٹنٹ گورنر، صوبہ سرحد کے چیف کمشنر، ہز ہائی نس نواب صاحب رام پور و ہز ہائی نس نواب صاحب خیر پور سندھ ہز ہائی نس مہاراجہ صاحب کشمیر، سر آغا خان، مہاراجہ دربھنگہ، نواب صاحب ڈھاکہ آنریبل مسٹر سیٹھ فاضل بھائی بمبئی، سیٹھ عبدالکریم جمال برادرس رنگون، آنریبل مسٹر کے، جی گپتا اور بعض دیگر مشاہیر و اکابر نے کالج کا باضابطہ معائنہ کیا۔

علیا حضرت سرکار عالیہ فرماں روائے بھوپال (فردوس آشیاں) پرائیوٹ طور پر تشریف لائیں مگر حضور ممدوحہ نے کالج کے ہر ایک شعبہ کو بنظر غائر ملاحظہ فرمایا۔

ان جلیل الشان شخصیتوں کے علاوہ طبقہ وسطیٰ کے اکثر اصحاب بھی وقتاً فوقتاً آتے رہتے جو یا تو خود نواب صاحب کے مہمان ہوتے یا دیگر احباب کے یہاں قیام کرتے اور ان مہمانوں سے ملاقاتوں میں کالج اور قوم ہی موضوعِ گفتگو رہتا اگر کوئی مہمان کچھ تجاویز پیش کرتا یا اس کی نظر میں کوئی قابل اعتراض بات ہوتی تو اس کو توجہ سے سنتے اور ہمیشہ یہ مہمان اپنے محترم آنریری سکریٹری کے گراں مایہ اخلاق پُرخلوص محبت اور ہمدردی کا خاص اثر لے کر جاتے۔

آل انڈیا مسلم ایجوکیشنل کانفرنس

اگرچہ قانون و قواعد کالج سے سکریٹری کو کانفرنس سے کوئی تعلق نہ تھا لیکن چوں کہ وہ علیگڑھ تحریک کا ایک جزو ہے اس لئے کانفرنس کے قاعدہ کی رو سے کالج کا آنریری سکریٹری کانفرنس کا بھی

سکریٹری ہوتا تھا۔

نواب صاحب نے محض تکمیل ضابطہ کے لئے اس کا جائزہ لیا مگر عملاً صاحبزادہ آفتاب احمد خاں (مرحوم) کو جو ۱۹۰۶ء سے نہایت جوش اور قابلیت کے ساتھ جوائنٹ سکریٹری کی حیثیت سے کام کر رہے تھے پورے اختیارات تفویض کر دیئے البتہ مناسب موقعوں پر ضروری کارروائیاں اور جلسوں کی شرکت کرتے رہے ۱۹۰۸ء میں کانفرنس کے اجلاس منعقدہ امرتسر سے کچھ قبل ہوشیار پور (پنجاب) کے مسلمانوں کی خواہش پر اسلامیہ ہائی اسکول کا افتتاح کرنے کے لئے گئے اس موقع پر جالندھر سے ہوشیار پور تک استقبال کا نہایت شاندار انتظام تھا، اکثر عمائدین لاہور بھی ہمراہ تھے، ایڈریس پیش کیا گیا اور نواب صاحب نے جوابی تقریر کی اور ایک بورڈنگ ہاؤس کا سنگِ بنیاد نصب کیا، اہل ہوشیار پور نے اس کو وقار منزل کے نام سے موسوم کئے جانے کی درخواست کی تو بہ اصرار منع کیا اور کہا کہ اس عزت کے بہترین مستحق جناب مولوی حاجی الٰہی بخش صاحب ہیں جن کی ذات سے یہ عالی شان کام ظہور میں آیا ہے اور اگر جناب ممدوح از راہ فروتنی اس کو منظور نہ کریں تو بھی اس کو یونہی چھوڑ دینا چاہیئے آئندہ شاید کوئی اور موزوں تر موقع کسی اور صاحب کے نام نامی سے اِس عمارت کو موسوم کرنے کا پیش آئے، یہ بہت اہم معاملہ ہے اس کو سرسری طور سے جلدی میں طے نہیں کرنا چاہیئے۔ اور ہمارا حال تو یہ ہے کہ

فقیرانہ آئے صدا کر چلے
میاں خوش رہو ہم دُعا کر چلے

زنانہ تعلیم کی تائید

نواب محسن الملک مرحوم کے زمانہ میں کانفرنس کے کاموں کو عمدگی کے ساتھ سرانجام دینے کے لئے متعدد شعبے قائم کئے گئے تھے۔ من جملہ ان کے ایک شعبہ زنانہ تعلیم کا بھی تھا جس کے سکریٹری (خان بہادر) شیخ عبداللہ ایڈوکیٹ تھے۔ اور انھوں نے ایک اسکول کی بنیاد ڈال دی تھی جو برابر ترقی کر رہا تھا۔ نواب صاحب بھی تعلیم نسواں کے زبردست حامی تھے اور انھوں نے اپنی لڑکیوں کو خاصی

تعلیم دلائی تھی، ۱۸۹۶ء میں کمیٹی خواستگار تعلیم مسلمانان کے اعلان پر جو رسالہ بطور جواب مضمون لکھا تھا اس میں ایک مخصوص باب اسی سوال پر تھا اور سوال کے ہر ایک پہلو پر نظر ڈالی تھی لیکن ان کو اس امر سے اختلاف تھا کہ زنانہ مدرسوں کے اہتمام و تعلیم کو مردوں کے سپرد کیا جائے اور اپنے نو برس کے تجربہ سے جو اُن کو تعلیمی کمیٹی کی رکنیت سے حاصل ہوا تھا اپنے صوبہ میں اس وقت تک کی حالت کو ایک دھوکہ سمجھتے تھے۔ ان کو علیگڑھ میں بعض ایسے حالات دیکھنے کا موقع ملا جس کی بنا پر وہ مدارس قائم کرنے کے خلاف تھے اور پھر عورتوں کے ٹریننگ کالج کے بعض واقعات نے تو اس رائے میں زیادہ سخت بنا دیا تھا لیکن رفتہ رفتہ رائے میں نرمی پیدا ہوئی انھوں نے حکومت کو زیادہ خرچ اور وظائف تعلیم نسواں کی طرف توجہ دلائی اور جب کالج کے سکریٹری ہوئے تو شیخ صاحب کی پوری تائید کی۔ چنانچہ ۱۹۱۲ء تک وہ اسکول اتنی ترقی کر گیا کہ انتظامیہ جماعت کی تشکیل ضروری ہو گئی آنریری سکریٹری کالج اپنے عہدہ کے لحاظ سے اس کا پریسیڈنٹ قرار پایا۔ کالج کے ٹرسٹیوں کو خاص خاص اختیارات دیئے گئے اور جماعت انتظامیہ کی رجسٹری کرائی گئی۔

عطیات اور مالی امدادیں

اگرچہ سکریٹری شپ کے شروع زمانہ میں قحط کے آثار نمودار تھے اور طرابلس و بلقان کے مظلوموں کی مالی امداد کا کام بھی جاری تھا اور اس دوران میں مسلم یونیورسٹی کی تکمیل پر بھی توجہ منعطف ہو گئی تھی تاہم ایم اے او کالج کو جو عطیے اور امدادیں حاصل ہوئیں ان کے لحاظ سے اس دور کو "عصر طلائی" کہہ سکتے ہیں۔

ذیل میں خاص خاص عطیات اور امدادوں کی فہرست درج ہے جو اگرچہ مکمل نہیں لیکن جہاں تک کوشش کے ساتھ ۹-۱۹۰۸ء تا ۱۳-۱۹۱۲ء کے اعداد فراہم ہو سکے وہ سب یک جا کر دیئے گئے ہیں۔

یک مشت عطیات

(۱)	امپیریل گورنمنٹ	۲	لاکھ	روپیہ
(۲)	ہز ہائی نس مہاراجہ گوالیار	۱	"	"
(۳)	جمال برادرس، رنگون	۵۰	ہزار	"
(۴)	نواب کرنل حافظ محمد عبید اللہ خاں بہادر سی ایس آئی (فردوس مکاں) بھوپال۔	۵۰	ہزار	"
(۵)	راجہ صاحب نان پارہ	۵۰	"	"
(۶)	نواب یار محمد خاں وزیر جاورہ	۵۰	"	"
(۷)	راجہ سر تصدق رسول خاں تعلقدار اودھ	۴۰	ہزار	"
(۸)	ہز ہائی نس نواب صاحب بہادر جوناگڈھ	۲۵	"	"
(۹)	گورنمنٹ صوبہ متحدہ	۲۰	"	"
(۱۰)	ہز ہائی نس نواب حامد علیخاں بہادر (جنت آشیاں) رامپور	۱۰	"	"
(۱۱)	مہاراجہ محمود آباد (اودھ)	۱۰	"	"
(۱۲)	محسن الملک میموریل فنڈ	۴ —— ۳۱۰۵۱		

میزان ۴ —— ۶۲۲۶۰۵۱

مذکورہ بالا یکمشت امدادوں کے علاوہ مختلف فنڈوں میں (روپیہ ۵۸۹۱۸ - آنہ ۱۱ - پائی ۶) وصول ہوا۔
ڈیوٹی فنڈ بھی نہایت کامیاب رہا اور اس کی کل مقدار بشمول امداد غربا (پور فنڈ) (روپیہ ۵۶۱۳۴ - آنہ ۱۲ - پائی ۸) ہے۔

زنانہ تعلیم کے سلسلے میں بھی ۸۰۸۰ روپیہ کے متفرق عطیات حاصل ہوئے۔
ان سب عطیات کی میزان کل (۷٬۴۹٬۱۸۴ - ۱۲ - ۲) ہے۔
ان یک مشت عطیات کے علاوہ مستقل آمدنی میں بھی حسب ذیل اضافہ ہوا۔

(۱)	بھوپال	۵ ہزار سالانہ	
(۲)	ہز ہائی نس آغا خان	۴ 〃 〃	اضافہ
(۳)	خیر پور	۶ 〃 〃	
(۴)	وقف نواب عظمت علی خاں کرنال	۲۴۰۰ روپیہ سالانہ	
(۵)	وقف صفیہ بیگم و مولوی فضل حق بچھرایوں	۳۰۰ 〃 〃	
(۶)	سردار یار محمد خاں وزیر جاورہ	۳۸۰۰ 〃	〃 جاگیر موروثی منتقل کردی
(۷)	وقف نواب سر سلیم اللہ خاں ڈھاکہ	۲۴۰۰ 〃 〃	
(۸)	جمال برادرس	۱۲۰۰ 〃 〃	

اماںتوں کا خرچ کالج فنڈ میں مختلف ضروریات کے لئے بعض رقوم بطور امانت جمع رہتی تھیں آنریری سکرٹری نے ان رقوم کو جو اس طرح

نوٹ:- ع۲ و ع۳ ۱۹۱۶ء اور ۱۹۲۵ء سے بند ہے۔

ع۶ جاورہ سے ۱۲۰۰ سالانہ ملتا ہے لیکن جاگیر کی آمدنی قانونی پیچیدگیوں کی وجہ سے نہیں ملتی۔

ع۷ دستاویز وقف مکمل نہ ہوسکی اس لئے امداد جاری نہ رہ سکی۔

ع۸ ۱۹۲۰ء میں جمال برادرس کی یہ امداد کاروبار کی خرابی سے بند ہوگئی۔

جمع تھیں۔ کالج کی ضرورتوں پر قرضہ کے طور پر خرچ کر دیا۔ جن میں سب سے بڑی ضرورت بورڈنگ ہاؤس کی تعمیر تھی جس سے ایک طرف وہ ضرورتیں پوری ہوگئیں اور دوسری طرف ان کے منافع میں بھی اضافہ ہوگیا۔

آخری سال کی آمدنی و خرچ

سنہ ۱۳-۱۹۱۲ء میں کل آمدنی دو لاکھ تینتیس ہزار تھی اور خرچ دو لاکھ چھبیس ہزار پانسو پچیس روپیہ تھا

عمارات

جدید عمارات میں منٹو سرکل کے چاروں بلاک، حامد حال، آرنلڈ ہاؤس اور اسٹاف کے لئے متعدد مکانات تعمیر ہوئے بیک منزل، مشتاق منزل اور بعض دیگر ناتمام عمارتوں کی تکمیل کیگئی۔



باب دوازدہم

سکریٹری شپ سے سبکدوشی اور خدماتِ کالج پر تبصرہ

نواب وقار الملک نے جس محنت شاقہ کے ساتھ اپنے قومی عہدہ کا کام کیا اس کا نہایت سخت اثر اُن کی صحت پر پڑا۔

انھوں نے جس وقت آنریری سکریٹری کے عہدہ کو قبول کیا ہے صاف طور پر کہدیا تھا کہ "میرے لئے کام کرنے کا وقت گذر چکا ہے عمر انحطاط پر ہے قویٰ کمزور ہوگئے ہیں اور بعض عوارض بھی لاحق ہیں میرا وقت مکان پر رہنے اور آرام و استراحت کرنے کا ہے مگر میرے عذرات کی سماعت میرے دوستوں اور بزرگوں نے نہیں فرمائی اور انھوں نے مجھے مجبور کیا کہ میں اس ذمہ داری کے عظیم الشان کام کو قبول کروں، ان کے عنایت آمیز اصرار کا جواب نفی میں دینا اور ان کی آزردگی کا باعث بننا میرے لئے ناممکن تھا مجبوراً میں نے اس بوجھ کو اپنے کندھوں پر اُٹھایا۔

اظہار معذوری وارادۂ استعفا مگر اب وہ اِس بار کی برداشت سے عاجز ہو گئے اور اختتام میعاد سے کئی ماہ قبل اپنے احباب سے انھوں نے اپنی مجبوریوں اور معذوریوں کو ظاہر کر کے اطمینان کے ساتھ نئے سکریٹری کے انتخاب پر غور کرنے کا مشورہ دیا اور اپنے جائنٹ سکریٹری (نواب بہادر ڈاکٹر سر محمد مزمل اللہ خاں صاحب

سے صاف طور پر ان مشکلات کے باعث اپنے ارادہ کا اظہار کیا۔

التوائے ارادہ مگر جب نواب صاحب جائنٹ سکریٹری نے بہت سی ذمہ داریاں اپنے اوپر لے لیں تو امتحاناً چند ماہ اپنا ارادہ ملتوی کر دیا اور ان ذمہ داریوں کے لحاظ سے قانون میں کچھ تبدیلیاں بھی ناگزیر ہوتیں لیکن چونکہ اس مشورہ کی کچھ کچھ اطلاع پبلک میں آگئی تھی اور اس سے ایک عام بے چینی پیدا ہو گئی تھی اس لئے یکم ستمبر ۱۹۱۰ء کو ایک بیان شائع کرنا مناسب جانا جس میں اپنی بیماری اور ناسازی مزاج اور اُس کے سبب سے کاموں میں ہرج و تاخیر واقع ہونے اور جو قرارداد ہوئی تھی اس کا تذکرہ تھا۔ اس بیان میں بطور اصول دیانت لکھدیا تھا کہ

> یہ وہ موانع ہیں کہ ان کے موجود ہونے کی حالت میں دیانتاً مجھکو ایسی ذمہ داری کا کام اپنے ہاتھ میں رکھنا جائز نہیں۔

اور آخر بیان میں تو نہایت صاف تحریر کیا کہ:۔

> میری اصلی رائے یہ ہے کہ قوم آیندہ آنریری سکریٹری کے عہدہ کے واسطے کسی تازہ دم اور انگریزی خواں ٹرسٹی کو منتخب کرے تاکہ باری باری سے لوگ چند چند سال تک اس قومی خدمت کو انجام دے کر چلتے ہاتھ پاؤں اس نہایت درجہ محنت کے کام سے سبکدوش ہو سکا کریں کالج کو آنریری سکریٹری کا مقبرہ بنانا کچھ ضروری نہیں۔ معہذا جب کوئی شخص زیادہ عرصہ تک کام کر چکتا ہی تو جدید اصلاحوں کی اُمنگ بھی اس میں باقی نہیں رہتی یا کم ہو جاتی ہے لہذا جہاں تک ممکن ہو آیندہ انتخاب میں نئے شخص کا تقرر مناسب ہوگا ورنہ اشخاص خاص کے لئے خاص خاص دفعات کا قانون میں داخل کرنا قوم پر ایک دھبہ ہے کہ اس عرصہ تک تعلیمی جدوجہد

کے بعد بھی قوم میں اس درجہ قحط الرجال ہے حالانکہ بلحاظ قابلیت اور ضروری ثروت کے قحط الرجال نہیں ہے صرف قوم میں ایثار کا مادہ پیدا ہونے کی ضرورت ہے اور میرا خیال یہ ہے کہ اگر ٹرسٹی اس بات کا فیصلہ کرلیں اور کوشش کریں کہ کسی اور ٹرسٹی کو آیندہ انتخاب میں آنریری سکرٹری مقرر کریں گے تو کوئی نہ کوئی خدا کا بندہ شاید کھڑا ہو ہی جاوے گا۔

ٹرسٹیوں کا رزولیوشن لیکن جب ۱۸ ر ستمبر کو بجٹ میٹنگ ہوئی تو حسب ذیل رزولیوشن پاس ہوا کہ

بلحاظ ان مسلسل خدمات قومی کے جو باوجود پیرانہ سالی و ہجوم امراض و تفکرات و تکلیف قلبی و مشکلات کے نواب مشتاق حسین وقار الملک بہادر بعہدہ آنریری سکرٹری ٹرسٹیاں گزشتہ تین سال میں انجام فرماتے رہے ہیں اور بہ لحاظ اس ترقی کے جو اس عرصہ میں کالج کے اندرونی انتظامات میں نمایاں طور پر ہوتی رہی ہے اور بہ لحاظ اس بے نظیر اعتماد کے جو تمام مسلمانان ہند کو جناب ممدوح کی دین داری، استقلال، تدبر، راست بازی و آزادی اور صلح پسندی پر مسلسل رہا ہے۔

ٹرسٹیان مدرستہ العلوم مسلمانان علی گڑھ کی رائے ہے کہ نواب مشتاق حسین وقار الملک بہادر سے بہ ادب من جانب قوم درخواست کی جائے کہ حضور ممدوح باوجود اپنی مشکلات و تکالیف کے ٹرسٹیان مدرستہ العلوم کا آنریری سکریٹری آیندہ تین سال کی مزید میعاد کے واسطے رہنا منظور فرما کر قوم اور ٹرسٹیان کو ممنون و مشکور فرمائیں۔

سکرٹیری کے انتخاب پر ایک اہم یادداشت | بااین ہمہ نواب وقار الملک نے ۳۱ جنوری ۱۹۱۱ء کے ایجنڈا کے ساتھ ایک اور یادداشت تحریر کی اور ان مزید مشکلات و عوارض اور مجوزہ انتظام کی ناکامی کو دکھاتے ہوئے لکھا کہ

یہی وہ تمام واقعات ہیں جن کے لحاظ سے میں نے اوپر عرض کیا ہے کہ قدرت کا زبردست ہاتھ غلط راستے پر جانے سے اب روکتا ہے اور جو انتظام اپنے مضمون مطبوعہ علی گڑھ انسٹیٹیوٹ گزٹ مورخہ ۷ ستمبر ۱۹۱۰ء میں دوستوں کے مشورہ سے کچھ عرصہ کے لئے تجویز کیا تھا اس کو قدرت نے حرف غلط کی طرح مٹا دیا ہے اور قدرت نے بتلا دیا ہے کہ اس وقت جس قسم کی بیماری اور دشواری مجھ کو پیش آئی یہ آئندہ بھی پیش آسکتی ہے۔ بلکہ جوں جوں اب عمر زیادہ ہوگی ووں ووں اس قسم کے عوارض زیادہ لاحق ہونے کا اندیشہ ہے اور آئندہ بھی اس کی کوئی ضمانت نہیں ہے کہ جن دوستوں کی مدد پر بھروسہ کیا جاوے اُن کو بھی اسی قسم کی مجبوریاں پیش نہ آویں گی (گو دعا یہی ہے کہ خدا ایسا نہ کرے) اور اس قسم کا کوئی عارضی انتظام جیسا کہ تجویز کیا گیا تھا ایک ایسے بڑے انسٹیٹیوشن کے متعلق (جیسا کہ خدا کے فضل سے کالج ہے) کوئی مآل اندیشی کا کام نہیں ہے۔ اور اب ہر طرح ضرورت ہے کہ جو کوئی انتظام بھی آئندہ کے واسطے کیا جاوے وہ ایسا ہو جو مستقل اور مکمل طور پر قابل عمل ہو۔ یا دوسرے لفظوں میں یہ کہ کسی دوسرے شخص کا انتخاب عہدہ آنریری سکرٹیری کے واسطے کیا جاوے۔

پھر اس عہدہ کی اہمیت پر بحث کر کے اس پر جدید انتخاب کے متعلق اپنی راے ظاہر کی کہ

وہ شخص پابند مذہب ہو۔ اس کا نصب العین قوم اور کالج ہو، پورا
وقت وقف کر سکے۔ گورنمنٹ میں بھی اس کا اعتماد ہو انگریزی داں کو
ترجیح دی جائے۔ حتی الامکان اس کا انتخاب بلا اختلاف کیا جائے"۔

اور تا انتخاب ثانی جس کے لئے سالانہ اجلاس کی شرط لازم نہ تھی یہ چند شرائط
جس میں جوائنٹ سکریٹری پر روزانہ کے کاروبار اور ذمہ داریوں کا بار عائد کیا
تھا کام کرنا منظور کر لیا مگر ساتھ ہی یہ جتا دیا کہ

کسی عہدہ کو اپنے ہاتھ میں رکھنے کی وجہ سے اس کی تمام ذمہ داریاں بھی
عائد ہو جاتی ہیں اور یہ ہو نہیں سکتا کہ ان ذمہ داریوں کو محض برائے نام
میں اپنے آپ سے متعلق سمجھوں لہٰذا اس کے سوا چارہ نہیں کہ بزرگان
قوم دوسرے کسی لائق ٹرسٹی کو اس عہدہ کے لئے منتخب کریں۔
مجھ کو اگر اس بات کا یقین ہو جاتا کہ میری ایک جان کی قربانی سے
آنریری سکریٹری کے عہدہ کے واسطے انتخاب کی سب مشکلات آئندہ
حل ہو جاویں گی تو یقین رکھئے کہ میں نہایت خوشی سے اس کے واسطے
آمادہ ہو جاتا اور میری صحت کی جو حالت بھی ہوتی اور جس قسم کی مشکلات
بھی مجھکو لاحق ہوتیں میں برداشت کرتا رہتا۔ لیکن اس سے کیا فائدہ
کہ میں بھی ناقابل برداشت مشکلات کو برداشت کرتے کرتے بالاسباب
ظاہر جلد اس دنیا سے چلدوں (اگرچہ ایمان یہی ہے کہ کوئی قبل از
وقت مقررہ نہیں مرتا) اور قوم کو پھر اپنے آنریری سکریٹری کے انتخاب
کی مشکلات بدستور برداشت کرنی پڑیں۔

جدید سکریٹری کی انتخاب کی تحریک۔ استعفیٰ اور منظوری۔ لیکن چونکہ اسی عرصہ میں مسلم یونیورسٹی کی تحریک
میں جوش پیدا ہو گیا جو کہ نہ صرف ان کا بلکہ ان کے

پیش رووں، بزرگوں، دوستوں اور موجودہ زمانہ کے تمام مسلمانوں کا عزیز مقصد اور منتہائے آرزو تھا اس لئے ان میں ایک ایسی قوت پیدا ہو گئی جو تھوڑے دن کے لئے عوارض لاحقہ پر غالب آ گئی تاہم ۱۹۱۲ء کے اوائل میں اس قوت کا رد عمل ہوا اور اب سوائے اس کے کہ وہ مستعفی ہو جائیں کوئی چارہ کار باقی نہیں رہا وہ آیندہ کے خیال سے بھی غافل نہیں تھے۔ اور تمام امور پر غور کرنے کے بعد اپنے آخری استعفے کے ساتھ نواب محمد اسحق خاں[1] (مرحوم رئیس جہانگیر آباد ضلع بلند شہر) کے لئے تحریک کی۔ ۲۱ر جولائی ۱۹۱۲ء کو ٹرسٹیوں کے اجلاس میں استعفا منظور ہوا اور اسی وقت ایک رزولیوشن میں خدمات کا اس طرح اعتراف کیا گیا کہ

---

[1] نواب محمد اسحق خان (مرحوم) عرصہ دراز سے کالج کے ٹرسٹی تھے اُن کو اس ادارہ کے ساتھ نہایت گہرا اور خاندانی تعلق تھا انگریزی تعلیم اور مذہب کی پابندی کے لحاظ سے وہ مسلمان تعلیم یافتہ طبقہ کے لئے ایک نمونہ تھے

اُنہوں نے اس قومی خدمت کا بار گراں اُٹھانے کے لئے سشن جج کے عہدہ سے قبل از وقت پنشن لے لی مگر نواب وقارالملک کے سبکدوش ہوتے ہی علی گڑھ پر جو فضا طاری ہو گئی وہ اس سے متاثر ہو گئے اور ایک ایسی پالیسی اختیار کی جس سے پر جوش جماعت ان کی مخالف بن گئی اور ایک محاذ جنگ قائم ہو گیا پھر چند سال کے تجربہ کے بعد اپنی پہلی غلطی کا احساس ہوا اور اس میں تبدیلی کی تو خاص علیگڑھ میں مخالفت کا طوفان برپا ہو گیا جو زیادہ خطرناک تھا تاہم یونیورسٹی تحریک میں باوجود بڑی بڑی رکاوٹیں پیش آنے کے ترقی ہوتی رہی اور اپریل ۱۹۱۷ء میں فونڈیشن کمیٹی نے اس کی منظوری کا رزولیوشن پاس کر دیا۔ لیکن مخالف قوتیں بڑے زور شور سے برابر کام کرتی رہیں جس کے نتیجہ میں اسی سال ان کو یورپین اسٹاف کے متفقہ استعفے نے بڑی مشکلات میں پھنسا دیا مگر اُنہوں نے مردانہ وار ان مشکلات کا مقابلہ کیا اور اپنے ممتاز رفقائے کار کی حمایت سے اسٹاف کے مقابلہ میں کامیابی حاصل کی اس کے بعد مئی ۱۹۱۸ء میں داعی اجل کو لبیک کہا۔

اگرچہ عالی جناب ممدوح کی مدۃ العمر کی قومی خدمات اور خدمات کالج بحیثیت آنریری سکریٹری ایسی عظیم الشان اور غیر محدود ہیں کہ اس کی شکرگذاری ہماری قوت امکانیہ سے بالاتر اور عالی جناب کی ذات ایسی تعریفوں اور شکرگذاریوں سے بالاتر و برتر ہے لیکن ہم اس امر کو اپنا فرض محسوس کرتے ہیں کہ اس موقع پر ممدوح کی شکرگذاری خدمات قومی کو تمام ٹرسٹیان کالج و تمام مسلمان قوم کی طرف سے بہ کمال ادب ادا کریں اور اس واقعہ کو قلم بند کرکے اپنا فرض ادا کریں اور یہ بھی تحریر کریں کہ کالج کو جس درجہ پر ہر اعتبار سے ترقی اور اعتمادِ عام کی حالت میں جناب ممدوح نے اس وقت چھوڑا ہے وہ اس سے بدرجہا زیادہ ہے جب کہ جناب ممدوح نے اس کا چارج بحیثیت آنریری سکریٹری لیا تھا۔

طلبا کے ساتھ شفقت، استعفے پر اُن کی بے چینی، ایڈریس اور جواب

نواب وقار الملک کی زندگی کا یہ عجیب اتفاق ہے کہ انھوں نے جب عملی دنیا میں پہلا قدم رکھا تو ایک مدرس کی حیثیت سے طلبا کے ساتھ ان کا سابقہ ہوا پھر جب علی گڑھ میں تعلیمی کمیٹی کے ممبر اور سکریٹری ہوئے تو اُن کی حالت پر خاص طور سے غور کرنے کا پورا موقع ملا انھوں نے اپنی رپورٹوں میں ہمیشہ اُن کو سہولتیں بہم پہنچانے کی سفارشیں کیں اور بقدر حیثیت مدد کرتے رہے۔ اس کے بعد ایم اے او کالج کی بنیاد پڑی تو طلبا کے وظائف اُن کے مصارف ذاتی کا ایک بڑا جزو بن گئے۔

چند روزہ معزولی کے زمانہ میں ایم اے او کالج کے بورڈنگ ہوس کی نگرانی اُن کے سپرد کی گئی تو اُس وقت اُن کی مربیانہ شفقتیں اس طرح

منظر عام پر آئیں کہ ضرب المثل ہو گئیں۔

حیدر آباد سے سبکدوشی کے بعد بھی بقدر استطاعت مالی امداد کی اور جب کبھی طلبا کو کسی قسم کی مدد کی ضرورت پڑی وہ آمادہ رہے۔

غریبوں کی امداد کے متعلق ان کا یہ عقیدہ تھا کہ:-

"کوئی قوم صرف اپنے دولت مندوں کی اولاد کو تعلیم دینے کے ذریعہ سے ترقی نہیں کر سکتی۔ یہی ہو نہار نوجوان جن کے ماں باپ ان کی تعلیم کے مصارف برداشت نہیں کر سکتے قومی جسم میں ریڑھ کی ہڈی سمجھے جانے کے قابل ہیں یہی ہونہار اور شریف نوجوان اس وقت افلاس کی مصیبت میں مبتلا ہیں اگر اعلیٰ تعلیم پا کر اپنے پیروں پر کھڑے ہونے کے قابل ہو جائیں تو ان ہی سے قوم کی ترقی ہو سکتی ہے۔"

اس ½ ۴ سال میں اگرچہ ان کا ہاتھ نسبتاً بہت تنگ تھا اور قیام علی گڑھ کے کثیر اخراجات نے ان کو مالی مشکلات میں مبتلا کر دیا تھا تاہم وہ اپنے مصارف کی کانٹ چھانٹ کر کے غریب طلبا کی مدد کرتے رہتے تھے۔

۱۹۰۸ء میں نواب کے خطاب ملنے پر جب کہ ہر گوشہ ہند سے مبارک باد کے تار آئے تو انھوں نے تار پر شکریہ ادا کرنے کی جگہ خطوں سے شکریہ ادا کیا اور تاروں کا صرفہ نادار طلبا کی امداد خاص میں جمع کر دیا۔

وہ نوجوانوں کی خود داری اور قومی و مذہبی حسیات کا انتہائی خیال و احترام رکھتے تھے

مسٹر کارنا کی پرنسپلی سے شدید اختلاف کی وجہ یہی تھی کہ انھوں نے مختلف موقعوں پر طلبا کے ساتھ حقارت کا برتاؤ کیا تھا۔

۱۹۰۷ء کی اسٹرایک کے بعد جب تمام طلبا ایڈریس کے ایک جلسہ میں مدعو

گئے گئے لیکن پارٹی میں ان طلبا کو جن کا اس واقعہ سے تعلق تھا یا مشتبہ تھے مدعو نہیں کیا گیا تو نواب صاحب نے اس پر سخت اعتراض کیا اور آنریری سکریٹری کو لکھا کہ

اگر بلانا تھا تو دونوں موقعوں پر بلانا تھا ورنہ ایک موقعہ پر بھی نہ بلائے جاتے .... پہلے آپ خود اپنی بچوں کی عزت کیجئے اُس کے بعد دوسروں سے امید کیجئے کہ وہ بھی اُن کی عزت کریں۔

اُن کو طلبا کی صحت کا ہمیشہ سے بہت خیال رہا چنانچہ ۱۸۸۲ء میں اُنہوں نے ایجوکیشن کمیشن میں جو شہادت دی تھی اُس میں زمانہ امتحان (اکتوبر و نومبر) پر سخت نکتہ چینی کی تھی کیوں کہ اُن مہینوں سے قبل برسات کے موسم میں طلبا کو تیاری امتحان کے باعث بڑی تکلیفوں کا سامنا کرنا پڑتا تھا اور اُن کی صحت پر اُس زمانہ کا نہایت برا اثر ہوتا تھا۔

اس شہادت میں اُنھوں نے اپنے ایسے تجربات کو جو بورڈنگ ہاؤس کی نگرانی کے زمانہ میں ہوئے تھے نہایت دردناک اور موثر طریقہ سے بیان کیا تھا اور یہی وجہ تھی کہ اپنے دور میں اُنھوں نے طبّی انتظام پر زیادہ توجہ کی اور ہاسپٹل اسسٹنٹ کا یہ فرض قرار دیا کہ دونوں وقت طلبا کی صحت کے متعلق زبانی رپورٹ پیش کرے بایں ہمہ اگر کوئی طالب علم کسی خطرناک مرض میں مبتلا ہو جاتا تو خود اس کے علاج و تیمارداری کی نگرانی حتی الامکان اپنے ذمہ رکھتے۔

طلبا کے لئے ان کا دروازہ دن اور رات کھلا رہتا تھا اور وہ ہر وقت مُلاقات کے لئے تیار رہتے تھے حتیٰ کہ بعض اوقات نصف شب کو بھی کوئی طالبعلم آگیا تو اُس سے ملنے میں تامل نہیں کیا۔

بااین شفقت وہ ڈسپلن کے زبردست حامی تھے اور اس بات کے کبھی روادار

نہیں ہوئے کہ طلبا اپنے اُستادوں کے احترام میں شمّہ بھر کمی کریں یا براہ راست کالج کے انتظامات پر کوئی اثر ڈالیں ان کو طالبعلموں کی کسی دہمکی کی پروانہ تھی اور نہ دائرہ حدود سے ان کا ایک انچہ تجاوز کرنا گوارا تھا۔

ڈسپلن کے متعلق جو کچھ اُنھوں نے ۱۹۰۸ء کی اسٹرائک کے تحقیقاتی کمیشن کی رپورٹ میں لکھا تھا اس پر اپنے دور میں نہایت سختی سے عمل کیا۔ وہ ڈسپلن کو اسٹاف میں بھی دیکھنا چاہتے تھے اور اُن کا مقولہ تھا کہ

> ڈسپلن اس وقت عمدہ حالت میں کامیاب رہتی ہے کہ طلبار اور اسٹاف دونوں اپنے فرائض کو عمدگی سے ادا کریں"

چنانچہ اسی اصول پر اسٹاف کو بھی مختلف مواقع پر توجہ دلائی۔

نواب صاحب کی شفقت و اخلاق اور اصول کا جو اثر طلبا پر تھا اور اُن کی جو عزت و محبت اُن کے دلوں پر مرتسم تھی اس کا پُورا اندازہ اس وقت ہوا جب کہ وہ اپنے عہدہ سے سبکدوش ہو رہے تھے۔ طلبا کو جس وقت اس آخری فیصلہ کی اطلاع ملی تو اُنھوں نے بالاتفاق ایک موثر و منظم طریقہ سے اس امر کی کوشش کہ نواب صاحب استعفےٰ واپس لے لیں۔ ان کی خدمت میں وفد پیش ہوا اور ایک قرار داد کے مطابق ۷ر فروری کو وہ سب یونین میں جمع ہوئے مگر قبل اس کے کہ طلبا کچھ کہیں نواب صاحب نے ایک تقریر کی اور اُس میں اُن کی طالب علمانہ حیثیت یاد دلا کر نصیحت کی کہ اس مسئلہ کے حل میں اُن کا دخل دینا مناسب نہیں لیکن ساتھ ہی انسانی طبیعت کے اقتضا کو ملحوظ رکھ کر یہ بھی کہا کہ :۔

> اس سے میرا یہ مطلب کسی طرح نہیں ہے کہ طلبہ کے اندر کوئی خیال ہی اس قسم کا پیدا نہ ہونا چاہئے آپ میں بہت سے ہیں جو عنقریب اپنی تعلیم کو کامیابی کے ساتھ ختم کر کے کاروباری دنیا کے میدان میں قدم ڈالنے

ہیں بہت ایسے ہیں جو قومی معاملات میں گہری دلچسپی اور ہمدردی رکھتے
ہیں اور قریباً قریباً آپ سب اپنے کالج کے ساتھ گہری محبت رکھتے ہیں
اور اس کی ترقی کے خواہاں ہیں تو یہ کہنا کہ آپ کو ایسے موقع پر اس قسم
کا خیال ہی نہ کرنا چاہئے صحیح نہیں ہے ضرور آپ کو بھی یہ فکر بے چین
کرتی ہوگی کہ آیندہ کالج کی باگ کس کے ہاتھ میں آتی ہے اور وہ کیسا
شخص ہوگا مگر میرا مطلب یہ ہے کہ آپ خود اس مسئلہ کو لے کر سامنے
نہ آئیں بلکہ جو کچھ آپ کے خیالات ہوں اُن کو اپنے بڑوں اور اپنے مربیوں
کے سامنے پرائیویٹ طور پر پیش کرسکتے ہیں آپ کے مربیوں میں کتنے ہی افراد
خود کالج کے ٹرسٹی ہوں گے اور کتنے ہی افراد قوم کے سربرآوردہ لوگوں
میں ہوں گے ان سے اپنے خیالات پرائیویٹ طور سے ظاہر کرنے کا مضائقہ
نہیں ہے اور فی الحال آپ کی تسکین قلب کے لئے اسی قدر کافی ہے۔

اس کے بعد طلبا نے ایک ایڈریس پیش کیا جس میں اپنے جذبات دلی اور نواب صاحب
کی شفقت وہمدردی کے پرجوش اعتراف کو ان فقرات میں ظاہر کیا :۔

جس طرح جناب نے ہماری جائز خواہشوں کا لحاظ رکھا ہے اور جس تدبر
روشن خیالی اور عالی حوصلگی سے ہمارے سچے اسلامی جذبات کی تائید
فرمائی ہے وہ جناب کی خالص ہمدردی اور مربیانہ شفقت کا صحیح پرتو ہے
جناب کی عنایتیں ہمارے حال پر کچھ اسی زمانہ میں محدود نہیں جب کہ
جناب بہ حیثیت سکریٹری کالج ہمارے حقوق کی نگہداشت کے
مختار رہیں بلکہ اس سے پہلے بھی جب کبھی ضرورت پیش آئی تو جناب نے
ہمیشہ ہماری دستگیری کے لئے سب سے پہلے اپنا ہاتھ بڑھایا
ایسے پُرآشوب وقت میں جب کہ ہمارے حرکات کی

نسبت بدظنی اور غلط فہمی عام ہو رہی تھی اور اُن پر پولیٹیکل رنگ چڑھانے کی کوشش کی جا رہی تھی جناب ہی کی معاملہ فہمی اور نکتہ رسی سے اصل حقیقت پر روشنی پڑی اور بے گناہ شورش انگیزی کے بے بُنیاد الزام سے بری کئے گئے۔

کالج کی اندرونی زندگی کا کوئی شعبہ ایسا نہیں جو حضور کی توجہ سے مستفیض نہ ہوا ہو اور اس چہار دیواری کے باہر بھی حضور ہی کی ذات والاصفات کی وجہ سے کالج کو یہ وسیع اعتماد اور ہر دلعزیزی حاصل ہوئی ہے موجودہ زمانہ میں جب کہ طرح طرح کی دشواریاں ہماری تعلیم کی سدّ راہ ہو رہی ہیں حضور ہی کی توجہ اور دلسوزی سے ہماری ایک کثیر تعداد کو اس نعمت سے فیضیاب ہونے کا موقع ملا داخلہ کے وقت مشفقانہ ہدایتیں کرنا۔ ہمارے اعلیٰ تعلیم کے اخراجات کی کفایت بورڈنگ ہاؤس میں جگہ نہ ہونے کی حالت میں اپنی ذمہ داری پر ہماری اقامت کا انتظام۔ ہم میں اُس مساوات حریت اور اخوت کو تازہ کرنے کی کوشش جو اسلام کی امتیازی خصوصیات ہیں پُرانے اور نئے طلبہ کے قدیم ارتباط کو قائم اور بحال رکھنا یہ وہ باتیں ہیں جو صرف جناب ہی تک محدود ہیں اور جن کو خیال کرتے ہوئے ہم ایک لحہ کے لئے بھی حضور سے جدائی گوارا نہیں کر سکتے۔

حضور والا

جناب کی ذات ستودہ صفات بطور خود قرن اولیٰ کے بے ریا اور صاف باطن مسلمانوں کی زندگی کی ایک جیتی جاگتی مثال ہے۔ حضور کا

اخلاق سچی مذہبی پابندی بے لوث قومی محبت، بے مثل اخلاقی جرأت
اور ان سب سے بڑھ کر صرف ایک خدا سے ڈرنے والا دل یہ وہ چیزیں
ہیں جو کالج کی تمام تعلیمات سے کہیں زیادہ ہمارے لئے سبق آموز ہیں
اور جن کا اجتماع بجز ذات والا کے کسی اور میں مشکل سے ملے گا جو
دشواریاں وقتاً فوقتاً ہماری فلاح وبہبودی کی کوششوں میں حضور
کو پیش آتی رہی ہیں اور جس استقلال ومردانگی کے ساتھ حضور نے
زبردست مخالف قوتوں کا مقابلہ کیا ہے وہ کالج کی تاریخ میں ہمیشہ
یادرہیں گی مگر ہم اس قدر عرض کرنے کی ضرور جرأت کرتے ہیں کہ ابھی
تک حضور کا مشن پورا نہیں ہوا اور منزل مقصود تک پہنچنے کے لئے
اس سے بھی زیادہ دشوار گزار مراحل طے کرنا باقی ہیں۔

نواب صاحب نے جواب میں پھر ایک تقریر کی اور مربیانہ طور پر ان کی بے چینی کو دور کرنے کی کوشش کی اور خاتمہ کلام پر اپنی معذوریوں کو ظاہر کرتے ہوئے کہا کہ:

اب تک تو جس طرح ہو سکا میں نے اس سن میں اس کام کو انجام دیا لیکن اب
میں دیکھتا ہوں کہ اس کو بحالت موجودہ قرار واقعی طور پر انجام نہیں دے سکتا
تو ایسی صورت میں آئندہ ایسی ذمہ داری کے کام کو اپنے ہاتھ میں رکھنا
دیانت داری کی بات نہیں ہے۔"

عمدة الصدور منشی محمد امین صاحب سلمہ اللہ تعالیٰ

السلام علیکم و رحمۃ اللہ و برکاتہ [illegible] [illegible] سے [illegible] طرف سلمہ اللہ

[illegible] کتاب صاحب [illegible] [illegible] [illegible] [illegible] نہ لکھ سکا

رسید [illegible] امتحان کا نسخہ [illegible] [illegible] طور [illegible] [illegible]

کہ [illegible] کتاب [illegible] اور خدا [illegible] [illegible] [illegible]

ظاہر نہ ہو جائے [illegible] [illegible] [illegible] [illegible] [illegible] [illegible]

مشتہر [illegible] [illegible] [illegible] [illegible] [illegible] [illegible] [illegible]

[illegible] [illegible] اللہ و السلام

[illegible]

یہ امید نہ تھی کہ آپ ایسا [illegible] [illegible] [illegible] [illegible]

یہی نازک وقت آجکل اس کالج کے لئے درپیش ہے اور ہم ٹرسٹیوں کو ان مسائل سے جو کہ ایسے ہی پیچیدہ ہیں جیسے کہ وہ اپنے نتائج کے لحاظ سے عارضی ہیں مقابلہ درپیش ہے ایسے ہی موقع پر ہمارا فرض منصبی اور ہمارا نہایت محفوظ راستہ یہ ہے کہ ہم اس بانی اعظم کے اصولوں کو مضبوطی اور بغیر خطرہ کے قائم رکھیں جس کی دانش مندی اور پیش بینی موقع اور آزمائش پر کارآمد ثابت ہوئی ہے اس لئے وہ ہماری تمام دقتوں اور آزمائشوں میں ہمارے رہنما کا کام دے گی . . . . .

ایک ایسا بھی زمانہ تھا جب کہ علی گڑھ تحریک کے اصول مرتب کئے گئے تھے اور وہ ہمدردانہ آب و ہوا میں سرسبز ہوے تھے جو کہ ہر سمت سے ان کو میسر آتی تھی لیکن وہ ہوا اَب بدلی ہوئی معلوم ہوتی ہے اور نئی اسپرٹ اور نئی قوتیں پیدا ہو رہی ہیں جو کہ ہمارے ٹریڈیشن اور آئیڈیل کے قیام میں بہت زیادہ دقتیں پیدا کر رہی ہیں لیکن ہم موجودہ حالت کو اس تبدیلی کے زمانہ میں جس میں کہ ہم اور باقی ماندہ ہندوستان حیرت انگیزی کے ساتھ گورنمنٹ برطانیہ کی برکات کی بدولت ایک عظیم الشان اور اعلیٰ درجہ کا مستقبل حاصل کرنے کے لئے گذر رہا ہے محض عارضی تصور کرتے ہیں۔

ہز آنر نے جواب میں ایک نہایت مبسوط تقریر کی اور اگرچہ اڈریس میں نواب صاحب کے متعلق کچھ ذکر نہ تھا مگر ہز آنر نے کالج کی ترقی پر اظہار مسرت کرتے ہوئے کہا کہ

اپنے اڈریس میں آپ حضرات نے بعض معاونین کا شکر گذاری کے ساتھ تذکرہ کیا ہے اور تمہارے خیال میں بعض فدائیوں کی بھی یاد ہے جنھوں نے اپنا وقت جاں فشانیاں اور دل اس کالج کی حقیقی کام

میں صرف کردئے اُن حضرات میں سب سے اول درجہ کے گذشتہ ایّام میں ہمارے قدیم دوست نواب مشتاق حسین صاحب ہیں اُنھوں نے اس کالج کی ترقی کے لئے یک سوہوکر اس قدر کام کیا کہ تندرستی ضائع ہونے لگی جس کے باعث وہ اس کام سے دست کش ہوگئے اور مجکو یہ دیکھ کر بیحد مسرت ہوئی کہ آج وہ ہم لوگوں میں آنے کے قابل ہوگئے۔

لیکن اس جواب ایڈریس کی جان سخن اور حقیقی روح حسب ذیل فقرات میں تھی:۔

میں اب کچھ اور معاملات کی طرف آتا ہوں جو آج میرے علی گڑھ آنے کا باعث ہوئے ہیں پہلے میرا ارادہ تھا کہ چند روز بعد صوبہ کے اس حصّہ کا جب باقاعدہ دورہ کروں تو اُس وقت فرصت سے کالج کو دیکھوں لیکن تمبر گذشتہ سے جب سے کہ میں نے اپنے عہدہ کا چارج لیا ہے میں کالج کے دوستوں اور نکتہ چینوں دونوں سے اس کی نسبت بہت کچھ سنتا رہا ہوں علی الخصوص عمیق جذبات کی اس لہر کے متعلق جو آج کل اسلامی دنیا پر طاری ہے جو کچھ میں نے سُنا اس سے کالج کے پٹیرن اور مسلمانان ہند کے دلی دوست ہونے کی حیثیت سے میرے لئے سوائے اس کے کوئی چارہ کار باقی نہ رہا کہ بلا تاخیر مزید یہاں پہنچوں اور آپ صاحبوں سے (جو اس صوبہ میں اسلامی خیالات کے قائم مقام ہیں) مشورہ کروں اور جو مدد اور مشورہ مجھ سے ممکن ہے وہ آپ کو دوں .... میں نے علی گڑھ کے سیکڑوں طالب علموں کو دیکھا اور اُن کے ساتھ کام کیا ہے میں نے بارہا ان لوگوں سے مضطربانہ مشورہ کیا ہے جو علی گڑھ کو عزیز رکھتے ہیں اور جن کو اندیشہ ہے کہ اس کی حالت پورے اطمینان کے قابل نہیں ہے، .... میں سمجھتا ہوں کہ میں آپ کے کالج کا ہ نہیں ہوں

بلکہ بدخواہ ہوں گا اور آپ کی قوم کا دوست نہیں ہوں گا بلکہ چھپا دشمن ہونگا
اگر میں آپ کو یہ صاف صاف نہ بتاؤں کہ میری رائے میں خطرات کہاں
کہاں مخفی ہیں اور میری دانست میں ان کا کیا علاج ہے آپ میرا مشورہ
مانیں یا نہ مانیں یہ آپ کا کام ہے میں آپ کی ذمہ داریاں اپنے اوپر نہیں لے
سکتا۔ میرا امداد پیش کرنا بے غرضانہ اور مخلصانہ ہے۔

اس کے بعد ہز آنر نے مسلمانوں کی پر افتخار قوم اور ٹرکی جاں بازیوں کی مدح وستائش کر کے اسلام کو محفوظ رکھنے کے اصول کی تلقین کی اور حاضر و غائب ٹرسٹیوں سے اپیل کی کہ وہ نوخیز نسل کے سامنے ہم آہنگی کی مثال پیش کریں۔ پھر پالیٹکس میں کہن سال اور جوان عمر فریقوں کے اختلاف پر تبصرہ کرتے ہوئے اتفاق کی نصیحت کی اور اسٹاف کے تعلقات پر اظہار خیال کیا اور آخر میں فرمایا کہ:۔

آپ سے طلبا کی جانب سے اپیل کرتا ہوں اور آپ سے درخواست کرتا ہوں
کہ دلاوری کے ساتھ ہر ایک ایسے امر کا مقابلہ کیجئے جو ان کو ان کے کام
سے باز رکھے یا حارج ہو جسمانی اور دماغی بالیدگی ان کا کام ہے اور یہ
آپ کا فرض ہے کہ ان کے جسم کو قابل علاج امراض سے اور ان کے
دماغ کو پریشانی سے محفوظ رکھیں کالج میں ان کی زندگی کا ہر ایک لمحہ
نہایت قیمتی ہے اور ہر گھنٹہ جو جسمانی علالت یا دماغی پریشانی میں ضائع
ہو وہ ان کی ترقی میں رکاوٹ اور آیندہ زندگی میں نقصان کا موجب
ہے ہمیشہ ان کی جسمانی تندرستی کا خیال رکھئے حفظان صحت کی متعلق
اعلےٰ قسم کے مشورے حاصل کیجئے دیکھئے کہ ان کی غذا عمدہ ہی لباس
معقول ہے، ان میں خودداری اور صفائی کی عادت پیدا کیجئے ہر وقت
ان کی دماغی صحت کا بھی خیال رکھئے جہاں تک آپ کے امکان

میں ہو جوش اور پریشانی کو کالج میں آنے دیجئے میں یہ نہیں کہتا ہوں کو طلبا کو پالیٹکس سے بالکل علیحدہ رکھا جائے کیوں کہ سمجھدار نوجوانوں کی دماغوں کو باہر کے زیر بحث مسائل پر توجہ کرنے سے باز نہیں رکھا جا سکتا لیکن پالیٹیکس اور بحث و مباحثہ کو ان کے موزوں مقام پر رکھنا چاہئے یعنی ہیر کی گفتگو اور ڈبیٹنگ سوسائٹی کے وہ مضامین رہیں لیکن ان کو اس حد تک نہ بڑھنے دیجئے کہ زندگی کے اس نازک زمانہ میں ان کا دماغ پریشان ہو جاوے اور ان میں جوش پیدا ہو جاوے آہ وزاری میں راتیں گذارنے اور دن کو روزے رکھنے کے جو مذہباً ضروری نہیں ہیں روایتیں سننے کا مجھے موقع نہ دیجئے اگر ان تیز مزاج اور فیاض طبع لڑکوں کو آپ لوگ مفید اور قومی آدمی بنانا چاہتے ہیں تو اُن کے جسم کی پرورش اور دماغ کی پرورش کرنا چاہئے جب جسم و دماغ کی پرورش ہو جاوے گی تو تکلیف برداشت کرنے اور ایثار نفسی کا مادّہ خود بخود پیدا ہو جاوے گا اگر قبل از وقت آپ اُن میں قومی زندگی پیدا کر دیں تو آپ اُن لوگوں کو جو آپ کی سپردگی میں دئے گئے ہیں نہایت ظالمانہ مضرت پہنچاتے ہیں۔

نواب وقار الملک نے اس تقریر کو سنا اور یقیناً اس پر غور کیا اور غالباً نفس واپسین تک غور کرتے رہے ہوں گے لیکن ان کے پُر وقار تحمل نے کبھی اجازت نہ دی ہوگی کہ ایک نقطہ بھی ان دوستوں اور نکتہ چینیوں کی نسبت مُنہ سے نکالیں جنھوں نے ہز آنر ہیڈرن کو اس وعظ و نصیحت کے لئے مضطربانہ مجبور کر دیا تھا۔ اور جو گویا ان کے زمانہ میں سرکاری نقطہ نظر سے ناپسندیدگی کا ایک صاف و صریح بیان تھا۔

کالج میں سیاسی اصول اور پالیسی پر نواب صاحب کا ایک بیان

ہز آنر کی یہ تقریر غیر موثر نہ رہی اور نواب محمد اسحاق خاں (مرحوم) کے جائزہ لیتے ہی

ایک دوسری فضا طاری ہوگئی، اُنھوں نے نواب وقار الملک کی بعض اصول کار پر اعتراض کیے جن کے نواب موصوف نے فوراً معقول و مُسکت جواب دیدئے اسی سلسلہ جواب میں ایک موقع پر اُنھوں نے اس اصول و پالیسی کی بھی توضیح کی جس کے ماتحت پالیٹکس کو دو حصوں مجاز و ممنوعہ پر منقسم کر کے کالج میں مجاز پالیٹکس پر طلبا کا مباحث میں حصہ لینا ضرور تصور کرتے تھے اور اس کا انسداد ایک بڑی غلطی کو مرادف سمجھتے تھے اُنھوں نے لکھا

ہر ایک کارروائی جو اس غرض سے اختیار کی جاوے کہ برٹش گورنمنٹ کی حکومت کو ہندوستان سے ملیامیٹ کر دیا جاوے وہ ممنوع پالیٹکس میں داخل ہے۔ جس کی کالج بلکہ بیرون کالج میں بھی اجازت نہونی چاہیئے لیکن میں بآواز بلند کہتا ہوں کہ بدون اس امتیاز کے کہ کونسی بحث طلبار کے لئے مفید اور کونسی مضر ہے مطلق پالیٹکس کے نام سے کالج میں نفرت کا اظہار کرنا اور طلبار کو اس سے باز رکھنا کالج اور قوم کے حق میں ایک سخت مہلک پالیسی ہوگی اور اس کا نتیجہ یہ ہوگا کہ ہمارے کالج میں اکثر طلبا اکسٹریمسٹ ہوکر نکلا کریں گے، کیونکہ کالج میں ان کو اپنے خیالات کی اصلاح کا موقع نہ ملے گا، اور بیرون کالج مسموم خیالات کی ہوا جو ان کو ہر طرف گھیرے ہوئے ہوگی ان کے دماغوں کو پراگندہ کردے گی۔ زمانہ بہت جلد جلد ترقی کر رہا ہے۔ پلیٹ فارم اور پریس پرانے خیالات کو خارج کر رہے ہیں اور نئے خیالات ان کی جگہ داخل ہو رہے ہیں۔ آج یہ پرانی آواز کالج کو پالیٹکس سے کوئی تعلق نہ ہونا چاہیئے، محض ایک بودی اور بے اثر آواز ثابت ہو رہی ہے جس میں بجائے نفع کے نقصان کا اندیشہ ہے کبھی وہ قوم کامیاب نہیں ہوسکتی جو زمانہ کے انقلاب کے ساتھ اس بات پر غور نکرے کہ اس وقت ہم کو کونسا طریقہ اختیار کرنا چاہیئے جو ہماری

حیات اور بقا کے لئے ضروری ہے اس وقت ہمارا یہ فرض ہونا چاہئیے
کہ جو مسموم ہوائیں طلباء کے خیالات پر اثر ڈالتی ہیں اُن سے ان کی حفاظت
کریں اور ان کو بتائیں کہ ان کے واسطے مفید پالٹیکس کیا ہے اور مضر
پالٹیکس کیا ہے۔ لیکن اگر ہم ان کو شروع ہی سے ان مباحث سے ناآشنا
رکھیں گے تو وہ اس پلیٹ فارم پر آیندہ بالکل جاہل رہیں گے اور خیالات کا جو
نتیجہ ہوا کرتا ہے اُس سے وہ محفوظ نہ رہیں گے لہذا ضرور ہے کہ جس طرح شروع
سے ہم مذہبی عقائد کو اپنے طلباء کے ذہن نشین کرنا ضروری سمجھتے ہیں، ان کو
نماز اور روزہ کا خوگر کرتے ہیں۔ اسی طرح ملکی معاملات کے متعلق بھی شروع
سے ان کو تعلیم دیں البتہ یہ کام کالج کے منتظموں کا ہے کہ وہ اس کوشش
کے وقت پوری اصابت رائے سے کام لیں اور کھرے سے کھوٹے کو الگ کریں
یہ نہیں کہ ان باتوں کو بھی جو ہندوستان میں انگریزی حکومت کی بیخ کن
نہ ہوں ممنوع پالٹیکس میں داخل کر دیں۔ افراد خاص کی رائیں ہمیشہ
تبدیل ہوتی رہی ہیں۔ ہم کو اپنی قومی پالیسی قرار دیتے وقت جہاں تک
ممکن ہو پورے مشورہ اور غور سے کام لینا چاہئیے جس قسم کی غلطیاں
میں اب کالج میں ہوتے دیکھ رہا ہوں کہ زمانہ کے روز افزوں انقلاب
سے آنکھیں بند کر کے پُرانی باتوں کو دہرایا جاتا ہے اسی قسم کی
غلطیاں گورنمنٹ کے افسروں سے بھی اکثر ظاہر ہو رہی ہیں، اور
آج کے زمانہ میں گذشتہ زمانہ کی طرح اپنی کارروائیاں جاری رکھنے
اور رعایا کو بدستور جکڑ بند رکھنے کی پالیسی اختیار کرنا چاہتے ہیں۔
مگر اُمید ہے کہ برٹش گورنمنٹ کے مُدبّرین سے برٹش مراد ہے،
ان زنجیروں کی پرواہ نہ کریں گے اور اپنی گورنمنٹ کو زمانہ کے

مناسب دانشمندی کے ساتھ چلائیں گے ہماری قوم گذشتہ زمانہ میں اس قسم کی غلطیوں کا شکار ہو چکی ہے، اُس نے یہ کچھ نہ دیکھا کہ اُس کے عروج کا آفتاب لب بام پہنچا بلکہ غروب ہوگیا اور ادبار کی سیاہی اس پر چھاگئی اور جو سامان اپنی ترقیات کے اُس کو اختیار کرنا چاہیئے تھے، وہ اُس نے ذرا بھی اختیار نہ کئے فی زمانا جن علوم و فنون کی ضرورت ہے اور جس بیداری سے کام کرنا چاہیئے وہ کچھ نہ کیا اور اپنی اُسی پہلی گہری نیند میں سوتے رہے، اور اُس کا جو خمیازہ اُٹھانا چاہیئے تھا وہ اُٹھایا۔
اِس وقت جو کچھ تھوڑی بہت ترقی کے آثار ہمارے قوم میں پائے جاتے ہیں وہ صرف اس بات کا ثمرہ ہے کہ قوم کو کسی قدر اس کا احساس ہو چلا ہے کہ اب پہلا زمانہ نہیں رہا۔ ہم کو انقلاب زمانہ کے مناسب اپنی رفتار قایم کرنی چاہیئے۔



باب چہاردہم

مُسلم یونیورسٹی کی تحریک

سرسید اور اُن کے رفقاء کار کا ابتدا سے ایک "یونیورسٹی" بنانے کا ارادہ تھا۔ اگرچہ ناگزیر اسباب سے مدرسۃ العلوم (ایم اے او کالج) کے قیام پر قناعت کرنی پڑی اور اس کو سرکاری سررشتہ تعلیم اور یونیورسٹی کے ماتحت رکھنے پر مجبور ہوئے لیکن قومی یونیورسٹی کا ارادہ قایم رہا، سرسید کے بعد نواب محسن الملک نے اس کے متعلق قوم میں ایک جوش پیدا کر دیا سرسید میموریل فنڈ قایم کر کے سرمایہ کی کوشش شروع کر دی اور کانفرنس کے اجلاسوں میں اس کی اہمیت و ضرورت پر زور دیا گیا ۱۹۰۲ء کے اجلاس منعقدہ دہلی میں ہز ہائینس سر آغا خاں نے خاص طور پر قوم سے اپیل کی، غرض ۱۸۹۸ء سے ۱۹۰۹ء تک کالج کی ترقی و وسعت اور مرکزیت سب اُسی ارادہ کی تکمیل کا ذریعہ تھا جنوری ۱۹۱۰ء میں جب کہ ہز ہائینس علی گڑھ تشریف لائے تو اس مقصد کے متعلق نواب وقار الملک اور دیگر اعیان قوم سے تبادلہ خیالات کیا اس کے بعد نومبر ۱۹۱۰ء میں نواب صاحب کے ایک خط کے جواب میں ہز ہائینس نے یورپ سے لکھا کہ "اس تحریک کا آغاز کر دیا جائے جس کے دائرہ میں اس وقت کی اور تحریکیں شامل ہو جائیں" اُنھوں نے اس امر پر بھی زور دیا کہ "مختلف فنڈز بند کر دئے جائیں تاکہ کوششیں منقسم نہ ہوں" پھر دسمبر میں جب کہ بمقام ناگپور کانفرنس کا اجلاس ہو رہا تھا، ہز ہائینس نے شریک ہو کر اعلیٰ حضرت ملک معظم قیصر ہند کو ورود ہند کے موقع پر محمڈن یونیورسٹی کے قیام کی اُمید دلائی اور پر زور کوشش کا مشورہ دیا کانفرنس میں ایک

رزولیوشن بھی پاس کیا گیا، جنوری ۱۹۱۱ء میں علی گڑھ میں ہز ہائینس کے زیر صدارت ایک جلسہ مشاورت منعقد ہوا اور فراہمی سرمایہ کے لئے بمقام علی گڑھ سنٹرل کمیٹی اور تمام ہندوستان میں صوباتی کمیٹیوں کا قیام عمل میں آیا سنٹرل کمیٹی کے پریسیڈنٹ ہز ہائینس اور سکرٹیری نواب وقار الملک منتخب ہوئے اور ممبروں میں ہر ایک جماعت اور طبقہ کی کی موثر نمائندگی رکھی گئی صوبوں میں بھی عہدہ داروں کا انتخاب ہوا، سنٹرل کمیٹی کا دفتر فوراً قائم کر دیا گیا، کانسٹی ٹیوشن (دستور اساسی) بائی لاز ریگولیشنز وغیرہ مرتب کرنے کے لئے ایک جداگانہ کمیٹی کی تاسیس ہوئی جس میں ماہرین تعلیم ممبر و عہدہ دار مقرر کئے گئے۔ تمام کمیٹیوں پر سنٹرل کمیٹی کے سکرٹیری نگرانی رکھی گئی۔

سکرٹیری کی مصروفیتیں اب جس قدر اس تحریک کا اثر وسیع ہوتا جاتا تھا اسی نسبت سے سکرٹری کی مصروفیتوں میں بھی وسعت ہوتی جاتی تھی مختلف اپیلوں کی تیاری اخبارات کے لئے مضامین خاص و عام خطوط کے جوابات ڈپوٹیشنوں میں شرکت اور دورے ہر جگہ مقامی اصحاب سے تبادلہ خیالات متعدد کمیٹیوں کی شرکت کانسٹی ٹیوشن پر بحث و تمحیص حکام تعلیم سے ملاقاتیں اور گفتگوئیں پبلک کے اطمینان و غور کے لئے بعض خاص مضامین اخباری اعتراضات کے جوابات یہ سب اتنا عظیم الشان کام تھا کہ صرف نواب وقار الملک کی ہی ہمت و طاقت تھی جو وہ اس پیرانہ سالی اور عوارض لاحقہ کی حالت میں کالج کے روزمرہ کے کاموں میں تاخیر و نقص کے بغیر انجام دیتے رہے،

چندے اور عطیات تمام قوم کو اُن پر جو عام اعتماد تھا اُس کے باعث روسائ و امرا کے علاوہ عام طبقوں میں بھی اس تحریک نے کامیابی حاصل کی اور جدید تعلیم یافتہ گروہ کے علاوہ علما اور صوفیا و مشائخ نے بھی اُس کو تقویت دی جس طرح والیان ملک امرا اور تجار نے لاکھوں روپئے عطا کئے اسی طرح

غربا اور امرا نے دو روپے تک نے آنے اور پیسے پیش کئے۔

وعدوں کے بعد چندوں کی وصولی کا بھی نہایت سخت کام ہوتا ہے اور پھر جب کہ اس کا تعلق ہندوستان کے گوشہ گوشہ سے ہو نواب صاحب نے اس معاملہ میں بھی خاص کوشش کی اور اُس تجویز کے اتباع میں کہ تمام ٹرسٹی اور اولڈ بوئز کانفرنس کی سنٹرل اسٹینڈنگ کمیٹی کے ممبر اپنی ایک ماہ کی آمدنی یونیورسٹی فنڈ میں دیں جب تک اپنا آٹھ سو روپیہ چندہ ادا نہیں کر دیا کسی شخص پر تقاضہ نہیں کیا اور نہ تقاضہ کے خطوط و کاغذات پر دستخط کئے۔

الحاصل جنوری سنہ ۱۹۱۱ء تا آخر سنہ ۱۹۱۲ء ۷½-۷-۵۷۳۳۶،۱۴ کے کل وعدے ہوئے تھے جن میں سے ۲-۲-۸۴۰۷،۳،۲۶ وصول ہو کر ۵½-۵-۵ ۷۶۹۵۲،۱۵ باقی رہا۔ اس کے علاوہ تین لاکھ چھتر ہزار روپیہ بشکل سرمایہ دوامی حاصل ہوا۔

بعض مراحل لیکن ان مراحل میں چند نہایت دشوار گزار مرحلے بھی پیش آئے جن میں نواب صاحب کو ذاتی طور پر بہت سی مشکلات کے مقابلے اور حکومت کی رائے اور اپنے رفقاء کار سے اختلافات کرنے پڑے۔

کانسٹی ٹیوشن کا پہلا مسودہ جن اصول پر مرتب ہوا تھا وہ اُن ہی کے الفاظ میں یہ تھا کہ

> گورنمنٹ کو یہ امر ضرور دیکھنا ہوگا کہ وہ اس بات پر اطمینان کر سکتی ہے کہ مسلم یونیورسٹی کے طلبا ایسی ہی قابلیت اور ایسے ہی اعتماد کے قابل ہوں گے جیسے دوسری سرکاری یونیورسٹیوں کے طلبا ہوتے ہیں اور اس کے لئے کام کرنے والوں پر اعتبار، قواعد و ضوابط اور مالی حالت کی تنقید لازمی ہے اسی کے ساتھ ہم نے اس کو استحقاق سمجھا تھا کہ ہم یہ خواہش کریں کہ گورنمنٹ کو ہر

قسم کا ضروری اطمینان دلانے کے بعد ہم کو بھی ایک ایسی واجبی آزادی حاصل ہونی چاہئے جو مجوزہ یونیورسٹی کو عام نگاہوں میں باوقعت ثابت کرے اور اُس کے چلانے والوں کے بھی اعزاز کے منافی نہ ہو۔

ریگولیشنز وغیرہ کے متعلق کاروائیاں

نواب صاحب کی سبکدوشی کے بعد سنٹرل کمیٹی مسلم یونیورسٹی نے فیصلہ کیا کہ یونیورسٹی کے متعلق کل مراسلات کا تعلق ان ہی سے رہے باوجود ناسازی طبع وہ کام کرتے رہے لیکن اس کے بعد ہی جب ریگولیشنز کا مسودہ تیار ہوا تو اُس میں ان کو اپنے رفقائے کار سے بعض امور میں اختلاف تھا اور چوں کہ عوارض لاحقہ کے باعث وہ اپنی ذمہ داری سے سبکدوش ہو رہے تھے اور آیندہ کمیٹیوں کی شرکت سے مجبوری و معذوری بھی نظر آ رہی تھی اس لئے اُنھوں نے پبلک کی اطلاع کے لئے ایک اہم بیان شائع کرنا مناسب سمجھا جس میں اپنی مجبوری و معذوری اور علالت و ناسازی طبع کا تذکرہ کرنے کے بعد لکھا تھا کہ

اب یہ وہ وقت ہے جب کہ میں نہایت افسوس کے ساتھ یونیورسٹی کے قواعد و ضوابط پر غور اور بحث کرنے سے گویا دائمی مفارقت کرتا ہوں اور اب اس موقع پر چند الفاظ کا بزرگان قوم کی خدمت میں صاف صاف عرض کر دینا اپنا اخیر اور نہایت اہم فرض سمجھتا ہوں اور ایسی حالت میں اگر مجھ سے کوئی امر خلاف رازداری بھی سرزد ہوتا ہو تو میں اس کی معافی چاہتا ہوں کیوں کہ قوم کو اصلی حالت سے بے خبر رکھنا یہ اس سے بھی زیادہ گناہ ہے۔

واقعات یہ ہیں کہ ابتدا سے اس وقت تک جن دوستوں کے ہاتھ میں قواعد و ضوابط کے مسودات کا مرتب کرنا رہا ہے اُنھوں نے ہمارے قومی مقاصد کی بہ نسبت اسٹاف کی اغراض کو اپنے مسودات میں زیادہ ملحوظ رکھا ہے۔

لیکن ان سے زیادہ تعلیمی معاملات میں دوسرا کوئی تجربہ کار اور واقف کار شخص (جو اپنا اس قدر وقت اس کام میں دے سکتا) موجود بھی نہ تھا اور فی الواقع اُنھوں نے اس کام میں بہت ہی زیادہ محنت برداشت کی جس کے لحاظ سے وہ ہر طرح شکریہ کے مستحق ہیں اور جو نقصانات کہ اُن کے مسودات میں تھے اُن کی نسبت ان لوگوں نے جن کو قومی مقاصد کا لحاظ زیادہ تھا یہ خیال کر لیا تھا کہ بالفعل وہ کل خیالات معرضِ تحریر میں تو آجانے چاہئیں جو ان تجربہ کار اور لائق مصنفین مسودات کے نزدیک ضروری ہیں اس کے بعد پھر دوسرے لوگ جب ان پر غور کریں گے تو اُن کو اعتدال کی حالت میں لے آئیں گے چنانچہ ایسا ہی ہوا اور انسٹیٹیوٹس (جن کا تصفیہ اس سے پہلے کانسٹی ٹیوشن کمیٹی کے سامنے ہو چکا ہے) ان کے متعلق یہی عمل ہوا اور بعد بہت عریض و طویل مباحثات کے مسودہ نے ایک اعتدال کی صورت اختیار کی گو کہ میں جرأت کے ساتھ اب بھی یہ عرض کرنے کی معافی چاہتا ہوں کہ قومی مقاصد کے لحاظ سے اب بھی اس میں بعض اہم سقم رہ گئے ہیں مگر پھر بھی جو کچھ ہو گیا ہے بسا غنیمت ہے گزشتہ کمیٹیوں اور مباحثات کے وقت میں نے اپنے آپ کو بالکل اپنی قوم کے وکیل کی حیثیت سے قایم رکھا اور کتنے ہی اصحاب نے بھی اور خاص کر جناب آنریبل سر راجہ صاحب محمود آباد نے جہاں تک ممکن تھا اپنے قومی مقاصد ملحوظ رکھنے میں پوری کوشش کی۔ مجھے کسی ممبر کمیٹی کے متعلق بھی یہ عرض کرنے کا حق نہیں ہے کہ اُنھوں نے قومی مقاصد کی پوری حفاظت نہیں کی بلکہ میں بلا عذر یہ تسلیم کرنے کے لئے موجود ہوں کہ ہر ایک نے جو رائے دی وہ نہایت نیک نیتی کے ساتھ دی اور اسی طرح میں مصنفینِ مسودات کی نیتوں پر بھی کوئی حملہ کرنا ناانصافی میں داخل

سمجھتا ہوں لیکن نیک نیتی سے کسی کا رائے دینا اور بات ہے اور اس رائے کا قومی مقاصد کے واسطے مفید یا مضر ہونا بالکل جداگانہ امر ہے۔ ممکن ہے کہ میں جو رائے رکھتا ہوں مضر ہو اور جن کی رائے میری رائے سے خلاف ہو اُن ہی کی رائے قوم کے حق میں مفید ہو۔ لیکن اس سے کسی کو انکار نہیں ہو سکتا کہ جب اختلافات موجود ہوں تو معاملات بہت ہی زیادہ غور کے محتاج ہوں گے اور قوم کا یہ فرض ہے کہ جب ان کا ایک ایسا وکیل جو کالج کے سکریٹری کی پوزیشن میں تھا کمیٹی سے علٰحدہ ہوتا ہے تو آیندہ بزرگانِ قوم بہت زیادہ اپنے حقوق کی حفاظت کا خیال کریں۔

رگولیشنز کا مسودہ انگریزی جو غور کے لئے چھاپا گیا ہے اور ممبرانِ کمیٹی کی خدمت میں بھیجا گیا ہے اور جس کے تصفیہ کے لئے ۳ رجون کی تاریخ مقرر ہے اور لکھنؤ میں کمیٹی منعقد ہونے والی ہے اس پر جہاں تک مجھ کو غور کرنے کا موقع ملا ہے وہ بہت ہی زیادہ اصلاح کا محتاج ہے اور جو کچھ اس میں اس وقت درج ہے اگر بدقسمتی سے وہی اخیر وقت تک قایم رہ جائے تو میں صاف یہ رائے دوں گا کہ ایسی یونیورسٹی کو ہمیں دور ہی سے سلام کرنا چاہیئے۔ جس کے رگولیشنز کے ذریعہ سے ہم اپنی اس آزادی کو بھی کھو بیٹھیں گے جو آج ہم کو علی گڑھ کالج کی موجودہ حالت اور موجودہ قانون کے بموجب حاصل ہے . . . .

میں نے ان سب اور دوسرے خطرات سے عالی جناب آنریبل سر راجہ صاحب بہادر محمود آباد کو (جو کانسٹی ٹیوشن کمیٹی کے معزز پریسیڈنٹ ہیں) اطلاع دے کر درخواست کی تھی کہ مسائل مندرجہ مسودہ ریگولیشنز پر غور کرنے کی غرض سے کچھ ایسے جدید ممبر کانسٹی ٹیوشن کمیٹی میں شامل

کیے جائیں جن کو قوم اپنا قایم مقام تسلیم کرے اور وہ بھی اسی قسم کی ذمہ داری محسوس کرتے ہوں ...... آخر میں مجھ کو اندیشہ ہے کہ ممبر صاحبان کانسٹی ٹیوشن کمیٹی سے شاید کسی صاحب کو میری گزارش ناگوار گذرے اور بدقسمتی سے ایسا ہو تو میں اُن بزرگوں کی خدمت میں اپنی اس جسارت کی بہت بہت معافی چاہتا ہوں میں نے جو کچھ عرض کیا ہے نہایت مجبوری کی حالت میں عرض کیا ہے ایک طرف جب قوم کی کشتی طوفان میں آئی ہوئی ہو تو جو کچھ بھی کوشش ممکن ہے وہ اس کے بچانے میں صرف کی جاسکتی ہے اور جب کہ اس کشتی کو بچانا ہمارا سب کا متفقہ مقصد ہے تو مجھ کو اُمید ہے کہ کوئی بھی ہم میں سے میری اس جسارت پر برا نہ مانے گا۔

جہاں تک ہماری اس کارروائی کا تعلق گورنمنٹ سے ہے وہاں تک مجھ کو ذرا بھی کسی بات کا اندیشہ نہیں ہے جس قدر تجربہ اب تک مجھ کو گورنمنٹ کے متعلق ان معاملات میں ہوا ہے اس کے لحاظ سے میں پورے بھروسہ کے ساتھ اپنی قوم کو اطمینان دلاتا ہوں کہ گورنمنٹ نے نہایت سیر چشمی اور مہربانی کے ساتھ ارادہ کر لیا ہے کہ وہ مسلمانوں کو اور ہندوؤں کو یونیورسٹیاں دے گی مشکل جو کچھ ہمارے اندرونی اختلاف کی طرف سے ہے اور زیادہ تکلیف ہم کو ہمارے مصنفین مسودات سے پہنچ رہی ہے اور اس تکلیف کو اگر ہم نے آسانی یا مشکل کے ساتھ جس طرح بھی ہو سکے دفع کر دیا تو پھر گورنمنٹ کے ساتھ معاملہ زیادہ مشکل نہیں رہتا اور اگر کسی معاملہ میں ہمارے اور گورنمنٹ کے درمیان اختلاف ہے یا آیندہ ہو تو اس پر ہم اخیر وقت تک پوری طرح گورنمنٹ سے جھگڑ سکتے ہیں۔

آخر میں اُنھوں نے مسئلہ الحاق کو (جس کی نسبت گورنمنٹ نے اس وقت تک انکار

نہیں کیا تھا) بطور مثال بیان کیا اور سرکاری ممبران کونسل کی تائید کا تیقین کر کے کانسٹی ٹیوشن کمیٹی اور کالج ٹرسٹیز کمیٹی کو باہم اتحاد عمل کی نصیحت و وصیت کی۔

گورنمنٹ کمیونک پر اظہار رائے

جولائی ۱۹۱۲ء میں گورنمنٹ آف انڈیا کے صیغہ تعلیم کی طرف سے یہ اعلان شائع ہوا کہ

> یہ قطعی طور پر فیصلہ ہو گیا ہے کہ علی گڑھ اور بنارس کی یونیورسٹی کا دائرہ (اثر) اسی مقام تک محدود رہو جس میں کہ وہ (یونیورسٹی) واقع ہو۔

اس اعلان سے تمام مسلمانوں میں مایوسی اور افسردگی پھیلی اور اس کا اثر چندوں پر بھی پڑا صورت حال پر غور کرنے کے لئے ۱۱ و ۱۲ اگست کو لکھنؤ میں کانسٹیٹیوشن کمیٹی طلب کی گئی لیکن جلسہ سے ایک دن قبل ممبر تعلیم حکومت ہند کا ایک اور برقی مراسلہ موصول ہوا جس میں حق الحاق کی نامنظوری کے ساتھ اور ترمیمات و شرائط بھی تھیں جن کا تعلق چانسلر کے اختیارات و نصاب تعلیم سے تھا اور ایک اہم ترمیم یہ تھی کہ: "مسلم یا محمڈن یونیورسٹی" کے نام کی جگہ "یونیورسٹی علی گڑھ" نام ہوگا اس طرح نام کی خصوصیت بھی مٹادی گئی۔ اور پھر بھی قانون اساسی اور تفصیلات کے متعلق وزیر ہند کا حق محفوظ رکھا گیا۔

گورنمنٹ کے ان اعلانات نے ہندوستان کے اس سرے سے اُس سرے تک ایک عام بے چینی! ہر طبقہ کے اور ہر درجہ کے اصحاب نے اس کے خلاف اتنا سخت اور متفقہ احتجاج کیا کہ مسلمانوں کی جدید تاریخ میں اب تک بھی کوئی نظیر نہیں۔

نواب وقار الملک نے جو اسی مہینہ میں کالج کی سکریٹری شپ سے سبکدوش ہو رہے تھے پہلے اعلان پر قوم کی توجہ کے لئے یہ بیان شائع کیا کہ:۔

> جس نے اس اعلان کے مضمون کو دیکھا اور سُنا ہے وہ سخت مایوس ہوا ہے سَو آدمیوں میں ۹۹ کے قریب اسی امید میں تھے اور اُن کی دلی خواہش

بھی تھی کہ مسلم یونیورسٹی کا مرکز علی گڑھ ہو لیکن دیگر مقامات کے کالج اور اسکول بھی
اس سے ملحق ہو سکیں گے تمام ہندوستان کے مسلمانوں نے اسی اُمید پر چندہ
دیا ہے کہ یونیورسٹی کے فیض سے ہر حصہ کے مسلمان مستفید ہوں گے اس حق سے
اُن کا محرمان نہایت قابل افسوس ہے لیکن میری رائے تو یہ ہے کہ باوجود
گورنمنٹ کے اُس اعلان کے مسلمانوں کو بدستور اپنی خواہش پر قائم رہنا چاہئیے
اور اپنی طرف سے اس اعلان پر رضامند نہ ہونا چاہئیے ہماری آیندہ نسلیں
جو عدم الحاق کے نقصانات سے متاثر ہوں گی وہ ہمارے اوپر لعنت
بھیجیں گی گورنمنٹ مالک ہے مختار ہے وہ کوئی حق ہم کو دے یا نہ دے لیکن
کسی ایسی تجویز پر جیسی کہ یہ حال کی تجویز گورنمنٹ کی طرف سے شائع ہوئی ہے
ہمارا رضامند ہونا ہرگز مناسب نہیں ہے ہم کو جائز حق تک اپنی معروضات
گورنمنٹ میں ہمیشہ بھیجتے رہنا چاہئیے ہماری گورنمنٹ ایک منصف گورنمنٹ ہے
جب کبھی وہ ہمارے دلائل پر مطمئن ہو جائے گی تو اُس کو ہمارے مفید حکم دینے
میں ذرا سا بھی تامّل نہ ہوگا۔

یہ بات مدّت سے محسوس ہوتی چلی آرہی ہے کہ گورنمنٹ غریبوں کو اعلیٰ تعلیم
سے روکتی ہے تعلیم کے مصارف کا روز بروز بڑھتا جانا اس بات کی صاف
دلیل ہے اور اب یہ حال کا حکم سونے پر سہاگہ کا کام دیتا ہے۔

اس کے بعد حکومت کے اعلانات پر غور کرنے کے لئے اگست (۱۹۱۲ء) میں بمقام
لکھنو کانسٹیٹیوشن کمیٹی کا ایک جلسہ منعقد ہوا جس میں بلا اختلاف الحاقی یونیورسٹی پر زور
دیا گیا۔ سر راجہ محمود آباد، آنریبل سر میاں محمد شفیع[1] کی تقریریں بہت پر زور تھیں اور

---

[1] ۱۹۲۰ء میں سر شفیع کی ہی لا ممبری کے زمانہ میں مسلم یونیورسٹی ایکٹ پاس ہوا جو ان تمام امیدوں
کے خلاف ہے جس کے پورا کرنے کے لئے بڑے بڑے معرکے ہوئے۔

آخر الذکر نے تو پنجاب کے مسلمانوں کی طرف سے یہاں تک نوٹس دیدیا کہ اگر مقامی یونیورسٹی قبول کی گئی تو کانسٹیٹیوشن کمیٹی کے مقابلہ میں عدالتی کارروائی کی جائیگی آنریبل سر فخرالدین بہاری نے اپنے صوبہ کی جانب سے آنریبل سر شفیع کی زبردست تائید کی، ہز ہائینس سر آغا خاں، اور دیگر اکابرین ملت کے تار اور خطوط پیش ہوئے جو مقاصد جلسہ کی تائید میں تھے۔ بالآخر قانون اساسی میں یونیورسٹی کو محدود کرنے سے انکار کیا گیا اور دیگر مسائل بھی زیر بحث لائے گئے۔ گورنر جنرل بہ اجلاس کونسل کے اختیارات سے اختلاف اور نام کے متعلق اظہار رنج کیا گیا اور قرار دیا گیا کہ قانون اساسی پر گورنمنٹ کے جو اعتراضات ہوں اُن کو غور کے لئے دریافت کیا جائے اور آخری فیصلہ فونڈیشن کمیٹی کرے اور ممبر تعلیم کے مراسلہ کا مسودہ جواب تیار کرنے کے چھ اصحاب کی ایک سب کمیٹی ترتیب دی گئی، جس نے دوسرے دن اس کا مسودہ مرتب کیا اور وہ پاس ہوگیا۔

نواب صاحب سکون و آرام اور درستی صحت کے لئے دیرہ دون میں مقیم تھے اس لئے شریک نہ ہوسکے مگر یہاں اُنھوں نے ایک آزاد "جامعہ اسلامیہ" کے متعلق اسکیم تیار کی جو اُردو انگریزی میں شایع کی گئی۔ پہلے حصہ میں وزیر ہند کی تجاویز کی مضرت اور الحاقی یونیورسٹی کی ضرورت پر بحث کی اور مسلمانوں کو اپنی متفقہ جدوجہد جاری رکھنے کی ہدایت کی دوسرے حصہ میں جدوجہد میں ناکامی کی صورت میں آزاد "جامعہ اسلامیہ" پر ایک مبسوط بحث کی جس کو حکومت کے چارٹر کی ضرورت نہیں۔ نام کے مسئلہ پر اُنھوں نے لکھا کہ:-

یونیورسٹی کے نام کی نسبت اس قدر عرض کرنا کافی معلوم ہوتا ہے کہ جس وقت سے سکریٹری آف اسٹیٹ کا دفتر قائم ہوا ہے اُس وقت سے لے کر آج تک شاید کبھی ایسی غلط پالیسی کا اظہار حضور ممدوح کی طرف سے نہ

ہوا ہوگا۔ جس سے تکلیف تو ساڑھے اکتیس کروڑ رعایا دلوں کو پہونچی ہو اور نفع
ایک رتی کے برابر بھی نہ ہوا ہو اگر مقامی ہی یونیورسٹی قائم کرنا مقصود تھا تو بھی
رعایا کے دلوں کو اس قدر سخت تکلیف پہنچائے بغیر دونوں یونیورسٹیوں کا
نام "علی گڑھ مسلم یونیورسٹی" اور "بنارس ہندو یونیورسٹی" ہو سکتا تھا۔

پھر یہ دکھا کر کہ مسلم یونیورسٹی کا دروازہ تمام قوموں کے لئے کھلا رہے گا اور ایم اے او
کالج میں باوجود اس اسلامی خصوصیت کے جو اس نام میں ہے مختلف قوموں کے طلبا
تعلیم پا رہے ہیں لکھا کہ :۔

> اگر آج ہم اپنی یونیورسٹی میں "مسلم" کے لفظ کو خارج کرنے پر رضامند ہو جائیں
> تو کل کو یہ کس قدر مہمل بے جوڑ بات معلوم ہونے لگے کہ یونیورسٹی میں تو اسلام کا
> کوئی تعلق نہ ہو اور اس کے کالج محمڈن کالج کہلائیں اور کیا تعجب ہے کہ اس وقت
> حضور سکریٹری آف اسٹیٹ ہم سے ہمارے ہر دلعزیز کالج کے نام کی اصلاح کی
> بھی خواہش کریں اور آج وہ زمانہ نہیں ہے کہ ہم گورنمنٹ کے افسروں کی
> رائے کو صحیفہ آسمانی سمجھ کر بے چوں وچرا تسلیم کریں گے۔ برٹش گورنمنٹ
> کو اپنی یہ خوبی بھولنی نہیں چاہئے کہ اس کی بنیاد قوت اور طاقت پر نہیں
> ہے بلکہ عدل و انصاف پر ہے۔ کوئی دلیل سکریٹری آف اسٹیٹ نے
> اس موقع پر بیان نہیں کی کہ کن وجوہ سے وہ ہماری قومی یونیورسٹی سے ہماری
> مذہبی جھلک کو علحدہ کرنا ضروری سمجھتے ہیں۔

مسئلہ الحاق اور سرکاری یونیورسٹی کے دائرہ اثر اور وزیر ہند کے فیصلہ پر روشنی ڈالتے
ہوئے تحریر کیا کہ :۔

> اس قسم کی ترجیحات بلا مرجح کا اثر ملک کے طبائع پر برا پڑتا ہے اور لوگ
> خیال کرنے لگتے ہیں کہ یہ تمام خیالی وجوہ صرف اس لئے تراشے گئے ہیں کہ

ہماری مجوزہ یونیورسٹی سے معدودے چند طلبا کے سوا عام طور پبلک کو مستفیض ہونے کا
موقع نہ ملے ورنہ کیا وجہ ہو گی کہ گورنمنٹ اپنی یونیورسٹی میں کچھ اصلاح نہیں کرتی
اور جس قدر خوبیاں ممکن ہیں وہ سب ہمارے ہی لئے ضروری خیال کرتی ہے۔
حالاں کہ ترقی کا عام اصول جیسا کہ ترقی کے نام سے ظاہر ہے ہمیشہ یہ ہے
کہ ابتدا ابتدا میں جس قدر فوائد بھی بہ آسانی حاصل ہونے ممکن ہوتے ہیں ان پہ
اکتفا کیا جاتا ہے اور پھر رفتہ رفتہ ان میں ترقی ہوتی رہتی ہے اس اصول پر
اگر از راہِ انصاف عمل کیا جائے تو گورنمنٹ کا پہلا فرض یہ ہے کہ وہ اپنی
قدیمی یونیورسٹیوں میں اصلاح اور ترقی کی طرف توجہ کرے اس کے بعد جب
ہمارا وقت آئے گا اور ہمارا کاروبار اچھی طرح جاری ہو جائے گا تب رفتہ
رفتہ ہم بھی ہر ایک قسم کی ترقی کے وسائل مہیا کر سکیں گے ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔
۔ ۔ ۔ ۔ مگر حال میں حضور سکریٹری آف اسٹیٹ نے جو فیصلہ نافذ فرمایا ہے وہ
ضرور اس قسم کا فیصلہ ہے جس میں گورنمنٹ کی تمام خواہشات اور ضروریات
و مشکلات کی یک طرفہ حفاظت تو کر لی گئی ہے لیکن رعایا کی مشکلات اور
ان کی ضروریات کی طرف کسی قسم کی ہمدردی کا اظہار نہیں کیا گیا بلکہ یہ
کہنا بھی مبالغہ میں داخل نہیں ہے کہ اُن سے بالکل بے پروائی برتی گئی ہے
اور کسی قسم کا احساس ہماری فیلنگس کو صدمہ پہنچنے کے متعلق نہیں کیا گیا۔
اور اس بات کی بھی مطلق پروا نہیں کی گئی کہ حضور شہنشاہ معظم نے جو مفید
اثر اپنی تشریف آوری ہندوستان سے رعایا کے دلوں میں پیدا کیا تھا
اس کو صدمہ نہ پہنچ جائے ان ہی بالا دست افسروں کی موجودگی میں جو
حضور شہنشاہ معظم کی تشریف آوری کے وقت حکمراں تھے پالیسی کا انقلاب
تعجب سے خالی نہیں جس سے قیاس کرنا بے محل نہ ہو گا کہ گورنمنٹ نے

ایک وقت میں جو چیز دیتی ہی تھی اب وہ اس کا دینا رعایا کو مناسب نہیں سمجھتی اور ایسے اسباب پیدا کئے جاتے ہیں جس سے ہم لوگ تنگ آکر ایسی یونیورسٹی کے لینے ہی سے عذر کریں۔

آزاد جامعہ کی اسکیم میں سرسید کے اصلی مقصد وغیرہ کو بیان کر کے تعلیم کے پروگرام بدلنے پر زور دیا اور مشورہ پیش کیا کہ جو سرمایہ جمع ہوا ہے اور ہو رہا ہے وہ "جامعہ اسلامیہ" پر صرف کیا جائے۔ جامعہ کے مقاصد میں اس امر کی وضاحت کی ہے کہ :۔

ایسے گروہوں کی تعلیم کا انتظام کیا جائے جو سرکاری ملازمتوں یا ڈگریوں کے خواہاں نہیں اور صرف تعلیم کے خواہاں ہیں مثلاً بڑے بڑے مسلمان امرائ تجار، علمار، اطبأ، اور وہ لاکھوں شرفاء جو زمانہ حال کی سرکاری تعلیم کے مصارف برداشت نہیں کر سکتے اور مختلف پیشوں، حرفتوں اور خانگی ملازمتوں کے ذریعہ سے اپنی روزی پیدا کرنے پر مجبور ہیں۔

اُنہوں نے اس تجویز میں ان تمام شعبہ ہائے تعلیم پر بھی بحث کی جو جامعہ اسلامیہ میں قایم کئے جا سکتے ہیں اور ایک حصہ عورتوں کی تعلیم کے لئے مخصوص کیا۔ ساتھ ہی امیدواران ملازمت وغیرہ کی تیاری کے لئے محمڈن کالج اور اسلامیہ کالج لاہور کو اس جامعہ کا ایک شعبہ بنانے کی تجویز کی اور ذریعۂ تعلیم زبان اُردو کو قرار دیا۔

وہ اگرچہ تعلیم جدید کے علم بردار و منادی تھے لیکن عقائد و اعمال اور اخلاق کی وہ اسلامی خصوصیات جو مسلمانوں کا مائیۂ ناز ہیں ان میں پوری طور پر مجتمع تھیں اور اُنہیں خصوصیات کو وہ مسلمانوں نوجوانوں میں پیدا کرنا چاہتے تھے چنانچہ اس کے متعلق لکھا کہ

"یہ مصیبت اور اسی قسم کی اور بہت سی مصیبتیں ہیں جن کی وجہ سے مسلمان ہر ایک قسم اصلی ترقیات سے بالکل محروم ہوتے چلے جاتے ہیں

اور جن کا کوئی علاج اس کے سوا نہیں ہے کہ ہمارے علماء کی تعلیم اور فیض صحبت سے مسلمانوں کو قرآن پاک کی ہدایتوں کی طرف راغب کیا جاوے تسخیر ممالک سے قطع نظر کر دو یہ تبتی پھرتی چھانو ہے انسان کی اصل ترقی اُس کی اخلاق کی ترقی ہے۔

پیغمبر خدا صلی اللہ علیہ وسلم نے مکارم اخلاق ہی کی تکمیل کو بعثت کی علتِ غائی قرار دیا ہے۔ اب اسلام کی تاریخ کو اُٹھا کر دیکھو کہ مسلمانوں نے اپنے مکارمِ اخلاق میں کیسی اعلیٰ درجہ کی ترقی کی تھی جس کی بدولت ایک جاہل شخص سے بھی اُن محاسن کا ظہور ہوتا ہے جس کی بڑے بڑے شائستہ عالموں اور سائنس کے ماہروں اور فلاسفروں سے بھی توقع نہیں کی جا سکتی۔ افسوس ہے کہ ہماری قوم سے یہ قوتیں سلب ہوتی چلی جاتی ہیں اور انہی مردہ قوتوں کو زندہ کرنے کی آج سب سے زیادہ ضرورت ہے اور جب قوم میں یہ زندگی پیدا ہو جاتی ہے تو سمجھ لینا چاہیے کہ قوم زندہ ہو گئی اور چند امیدواران ملازمت کو آج جس قسم کی تعلیم دی جا رہی ہے اُس سے قوم میں وہ زندگی عود نہیں کر سکتی جس کی ضرورت ہے۔

جس وقت کہ یہ اسکیم شائع ہوئی ہے تو اکثر ماہرینِ تعلیم نے اس کو ناممکن العمل قرار دے کر نظر انداز کر دیا مگر حق یہ ہے کہ ترکِ موالات کے زمانہ میں جو نیشنل یونیورسٹیاں قائم ہوئیں اُنہوں نے اس اسکیم کو ایک حد تک عملی شکل دے دی خصوصاً "جامعہ ملیہ" (دہلی) تو اسی اسکیم کی بہترین شکل ہے اور اگر رقم مجتمعہ کا نصف حصہ بھی اُس کے پاس ہو تو پورے طور پر تمام اسکیم بروئے کار آ سکتی ہے علاوہ بریں جامعہ عثمانیہ نے اپنی اس تھوڑی سی مدت میں ثابت کر دیا کہ مسلمانوں کی مادری زبان ہر قسم کے علوم و فنون کی تعلیم کا ذریعہ بن سکتی ہے۔

ہندو اور مسلمانوں کا متحدہ پلیٹ فارم قائم کئے جانے کی تحریک اور اختلاف

اُسی زمانہ میں ہندو یونیورسٹی کی تحریک بھی زور شور سے جاری تھی اور بعض اصول و حقوق اساسی میں حکومت کی طرف سے جو انکار ہوا تھا اُس سے دونوں قوموں میں ناراضی تھی اس لئے ایک جماعت کی یہ رائے تھی کہ طلب حقوق کی کوشش کے لئے دونوں قوموں کا ایک متحدہ پلیٹ فارم بنایا جائے۔ نواب وقار الملک کی خدمت میں بھی یہ معاملہ رجوع کیا گیا تو اُنھوں نے اس کے متعلق حسب ذیل رائے ظاہر کی کہ

میں نے اس مسئلہ پر جہاں تک ممکن تھا بہت زیادہ غور کیا ہے۔ میں اس بات کا بدل خواہاں ہوں کہ ہندوستان کی یہ دونوں بڑی قومیں جہاں تک ممکن ہے اپنے اختلافات کو مٹائیں جس سے خود گورنمنٹ کی مشکلات بھی اس مُلک میں بہت کم ہو جاتی ہیں اور جیسا چولی دامن کا ساتھ ان دونوں قوموں کا قدیم سے چلا آتا ہے (اور جس میں اب روز بروز ہم خلل دیکھتے ہیں) وہ بدستور اپنی پہلی حالت پر قائم رہے اور صرف چند باتوں کے سوا (جن میں درحقیقت ان دونوں کے مقاصد متضاد واقع ہوئے ہوں) باقی تمام امور میں ان کا اتحاد اور اتفاق ہونا چاہیئے۔ لیکن دونوں کے علیٰحدہ علیٰحدہ پلیٹ فارم ہی رہنا چاہئیں ایک ہی آواز دونوں پلیٹ فارموں سے بلند ہو کر بھی وہی نتیجہ پیدا کر سکتی ہے جو ایک متحدہ پلیٹ فارم سے ہوتا۔ لیکن دونوں پلیٹ فارموں کے علیٰحدہ علیٰحدہ رہنے میں بعض فوائد ایسے ہیں جو متحدہ پلیٹ فارم کی حالت میں نہیں رہ سکتے۔ سب سے بڑی بات تو یہ ہے کہ مسلمانوں کی تعداد ہندوستان میں دوسروں کے مقابلہ میں بہت کم ہے۔ اگر ہم صرف ایک پلیٹ پر ملیں تو مسلمانوں

کی ہستی علیحدہ نہ رہے گی۔ یاد کرو کہ اکتوبر سنہ ۱۹۰۶ء سے پہلے ہماری حالت کیا تھی! ہم دیکھتے تھے کہ ایک طرف انڈین نیشنل کانگریس ہے ہر صوبہ میں اس کی شاخیں (جن کا اثر ضلاع تک پہنچتا ہے) پارلیمنٹ میں ان کے حقوق کی کافی حفاظت کی جاتی ہے پریس کی نہایت زبردست قوت اُن کی مدد پر ہے، دولت اس گروہ کے ہاتھ میں ہے علم ان کے پاس ہے دوسری طرف مسلمانوں کی حالت محض ایک غل غول کی سی تھی نہ کوئی انتظام، نہ کوئی ترتیب، نہ کوئی سر دھرا، نہ پریس نہ دولت، نہ علم، غرض ہر چیز میں ہم دوسروں سے کم، گورنمنٹ میں آواز کو بہت ضعف۔ اگر کوئی خدا کا بندہ دوسرے زبردست گروہ سے اپنا ہاتھ باہمی سمجھوتے کے لئے ہماری طرف بڑھاتا تھا تو ہماری طرف سے ایسا کوئی ہاتھ نہ تھا جو ہم سب کی طرف سے قایم مقام بن کر اُس سے مصافحہ کرتا ہو علیحدہ پلیٹ فارم ہی کے ذریعہ سے (جس کا نام آل انڈیا مسلم لیگ ہے اور دوسرے پراونشیل اور اضلاع کی لیگیں ہیں اور بعض اخبار بھی ہیں جو اپنے گروہ کے حقوق کی حفاظت کرتے ہیں) مسلمان آج اس قابل ہیں کہ بطور علیحدہ گروہ کے دیکھے جاتے ہیں اور جن کے وجود سے آج انکار کرنا ہر ایک کے امکان سے باہر ہو گیا ہے اگر ہم اپنا علیحدہ پلیٹ فارم ہاتھ سے کھو دیں اور اس خیال سے اپنے دل کو تسلی دے لیں کہ آیندہ ہم مشترکہ پلیٹ فارم پر آدھے کے ساجھی ہو جائیں گے تو اس سے زیادہ مہلک غلطی ہمارے لئے کوئی دوسری نہ ہوگی۔ اس وقت جو مسائل مسلم اور ہندو یونیورسٹیوں کی نسبت پیش آرہے ہیں اُن کے متعلق جو اتحاد دونوں قوموں میں ہے۔ خدا کرے وہ ہمیشہ قائم رہے اور ترقی کرتا رہے۔ لیکن ابھی بھولنا نہیں چاہئے کہ کچھ ایسے مسائل بھی ہیں جن میں معلوم نہیں کہ

ان دونوں گروہوں میں کہاں تک اتفاق رائے ممکن ہوگا اور کہاں تک نہ ہوگا۔ مثلاً آج کل بہت زور وشور سے سیلف گورنمنٹ کی خوابیں ملک میں دیکھی جارہی ہیں۔

اس مسئلہ کو مسلمانوں کے نقطۂ خیال سے اگر دیکھا جاتا ہے تو اس خواب کی تعبیر مسلمانوں کے حق میں بحالتِ موجودہ کچھ قابل اطمینان نظر نہیں آتی میں اخیر شخص ہونگا جو اپنے ملک کی اِس قسم کی ترقیات کی مخالفت کرونگا۔ لیکن میں ہی سب سے پہلا شخص ہونگا جو اس قسم کی ترقیات کے وقت اپنے سات کروڑ بھائیوں کے حقوق کی حفاظت کا خیال بھی پیش نظر رکھوں گا۔ اور اس قسم کی حفاظت اگر ہم کر سکتے ہیں تو اپنے علیحدہ پلیٹ فارم ہی کے ذریعہ سے کر سکتے ہیں۔ اور جہاں تک میں نے دیکھا ہے پھر مسلمانوں کے واسطے یہ مسئلہ کہ ہماری بقا وثبات ہندوستان میں برٹش حکومت کے بقا وثبات پر منحصر ہے۔ ایسا مسئلہ ہے جس کے لئے ہم کو ہر وقت اپنا علیحدہ ہی ایک پلیٹ فارم رکھنا نہایت ضروری ہے۔

"ولی فیہا مآرب اُخریٰ"

فونڈیشن کمیٹی کا اہم اجلاس

متحدہ پلیٹ فارم کی تجویز ناقابل عمل تھی اس لئے جداگانہ طور پر ہی حکومت کے اعلانات پر غور کرنے کے لئے فونڈیشن کمیٹی کا اجلاس لکھنؤ میں منعقد ہوا۔ نواب صاحب علالت اور امراض کے متواتر حملوں کے باوجود شریک ہوئے لیکن صورت حال یہ تھی کہ ایک مقتدر جماعت[1] کے خیالات واذہان اعلانات

---

[1] صاحب زادہ آفتاب احمد خاں (مرحوم) اور شیخ عبداللہ صاحب نے اُسی زمانہ میں اس مسئلہ پر پمفلٹ بھی شایع کئے تھے صاحب زادہ صاحب کی رائے تھی کہ:۔

تعلیمی پہلو کے لحاظ سے الحاقی یونیورسٹی مفید نہیں لیکن قومی پہلو کے لحاظ سے ہم اس کے لئے خواہش کرنے پر مجبور ہیں۔

حکومت کی معقولیت کی طرف منتقل ہو رہے تھے اور بعض ممتاز اصحاب اپنے شخصی اثر سے ان لوگوں کو بھی اپنا ہم نوا بنا رہے تھے جن پر قومی حقوق کی حفاظت و صیانت کا بھروسہ تھا۔

غرض ان حالات میں پہلا جلسہ ہز ہائینس نواب صاحب بہادر والی رامپور کی اور دوسرا آنریبل سر مہاراجہ محمود آباد کی صدارت میں منعقد ہوا علاوہ دیگر مسائل کے جو معرض بحث میں آسکے یہ امر بھی طے ہوا کہ ایک ڈیپوٹیشن حضور وائسرائے کے سامنے اپنے معروضات پیش کرنے کیلئے مرتب کیا جائے۔ لیکن سب سے بڑا اہم مسئلہ چانسلر کے غیر محدود اختیارات کا تھا جس کے خلاف میجر سید حسن بلگرامی نے بتائید نواب وقار الملک ایک رزولیوشن پیش کیا تھا جو ایسے اختیارات کے برخلاف تھا۔

اس رزولیوشن پر بڑی گرم بحث ہوئی اور تمام دن کے مباحثہ کے بعد آخر کار جلسہ بلا حصول نتیجہ ملتوی ہو گیا۔

۲۸ر کو کانفرنس کا اجلاس تھا اور ۲۹ر تاریخ جلسہ ملتویہ کے لئے مقرر ہوئی اس وقفہ میں نواب وقار الملک کو تمام صورت حال پر غور کا موقع مل گیا اور معاملات کو بہ اتفاق رائے طے ہونے کے خیال سے ایک خاص جلسہ میں جو بے ضابطہ طریقہ پر تھا یہ حل پیش کیا کہ کانسٹیٹیوشن کمیٹی کے گذشتہ جلسہ اگست کی تجویزوں اور میجر صاحب کے رزولیوشن سے اتفاق کر لیا جائے تاکہ اس تائید سے ڈیپوٹیشن کے ہاتھ قوی رہیں اور اس کو اختیار دیا جائے کہ بحث و تبادلہ خیالات کے بعد کوئی ترمیم جس میں قومی مقاصد کا تحفظ رہے قبول کرلے۔

اس حل سے سب نے اتفاق کیا اور ۱۱ بجے شب کو اردو انگریزی میں رزولیوشن کا مسودہ تیار ہو گیا لیکن اس کے الفاظ و مفہوم اور بعض مراتب سے نواب صاحب نے اختلاف کیا جس پہ طے ہوا کہ وہ خود مسودہ مرتب کریں۔ ڈیپوٹیشن کے ممبروں کی فہرست انگریزی میں تیار تھی مگر جب نواب صاحب نے اردو میں لکھی تو اس میں

اہم اور ضروری ناموں کی کمی پائی چنانچہ اسی وقت متعدد نام ان اصحاب کے جو کانسٹیٹیوشن کمیٹی کے ممبر بھی تھے اور پہلے بھی ممبر تعلیمات کے ساتھ مباحث میں شریک ہوکر کام کر چکے تھے جس قدر یاد آئے اضافہ کئے اور قرار پایا کہ صبح دفتر سے دیکھکر باقی نام درج کر دیئے جاویں یہ غیر مکمل فہرست مسٹر (مولانا) محمد علی نے ان سے لے لی۔ لیکن جس وقت یہ کارروائی ہو رہی تھی کسی صاحب نے کہا کہ:۔

> اس وقت صرف چند اشخاص جو یہ مشورہ کر رہے ہیں اس کی خبر بھی باہر لوگوں کو باہر پہنچے گی اور وہ اس بات سے ناخوش ہوں گے کہ پبلک سے مشورہ کے بغیر یہ لوگ کیوں بالا بالا اس قسم کی کارروائی کر رہے ہیں۔

نواب صاحب نے جواب دیا کہ:۔

> پبلک کچھ بھی بدگمان نہ ہوگی اگر ہم بلا کم و کاست اس وقت کی کل روئداد اُس کے سامنے بیان کر دیں۔

الغرض ڈیڑھ بجے شب کو یہ جلسۂ مشاورت ختم ہوا کچھ اصحاب بیٹھے رہے اور نواب صاحب چلے آئے۔ مگر تھوڑی دیر بھی نہ گذری تھی کہ بعض ان شرکائے جلسہ کو جو اپنی اپنی قیام گاہوں پر پہنچ کر استراحت کی تیاری کر رہے تھے طلب کیا گیا۔ جلسہ کی کارروائی جاری رہی ممبروں کی فہرست[1] بدل دی گئی رزولیوشن بھی وہی رکھا گیا جس پر نواب صاحب کو اعتراض تھا جلسہ کا وقت ساڑھے آٹھ بجے کی جگہ دس بجے کر دیا گیا۔

اِدھر نواب صاحب نے علی الصباح رزولیوشن کا مسودہ تیار کیا اور منتظر رہے کہ جلسہ سے قبل مشورت شبینہ کے اصحاب اس پر غور کریں گے لیکن کسی نے تکلیف

---

[1] اس فہرست میں (مسیح الملک) حکیم محمد اجمل خاں (مرحوم) اور ڈاکٹر ضیاء الدین احمد سکریٹری کانسٹیٹیوشن کمیٹی تک کا نام نہ تھا۔

اور پروانہ کی دس بجے جلسہ شروع ہوا اور وہی رزولیوشن پاس کیا گیا نواب صاحب نے جلسہ کو سکون کی حالت میں رکھنے اور اختلافات رفع کرنے کی ضرورت سے خیال کیا کہ پیش شدہ رزولیوشن میں جو باتیں رہ گئی ہیں ان کو جداگانہ رزولیوشن کی صورت میں وہ خود پیش کریں گے۔ مگر مولانا محمد علی نے فوراً ہی ڈپوٹیشن کے ممبروں کی فہرست پیش کردی جو فوراً ہی پاس ہوگئی اور صدر جلسہ نے بغیر اس بات پر غور کئے ہوئے کہ اور کیا کام باقی ہے جلسہ ختم کر دیا۔

یہ کارروائی اتنی قابل افسوس تھی کہ اس تحریک کی تاریخ میں اس سے زیادہ کوئی افسوس ناک کارروائی نہیں ہوئی۔ نواب صاحب فاؤنڈیشن کمیٹی کے سکریٹری کی حیثیت سے شریک تھے ان کی پیرانہ سالی اور صحت دونوں قابل لحاظ تھیں پھر اسی عرصہ میں چار مرتبہ طبیعت خراب ہوئی تھی اور اس تاریخ شب کے ڈیڑھ بجے تک مباحثات میں ان کی شرکت اور پھر علی الصباح دماغی کام میں مصروفیت، ان سب باتوں کو نظر انداز کر دیا گیا اور تبدیلی وقت سے بھی ان کو اطلاع نہیں دی گئی پھر جلسہ کو ختم کر کے چلے آنے کے بعد موٹر بھیج بھیج کر دوسرے ہم خیال اصحاب کو بلانا اور جو امور کہ سکریٹری کے سامنے قابل ترمیم سمجھ لئے گئے تھے اُن ہی کو قائم رکھنا ایک ایسی کارروائی تھی جو کسی صورت میں شرکائے جلسہ کے مرتبہ کے مناسب نہ تھی اور اس پر مستزاد یہ تھا کہ ڈپوٹیشن کے ممبروں کی فہرست سے وہ نام جو نواب صاحب نے سب کی منظوری لے کر اپنے قلم سے بڑھائے تھے خارج کر کے جدید فہرست پاس کرلی گئی۔

جس وقت نام سُنائے جارہے تھے نواب صاحب پیش کنندہ پر اعتماد کی وجہ اور رات کی تکلیف کے سبب سے خیال ہی نہ کرسکے کہ فہرست میں ترمیم کی گئی ہوگی لیکن جلسہ کے بعد ہی اس فہرست پر اعتراض شروع ہوئے اور نواب صاحب

کو بھی اصل حقیقت معلوم ہوگئی تو پھر شب کو ایک جلسہ طلب کیا گیا۔ انھوں نے ایسے بے اصول جلسہ میں شرکت سے انکار کردیا۔ اور نتیجہ یہ ہوا کہ اس آخری جلسہ میں صرف پنجاب کے بعض اصحاب کے نام بڑھا دیئے گئے اس کارروائی پر اخبارات میں ایک ہیجان برپا ہوگیا۔ ڈپوٹیشن کی ترتیب پر سخت سے سخت نکتہ چینیاں کی گئیں۔ نواب صاحب پر بھی اعتراض ہوئے، اب اس کے سوا کچھ چارہ نہ تھا کہ تمام واقعات کو بہ تفصیل شایع کردیا جائے چنانچہ انھوں نے ایک مفصل مضمون لکھا اور ۱۵ر فروری ۱۹۱۳ء کے علیگڈھ انسٹیٹیوٹ گزٹ میں شایع کردیا۔

جلسہ نیم شبی کے حالات پر پوری روشنی ڈالی ان اسباب اور ان معذوریوں کو بھی بیان کیا جس کی وجہ سے اجلاس میں انھوں نے سکوت اختیار کیا تھا اگرچہ یہ تاویل و عذر گناہ نہ تھا بلکہ حقیقی اسباب و عوارض تھے تاہم اس کو غلطی ہی قبول کرکے با ایں الفاظ قوم سے معذرت اور معافی کی درخواست کی کہ:۔

> با ایں ہمہ اگر قوم کے نزدیک میرے عذرات کافی نہیں تو اپنی خطا کا اقرار کرتا ہوں اور امید ہے کہ قوم میری اس معذرت کو مہربانی سے قبول کرکے مجھے معاف فرمائے گی خصوصاً ایسے وقت میں جب کہ اس قسم کی خطاؤں کے سرزد ہونے کا کوئی موقع میری طرف سے غالباً آیندہ پیش آنے والا نہیں۔
>
> آئندہ میں پبلک جلسوں یا اصلاح و مشورہ کی صحبتوں میں ہی شریک ہونے سے معذور نہ ہوں گا غالباً تحریر کے ذریعہ سے بھی مجھے اپنے خیالات ظاہر کرنے کا موقع نہ ملے گا اور اسلئے میری ذات پر قوم کو اگر کچھ تھوڑا بہت بھروسہ تھا تو اس سے بھی اب قطع نظر کرنی چاہیئے اور جو کچھ کرنا چاہیئے خود سوچ سمجھکر کرنا چاہیئے۔

آخر میں یہ مشورہ دیا کہ :۔

فہرست ڈپوٹیشن کے علاوہ باقی رزولیوشن جو ۲۹ ر دسمبر ۱۹۱۲ء کے جلسہ میں پاس ہوا اُس کو بدستور قائم رکھا جاوے نیز اس سے بھی چارہ نہیں ہے کہ ہم کو ایک بااختیار ڈپوٹیشن تجویز کرنا چاہیئے جو گورنمنٹ آف انڈیا میں ہمارے معروضات کو پیش کرے اور جہاں تک اس کے امکان میں ہو وہ اپنے آپ کو اس کا پابند رکھے کہ قوم کی خواہشات پر پورا زور دے۔ لیکن اس میں بھی شک نہیں ہے کہ ڈپوٹیشن کے اختیارات میں کوئی مناسب قید بھی ہونی چاہیئے، یا دوسرے لفظوں میں یہ کہ اگر ڈپوٹیشن کے ممبروں میں باہم اختلاف رائے ہو تو اس وقت ڈپوٹیشن کا طرز عمل کیا ہونا چاہیئے......

.....اور اسی کے ساتھ کوئی ایسا فقرہ بھی رزولیوشن میں ضرور درج ہونا چاہیئے کہ جب ڈپوٹیشن ضرورت سمجھے تو اپنی فہرست میں توسیع کر سکے

....

بعض اور ضروری رزولیوشن جو گذشتہ جلسہ میں وقت کی تنگی کی وجہ سے پیش نہ ہو سکے (مثلاً یہ کہ یونیورسٹی کے سرمایہ کا منافع ایم۔اے۔او کالج کی اس قسم کی ترقی میں صرف ہو سکے جو اس کو یونیورسٹی کے درجہ تک پہنچانے کیلئے ضروری ہو) ان کا پیش ہو کر فیصلہ ہو جانا چاہیئے۔ دویم یہ کہ پھر ایک تاریخ اور مقام مقرر کر کے فونڈیشن کمیٹی کو طلب کیا جائے اور ان معاملات کا فیصلہ کرایا جائے؛ اور اس کی نوبت آوے تو اسی جلسہ میں فونڈیشن کمیٹی کی ایک مینجنگ کمیٹی بھی مع اپنے اختیارات منتخب ہو جاوے نوٹس میں یہ بھی درج کیا جائے کہ جس قدر حضرات بھی شریک جلسہ ہو سکیں گے ان کا فیصلہ فونڈیشن کمیٹی کا فیصلہ سمجھا جاوے گا۔

میں خوب واقف ہوں کہ اس قدر جلد اور اس قدر دُور دُور کی حضرات کو

دوبارہ اس قسم کی زحمت دینا کس قدر مشکل اور کس قدر تکلیف دہ امر ہے نیز
یہ کہ اس دوسرے جلسہ کی کارروائی کی نسبت بھی شاید کسی قسم کا قانونی اعتراض
کسی صاحب کی طرف سے پیش ہوسکے لیکن اس کی ذمہ داری انھیں حضرات
پر ہوگی جو قومی معاملات کو قومی معاملات کی طرح اور ہر ایک امر کو پوری صفائی
اور وضاحت کے ساتھ طے کرنے کی بجائے ترکیب سے صرف اپنے
منشا کو پورا کرنے سے غرض رکھتے ہیں۔..........

اور اب اخیر میں یہ خاکسار اپنی ناتندرستی کی وجہ سے اور اپنے طبی
مشیروں کے مشورہ سے اس قسم کے جلسوں اور دماغی کاموں میں شریک
ہونے سے معافی چاہتا ہے اور پبلک سے اس التماس و دعا کے ساتھ
رخصت ہوتا ہے کہ خداوند تعالیٰ اپنے فضل و کرم سے اپنے اس عاصی گنہگار
کا خاتمہ بخیر کرے اور جو دن میری زندگی کے باقی ہوں ان میں اپنی قوم کی
کامیابیوں کی خوشی کی خبریں سنتا ہوں اور یہی خوشیاں انشاء اللہ
میرے لئے غذائے روح کا کام دیں گی۔

اس مضمون کے شایع ہونے کے بعد جابجا جلسے کئے گئے کہ ۲۹ دسمبر کی کارروائی
منسوخ کی جائے بعض ممبروں نے استعفے بھی پیش کر دئے اور ڈپوٹیشن کی ترکیب ہی بدل گئی۔
اِن واقعات مابعد نے اس جلسہ نیم شبی منعقد کرنے والی جماعت میں بے چینی
پیدا کر دی۔

سر راجہ محمود آباد نے ایک خط نواب صاحب کو لکھا اور ساتھ ہی پریس کو بھی بھیجدیا۔
اس خط میں ان ہیجان انگیز مضامین کا حوالہ دے کر جو نواب صاحب کے مضمون شایع
ہونے کے بعد دیکھے گئے بہت سے واقعات کو اُن کے سہو اور غلطی حافظہ پر مبنی کیا۔
اور خواہش کی کہ ۲۲ مارچ کو لکھنؤ تشریف لاکر یونیورسٹی کمیٹی کے جلسہ میں شریک ہوں۔

تاکہ وہ لوگ جن پر آں جناب نے سخت ترین الزامات لگائے ہیں نہ صرف
آں جناب کے سامنے اپنی صفائی پیش کریں بلکہ اُن غلط فہمیوں کو بھی
دور کر دیں جو آں جناب کے ذہن عالی میں اور آں جناب کے ذہن سے
دوسروں کے ذہن میں منتقل ہو رہی ہیں اور جن کی وجہ سے مبادا یونیورسٹی
کو سخت صدمہ پہنچے .... میں
اُن حضرات کو اس کام کی غرض سے لکھنؤ مدعو کر چکا ہوں جو ہماری گفتگوؤں
کے وقت شریک صحبت تھے۔ یا جنھیں واقعات کے متعلق
واقفیت ہے۔

اس تحریر کو میں نے مسٹر محمد علی کو بھی دکھایا ہے اور انھیں بھی
اس سے کامل اتفاق ہے ایک کاپی پریس کو بھی بھیج رہا ہوں تاکہ آئندہ
فتنہ نہ بڑھے۔

لیکن یہ خط نواب صاحب کو عین تاریخ جلسہ کے دن ملا اور ظاہر ہے کہ وہ اس حالت نادرستی صحت
میں فوراً سفر کے قابل نہ تھے۔ انھوں نے تار کے ذریعہ معذرت کی اور جواب دیا کہ :-

اب سب سے آسان طریقہ یہی ہے کہ جناب ممدوح کے نزدیک مجھ سے
میرے مضمون مندرجہ علی گڑھ انسٹیٹیوٹ گزٹ مطبوعہ ۵ر فروری میں
جو جو سہو یا خطا ہوئی ہو اس کی ایک یادداشت قلم بند فرمائی جائے جس کے
دیکھنے کے بعد اگر مجھ کو اطمینان ہو گیا کہ مجھ سے کچھ غلطیاں ہوئی ہیں تو میں
بلا تامل اپنی غلطیوں کا اعتراف کروں گا ورنہ جو کچھ حقیقت ہوگی وہ عرض
کر دوں گا اور کارروائی کے اس طریقے سے میرے دماغ پر بھی
زیادہ زور نہ پڑے گا اور معاملہ بھی صاف رہے گا اور پبلک کے اطمینان
کے لئے بھی غالباً یہی طریقہ زیادہ مفید ہوگا۔ جناب ممدوح کا والا نامہ

کمال سکون طبیعت اور متانت سے لکھا گیا ہے جس کا نہایت درجہ ممنون ہوں اور یہ کہ بلا شک اس کو بہ نظر اہمیت معاملہ اب سے بہت عرصہ پیشتر معرض تحریر میں آنا چاہیئے تھا۔ تاکہ اس قسم کی خط و کتابت کے ذریعے سے جس قدر صفائی حاصل ہو سکتی ممکن تھی وہ ۲۲ مارچ کے جلسہ لکھنؤ سے قبل ہی حاصل ہو جاتی۔ اور یہ تو سب کو معلوم تھا۔ اور میں اپنے ۵ فروری کے مضمون میں صاف صاف عرض بھی کر چکا تھا کہ میری علالت اور میرا ضعف اور میرے طبّی مشیروں کا مشورہ مجھ کو اب کسی ایسے سفر یا جلسہ میں شریک ہونے کی اجازت نہ دیگا جس کی مجھ کو عین دن کے دن مہربانی سے دعوت دی گئی؛ نیز میں آپ کو اور آپ کے ذریعے سے پبلک کو اس یقین دلانے کی ضرورت نہیں سمجھتا کہ کسی ایک متنفس کا دل دکھانا بھی میں کبھی گوارا نہیں کرتا جس کی طرف جناب راجہ صاحب بالقابہ کے والا نامہ میں اشارا کیا گیا ہے نہ کہ چند بزرگان قوم کا۔ لیکن جب دوسری طرف میرے نزدیک تمام قوم کے اہم ترین مقاصد خطرہ کی حالت میں تھے تو میں نہ صرف قوم کا بدخواہ بلکہ خدا کا بھی گنہگار ہوتا اگر واقعات کو پردۂ اخفا میں رکھتا۔ اور اب جب کہ یہ معاملات پبلک کے سامنے آ گئے ہیں تو انشاء اللہ کچھ زیادہ وقت نہ گزرے گا جو ہر ایک منصف شخص پوری طرح مطمئن ہو جائے گا کہ واقعات کی حقیقت[1] کیا تھی۔ .... آج زمانہ اس قسم کی کارروائیوں کا نہیں رہا ہے ؎

در ظلمت شب ہر آنچہ کردی کردی — در روشنی روز ہماں نتواں کرد

---

[1] یہ ایک ایسی حقیقت تھی کہ سیرت محمد علی کے قابل مؤلف کو بھی ایک زبردست اور فاضلانہ تاویل کے پردہ میں اسکو قبول کرنا ناگزیر ہو گیا۔ ملاحظہ ہوں صفحات ۲۱۴ و ۲۱۵ سیرت محمد علی۔

نتیجہ ۲۲ر مارچ کو پھر مسلم یونیورسٹی کمیٹی کا اجلاس لکھنؤ میں منعقد ہوا جو ۲۹ر دسمبر کے رزولیوشن کے ذریعہ سے قائم ہوئی تھی اُس نے نواب صاحب کے مضمون پر یہ رائے ظاہر کی کہ اس کے اندر بہت سے بے بُنیاد اور غلط فہمی پیدا کرنے والے بیانات شامل ہیں اور سخت قسم کے الزامات قائم کیے گئے ہیں یہ بھی طے ہوا کہ ایک مضمون کئی ایسے سربرآوردہ اشخاص کے دستخطوں سے جنھوں نے مذکورہ بالا مباحث میں حصہ لیا تھا۔ عنقریب شایع ہوگا جس میں مذکورہ بالا بیانات اور الزامات کا جواب دیا جائے گا۔ اور مذکورہ بالا واقعات کی وجہ سے کوئی مزید کارروائی غیر مناسب ہے مگر جن سربرآوردہ اصحاب کے سُپرد تردیدی بیان مرتب کرنے کی خدمت سپرد کی گئی تھی وہ اس خدمت کو انجام دینے سے قاصر رہے۔ اور کوئی بیان شایع نہ ہوسکا اور آخرکار تمام کارروائی کالعدم ہوگئی ۲۶ و ۲۷ر جولائی کو پھر فونڈیشن کمیٹی کا جلسہ علی گڈھ میں طلب کیا گیا اس وقت نواب صاحب شرکت سے قطعی معذور تھے لیکن اُنھوں نے ایک پیغام کے ذریعہ سے کمیٹی کو حسب ذیل ضروری امور پر توجہ دلائی کہ:۔

> آئندہ مشکلات سے محفوظ رہنے کے لئے کانسٹیٹیوشن کے تمام اجزا کا ایک ساتھ مکمل کر لینا ضروری ہے تنگی وقت کے لحاظ سے غیر مکمل کانسٹیٹیوشن پیش کرنا مناسب نہیں۔

اس سلسلہ میں اُنھوں نے یہ تنبیہہ بھی کی کہ:۔

> سال دو سال بھی اگر کام کے لئے درکار ہیں تو ہم اُن کو کام میں لا سکتے ہیں یونیورسٹی کا کام ہے جس کا اثر عمروں اور نسلوں تک پہنچنے والا ہے۔ یہ وقت عجلت کا ہرگز نہیں ہے۔

> روپیہ ہمارے ہاتھ میں موجود ہے کالج جو انشاء اللہ تعالیٰ یونیورسٹی بننے والا ہے وہ قائم ہے اور کام کر رہا ہے۔ لہذا گورنمنٹ کے ساتھ معاملت کرنے میں اگر

ضرورتاً کچھ دیر ہو جائے تو اس سے قوم کا کوئی ہرج نہیں ہے کالج کو جس طرح یونیورسٹی بن جانے کے بعد ہم ترقی دینے کا خیال رکھتے ہیں اس میں کافی حد تک ہم بغیر یونیورسٹی کے بھی کالج میں مفید اضافے کر سکتے ہیں۔

اس کے بعد انھوں نے یونیورسٹی فنڈ کے منافع سے قوم کے نوجوانوں کو اعلیٰ تعلیم کی غرض سے یورپ بھیجنے، کالج کو ترقی دینے اور بجٹ کے خسارہ کو پورا کرنے اور عمارتوں کی تکمیل کیلئے فونڈیشن کمیٹی سے منظوری کی ضرورت اور اس کمیٹی سے ایک مینجنگ کمیٹی کے انتخاب اور اس کے اختیارات کے متعلق ضروری قواعد کی ترتیب اور نام کی اہمیت پر زور دیا اور الحاق پر بھی اظہار رائے کیا اور اس میں اتنی ترمیم کی کہ بالفعل اسکولوں کے الحاق پر اکتفا کیا جائے اور کالج کے الحاق کا وعدہ لے لیا جائے گورنمنٹ کو اندرونی انتظام میں بہت زیادہ اختیارات دیئے جانے کی قطعی مخالفت کی۔ اور آخر میں لکھا کہ :۔

مضر یونیورسٹی کو آج حاصل کرنا اپنے پاؤں پر کلہاڑی مارنا ہے اور یاد رکھو کہ گورنمنٹ مُراد ہے اس کے حکام سے اور حکام ادلتے بدلتے رہتے ہیں کسی کی رائے کچھ ہوتی ہے اور کسی کی کچھ۔ اور بعض اوقات منصف حکام مزید غور کے بعد اپنی رائے خود بدل دیتے ہیں لہٰذا ہمارے حکام اگر آج ایک بات کو منظور نہیں کرتے تو ممکن ہے کہ آیندہ کسی وقت وہی بات منظور ہو جائے لیکن آج ہم نے کسی ایسے امر کو منظور کر لیا جو ہمارے حق میں مفید نہیں تو گویا اپنے ہاتھ ہم نے خود کاٹ دیئے اور آیندہ اس کے خلاف ہم کو ملنے کا کوئی حق نہ رہے گا۔ اور بالفرض اس وقت اگر گورنمنٹ نے ہماری گذارشات کو منظور نہ کیا اور ایک موزوں و مناسب یونیورسٹی ہم کو نہ ملی تو بھی ہمارا کچھ نقصان نہیں ہے۔ ہم اپنے کالج کو اُس حد تک برابر ترقی دیتے رہیں گے جس حد تک وہ ترقی کر سکتا ہے، اور اپنی عام تعلیم کا انتظام ہم گورنمنٹ

سے آزادرہ کرایسی خوبی اورخوش اسلوبی کے ساتھ کرسکیں گے۔ جوگورنمنٹ
کی بخشی ہوئی یونیورسٹی کی حالت میں ہم ہرگز نہیں کرسکتے۔

درد کا حد سے گذرنا ہے دوا ہوجانا

جلسہ میں یہ پیغام سنایا گیا اور پہلے جلسہ میں جن باتوں کو نظر انداز کردیا گیا تھا اُن سب کو پیش کیا گیا یونیورسٹی کے نام اور اختیارات کے مسئلہ پر کافی غور ہوا۔ ڈپوٹیشن کی تجدید اختیارات کی گئی اور تمام صوبجاتِ ہند کے مسلمانوں کی مؤثر قائم مقامی رکھی گئی۔ ممبران کے انتخاب کا حق پراونشیل کمیٹیوں کو دیا گیا۔ منافع کا صرف منظور کیا گیا تکمیل مسلم یونیورسٹی کا عملی کام شروع کرنے کیلئے مسلم یونیورسٹی ایسوسی ایشن قائم ہوگئی اور مسلمانوں کی تمام جماعتوں کو انتخاب اور ان کے نمایندوں کو شرکت کا قانونی حق دیا گیا۔

اس نوبت پر مسلم یونیورسٹی کے متعلق نواب وقار الملک کی خدمات ختم ہوگئیں اور پھر اس انجام کے پذیر ہونے تک جو واقعات پیش آئے۔ وہ مسلم یونیورسٹی کی تاریخ کے اجزا ہیں لیکن افسوس ہے کہ ۱۹۲۰ء میں جب یونیورسٹی ایکٹ پاس ہوا تو اس کے قانون اساسی کے اجزا مکمل نہ تھے اور وہ اختلاف و واقعات جو ۱۹۲۸ و ۲۹ء میں پیش آئے جنھوں نے نہ صرف قوم میں ہیجان برپا کردیا بلکہ یونیورسٹی کی بنیاد متزلزل کردی اور اس وقت یعنی ۱۹۳۶ء تک جو حالت اور بے بسی ہے ان سب امور کی علت غائی وہی ہے جس کے متعلق نواب صاحب نے اپنا تردد ظاہر کیا تھا۔



باب پانزدہم

بعض اہم معاملات تعلیمی وسیاسی میں رہنمائی

نواب وقارالملک نے ایم۔ اے۔ او کالج کے اُن فرائض کے علاوہ جن کا تعلق آنریری سکریٹری کے عُہدہ سے تھا ایک مسلمہ قومی لیڈر اور کانفرنس کے سکریٹری ہونے کے لحاظ سے قوم کے عام تعلیمی مسائل میں بھی زبردست حصہ لیا اور علی گڈھ انسٹیٹیوٹ گزٹ کے صفحات پر آزادی سے اور علی گڈھ کے قدیم مسلک سے متجاوز ہوکر اپنے اظہار خیالات سے قوم کی رہنمائی کا حق ادا کیا۔

حکومت کی پالیسی

سنہ ۱۹۰۹ء میں گورنمنٹ کی تعلیمی پالیسی پر بہت زیادہ شک وشبہ کی نظریں پڑ رہی تھیں اور یہ خیال جڑ پکڑتا جارہا تھا کہ حکومت اعلیٰ تعلیم کو روکنے کی طرف مائل ہے اور خاص کر مسلمانوں کی تعلیمی ترقی سے اس کو تردد ہے اس بنا پر انھوں نے ایک نہایت بسیط مضمون شایع کیا جس کا عنوان "گورنمنٹ کی تعلیمی پالیسی پر بدگمانی" تھا۔ اُنھوں نے اس بدگمانی پیدا ہونے کے دو سبب قرار دیئے :۔

(۱) یہ کہ ہندوستانی ملک کے انتظام میں بہت کم شریک ہیں اس لئے وہ گورنمنٹ کی ذمہ داریوں اور مشکلات سے کافی طور پر واقف نہیں ہوتے۔

(۲) بعض اوقات گورنمنٹ کی پالیسیوں میں بھی کچھ ایسی غلطیاں ہو جاتی ہیں کہ اُن سے رعایا گورنمنٹ کی نیت پر بجا طور پر شبہ کرنے لگتی ہے۔

اُس کے بعد انھوں نے ان مشکلات کو حل کرنے کا بار جو اس بدگمانی سے پیدا ہوتی ہیں نیشنل کانگریس اور مسلم لیگ پر عائد کرکے اس تعلیمی پالیسی کے متعلق لکھا کہ :۔

ہر ایک پالیسی اُسی وقت تک ایک عمدہ پالیسی ہے کہ وہ گروہ جس کے ساتھ اُس پالیسی کا برتاؤ کیا جائے، اس کو اپنے حق میں غیر مفید نہ سمجھتا ہو لیکن وہ دن اب بہت دُور جا چکے ہیں جب کہ رعایا اپنے نیک و بد میں تمیز نہیں کرتی تھی، کانگریس کے قائم ہو جانے کے بعد سے جب کہ جدید تعلیم یافتوں کا ایک کثیر گروہ ملک میں موجود ہو گیا ہے، گورنمنٹ کی کارروائیوں پر زیادہ عمیق نگاہیں پڑنی شروع ہو گئی ہیں۔ ایسے وقت میں گورنمنٹ سے ذرا سی غلطی کا سرزد ہونا بدگمانی اور ناراضامندی کی آگ مشتعل کر دینے کے لئے کافی ہے۔

یہ ایک ایسی پالیسی تھی، جس سے ہندوستانیوں کی بدگمانیوں کا بھڑک اٹھنا بالکل واجبی تھا، ہمارا ہی ملک ہماری ہی تعلیم، ہمارا ہی آئندہ کا نفع اور نقصان اور پھر ہمیں سے چُھپا چُھپا کر کارروائیاں کرنا اور پھر اس بات کی بھی توقع رکھنا کہ ملک میں اُس کی وجہ سے بدگمانی پیدا نہ ہوگی" جو کاشتن و چشم گندم داشتن" کے سوا اور کچھ معنی نہیں رکھتا۔ بلاشبہ اس مجلس شوریٰ کے متعلق بعض بڑی اسپیچیں شائع ہوئیں، لیکن ہم کو کیا معلوم کہ ان اسپیچوں میں اصلی کارروائیوں اور پالیسیوں کا کس قدر حصہ ظاہر کیا گیا اور کس قدر ہم سے مخفی رکھا گیا ہے جس طرح ہمیشہ ہوتا رہا ہے کہ اوّل ایک پالیسی قرار دے لی جاتی ہے اس کے بعد ایک کمیشن قائم ہوتی، پھر قانون نافذ ہوتا ہے اور قریب قریب اسی پالیسی پر مبنی ہوتا ہے جو کمیشن کی کارروائی سے پہلے طے ہو جاتی ہے، وہی طریقہ بالکل اس موقع پر بھی برتا گیا اور رعایا کی بدگمانی بڑھتے بڑھتے ناراضامندی کی حد تک ترقی کر گئی۔ یونیورسٹی کے قانون کے مسودہ کا مشتہر ہونا اور پھر اُس کا پاس ہونا تھا (جس کے ذریعہ سے بہت سی جدید مشکلات مُلک پر عائد ہوتی تھیں) کہ اُس ناراضامندی پر ہمیشگی کی مُہر ثبت ہو گئی۔ اب اس بات کو

چھپانا مناسب نہیں ہے کہ ملک میں یہ عام خیال پیدا ہوتا جاتا ہی کہ بنگالیوں اور مرہٹوں کی تعلیمی ترقی کے نتائج کو دیکھ کر گورنمنٹ اس فکر میں پڑ گئی ہے کہ کہیں مسلمان بھی تعلیم میں ترقی کر کے آیندہ گورنمنٹ کے لئے ویسے ہی تکلیف دہ نہ ہوں؛ اس لئے وہ مسلمانوں کی تعلیم کو بھی روکتی ہے، حالاں کہ ہندوستان میں مسلمانوں کی قلت تعداد اُن کو دُور از کار خیالات میں مبتلا ہونے سے ہمیشہ روکے گی۔ اور کبھی اُن کو پریشان خواب نہ دیکھنے دیگی؛ کیونکہ مسلمانوں کا بقاو فنا اس ملک میں انگلش حکومت کے بقاو فنا کے ساتھ وابستہ ہے۔

لارڈ کرزن بالقابہ کو اہلِ ملک کی ناراضی کی کوئی پروا نہیں تھی، انکی پالسی، جیسا کہ لارڈ مارلے نے بہت صحیح طور پر فرمایا، یہ تھی کہ ملک کا انتظام نہایت مستحکم اور مضبوط کر دیا جائے جس کو دوسرے لفظوں میں ہم صاف صاف یوں کہہ سکتے ہیں کہ جو کچھ اپنے نزدیک مناسب ہو، وہ کرو اور اپنی سنگینوں کو تیز اور بارود کو خشک رکھو اور ملک کی ناراضمندی کو نظرِ حقارت سے دیکھو؛ مگر ایسے وسیع ملک میں جہاں تعلیم ترقی کر رہی ہے اور محکوموں اور حاکموں کی تعداد میں کوئی مناسبت نہیں ہے اور ایک بڑا حصہ جنگی فوج کا خود رعایا کے گروہ میں سے ہے اور پولیس کی کل جمعیت تقریباً اُسی ملک کے لوگوں سے مرکب ہے اور ناراضی کرنے والے باشندگان ملک میں تعلیم یافتہ اشخاص کا بہت اہم جُز بھی شامل ہے، نیز دریدہ دہن اخبارات اُن کی مدد پر تلے ہوئے بیٹھے ہیں، رعایا کی نفرت اور ناراضامندی کو نظرِ حقارت سے دیکھنے کی پالسی زیادہ عرصہ تک قائم نہیں رہ سکتی تھی چنانچہ بہت جلد گورنمنٹ کو اپنی غلطی محسوس ہوئی اور لارڈ مارلے کو سرِ دربار یہ کہنا پڑا کہ انتظام مضبوط رکھنے کے ساتھ رعایا کو کچھ دینا بھی چاہیئے۔

لارڈ مارلے نے جو کچھ اس موقع پہ ماقل و دل ارشاد فرمایا ہی وہ بلاشبہ واقعات پہ

مبنی ہے اور وہ ایک دن ضرور ہو کر رہے گا، زمانے کی ترقی رفتار کو روکنا گورنمنٹ کے قابو سے باہر ہے۔ گورنمنٹ ہی کو زمانے کا ساتھ دینا ہوگا کنسرو ٹو خیالات اب رخصت ہو رہے ہے اور آئندہ ہندوستان کی آب و ہوا کنسرویٹو پودوں کے نشو و نما کے لئے موافق آب و ہوا ثابت نہ ہوگی۔

مجھ کو اپنے مضمون کے موضوع سے اب زیادہ دُور نہ جانا چاہیئے۔ خلاصہ کلام یہ ہے کہ لارڈ کرزن بالقابہ کی کارروائیوں نے گورنمنٹ کی تعلیمی پالسی کی نسبت ملک میں ایک عام بدگمانی پیدا کردی ہے اور جیسا کہ ایسی حالت میں ہمیشہ ہوا کرتا ہے، گورنمنٹ کے وہ کام بھی بدگمانی کی عینک سے دیکھے جارہے ہیں جو کامل غور و خوض کے بعد ملک کے حقوق میں کچھ مضر نہیں بلکہ سرتاسر مفید معلوم ہوتے ہیں۔ اس کا تدارک اگر کچھ ہو سکتا ہے' تو وہ یہی ہے کہ اب گورنمنٹ اس میدان میں پھونک پھونک کر قدم رکھے ....

آخر میں مجھے پھر ایک بار یہ کہنا ہے کہ اگر گورنمنٹ اُن اہم ملکی مسائل طے کرنے کے وقت، جن کا تعلق اہل ملک سے ہو لائق اور تعلیم یافتہ ہندوستانیوں کو شریک مشورہ کرتی رہے اور ملک کے روشن خیال تعلیم یافتہ باشندے اُن اہم مسائل پر کافی غور کرکے اپنی رائے قائم کیا کریں اور گورنمنٹ کو اپنی رائے سے مؤدبانہ طور پر آگاہ کیا کریں اور عوام الناس کو ہمیشہ صحیح رستے پر چلنے کی ہدایت کرتے رہیں اور غلط فہمیوں کو دُور کرنے میں کوشش اور سرگرمی سے کام لیتے رہیں تو حاکم اور محکوم کے درمیان عمدہ تعلقات قائم رہ سکتے ہیں اور طرفین میں جو بدگمانیاں پیدا ہوتی رہتی ہیں اُن کا دفعیہ ہو سکتا ہے۔

مختلف صوبوں میں اسلامی کالجوں کے قیام کی تائید

بدقسمتی سے علی گڑھ میں ایک ایسی جماعت پیدا ہوگئی تھی جو دوسرے صوبوں میں مسلمانوں کی تعلیمی کوششوں کو رقیبانہ نظروں سے

دیکھتی تھی اور اُسی کا خیال قایم ہو گیا تھا کہ اس طرح کالج کی ترقی میں رکاوٹ پیدا ہو گی اور اس کی مرکزی حیثیت قایم نہ رہ سکے گی اس خیال کا بہت زیادہ اظہار اُس وقت ہوا جب کہ امپیریل گورنمنٹ اور صوبوں کی گورنمنٹوں سے کالج کی امداد کا سوال پیش آیا۔ اُسی زمانہ میں ہز آنر سر جان ہیوٹ نے اپنی تقریر میں یہ مشورہ دیا تھا کہ

> علی گڑھ کو پوسٹ گریجویٹ کی تعلیم کا مرکز بنایا جائے اور دوسری اسلامی تعلیم گاہیں کھولی جائیں جو علی گڑھ کے پوسٹ گریجویٹ کے حصول کی معاون ہوں اور یہ کہ آپ کا کام اب یہ ہونا چاہئیے کہ جہاں جہاں ایسی قابل تعریف کوششیں شروع ہوتی ہیں وہاں کے لوگوں کی آپ ہمت افزائی کریں۔

مگر اس مشورہ اور پالیسی کو کالج کے حق میں نہایت مضر قرار دیا گیا اور اخبارات میں مضامین شائع کئے گئے۔

نواب صاحب قوم میں تعلیم کو وسیع طور پر پھیلنے کے متمنی تھے اور ہر صوبہ میں ایک ایک کالج کی ضرورت پیش نہاد خاطر تھی۔ وہ صرف علی گڑھ کو تمام ہندوستان کے لئے کافی نہیں سمجھتے تھے جیسا کہ اُنہوں نے احمد آباد کے کانفرنس کے خطبہ صدارت میں صاف طور پر کہہ دیا تھا کہ "علی گڑھ کالج تمام ہندوستان کی ضروریات کو پُورا نہیں کرسکتا" اُنہوں نے اس غلط فہمی اور مُضر خیال کو دور کرنے کے لئے متعدد مضامین شائع کئے۔ ایک مضمون میں جو اخبار البشیر اٹاوہ کے جواب میں شائع کیا تھا اُنہوں نے لکھا کہ:۔

> اس کے متعلق جو امر بہت زیادہ قابل غور ہے وہ یہ ہے کہ علی گڑھ میں کھانوں کی جو میز چنی گئی ہے۔ اُس کی ضرورت سے دوسرے صوبوں کے گرسنہ لوگوں کو گرسنہ رکھنا کہاں تک جائز سمجھا جائے گا۔ ہمارا کام یہ ہونا چاہئیے کہ ان کی قوتِ لایموت کا بھی خیال رکھیں۔

پھر اُنھوں نے مدراس اور کراچی میں کانفرنس کی اُن کوششوں کو یاد دلایا جو وہاں کے تعلیمی فنڈ کو تقویت دینے کے لئے کی گئی تھیں اور باوجود مقامی ضروریات کے بھی مختلف موقعوں پر دولت منداور فیاض اصحاب نے علی گڑھ کو مدد دی اور اُن فوائد کو ظاہر کیا جو ایسے کالجوں کے قایم ہونے سے قومی تعلیم کو پہنچیں گے۔ اسی سلسلہ میں اُنھوں نے لکھا کہ

> اُن کالجوں کے قائم ہونے کے بعد اُن سے بہت سے نوجوان گریجویٹ بن کر نکلیں گے جو دوسری صورت میں نہ علی گڑھ آسکتے ہیں نہ یونیورسٹی سے ڈگری لے سکتے ہیں حالاں کہ آج کل اس بات کی ضرورت ہے کہ جس تدبیر سے بھی ممکن ہو ہر ایک صوبے میں غول کے غول مسلمان گریجوٹیوں کے پیدا کئے جائیں اور اس میں دیر لگانے کا وقت نہیں ہے

آخر میں اُنھوں نے سرسید کے ایک مضمون مورخہ ۱۴ ارمئی ۱۸۹۵ء سے حسب ذیل فقرہ کا حوالہ دیا

> کہ جب تک مسلمانوں میں کافی سے بھی اعلیٰ درجہ کی انگریزی تعلیم رائج نہ ہوگی اُس وقت تک کوئی معتدبہ فائدہ دنیاوی اور بعض حالتوں میں دینی بھی حاصل نہ ہوگا۔ مسلمانوں میں ڈگری پائے ہوؤں کی تعداد اس قدر کثرت سے ہونی چاہیے کہ اگر کوئی شخص زمین پر سے ڈھیلا اُٹھائے تو وہ بھی گریجویٹ ہو۔

ڈھاکہ یونیورسٹی کی تائید

اسی طرح جب ۱۹۱۱ء میں تنسیخ تقسیم بنگال کے بعد ڈھاکہ یونیورسٹی کے قیام کا مسئلہ پیش آیا تو اُسی جماعت اور اُس کے ہم خیالوں نے اس یونیورسٹی کو بھی مشتبہ اور مشکوک نگاہوں سے دیکھا اور مسلم یونیورسٹی کی جو تحریک ہو رہی تھی اُس کے لئے مُضر سمجھا مگر نواب صاحب نے ایسے خیالات کو صرف ایک وہم سے تعبیر کیا اور ۴ ارفروری ۱۹۱۲ء کے اخبار میں ایک مضمون ڈھاکہ

یونیورسٹی اور مسلمان" کے عنوان سے شائع کر کے اُن خیالات کی تردید کی اور اس امر پر توجہ دلائی کہ

قدرتی طور پر اُس سے مسلمانوں کو زیادہ فائدہ پہنچے گا اور اگر بہار میں بھی کوئی جداگانہ یونیورسٹی قایم ہو تو مسلمان خدا کی رحمت سمجھیں گے اور ہم کو یہاں تک کہنے میں بھی تامل نہیں ہے کہ اگر ہر ایک صوبہ میں ایک ایک یونیورسٹی کی جگہ چند چند یونیورسٹیاں گورنمنٹ کی فیاضی اور مہربانی سے قایم ہو جاویں تو چشم ما روشن دل ما شاد۔ اور وہ دن ہندوستان کے لئے بہت خوش قسمتی کا دن ہوگا اور اس کے بعد مسلمانوں کا کام اُن وسائل کا بہم پہنچانا ہوگا جن سے اُن یونیورسٹیوں کے فوائد سے مسلمان بھی کماحقہ مستفیض ہو سکیں۔

ڈھاکہ یونیورسٹی تو گورنمنٹ کی یونیورسٹی ہوگی (جس کے اخراجات خود گورنمنٹ عنایت فرما دے گی) اگر کوئی اور مسلم یونیورسٹی بھی کسی حصۂ ملک میں اس طرح قائم ہو کہ اُس کے مصارف میں نہ علی گڑھ کو کوئی حصہ لینا پڑے نہ اُن مداخل میں کچھ ہرج واقع ہو جو مجوزہ مسلم یونیورسٹی کے لئے درکار ہیں تو علی گڑھ ہر ایک ایسی مسلم یونیورسٹی کے خیر مقدم کے لئے بھی تیار ہوگا اور اُس کو مسلمانوں کے حق میں یقیناً آبِ حیات تعبیر کرے گا۔

جس تحریک کو علی گڑھ کی تحریک کہا جاتا ہے اُس سے یہ مراد نہیں ہے جو کچھ بھی ہو علی گڑھ کی زمین اور علی گڑھ ہی کی اینٹ پتھر اور چونہ کی بنی ہوئی عمارتوں کے اندر اور علی گڑھ کی آب و ہوا میں ہو۔ بلکہ علی گڑھ کی تحریک میں ہر ایک وہ کام شامل ہے جو حقیقی کامل و اکمل طور پر مسلمانوں کے حق میں مفید ہو۔ خواہ کسی صوبہ کے مسلمانوں کو اُس سے فائدہ پہونچتا ہو متاع نیک ہر دوکاں کہ باشد

ایک علی گڑھ کالج یا علی گڑھ مسلم یونیورسٹی تمام ہندوستان کے مسلمانوں کے
درد کی دوا نہیں ہو سکتی۔ لہٰذا تعلیمی ذرائع جس قدر زیادہ ملک میں وسعت
کریں اور مسلمان ان سے متمتع ہونے کے اسباب مہیا کریں اُسی قدر مسلمانوں
کے حق میں مفید ہے البتہ ایک بات جو علی گڑھ نے ہمیشہ کہی ہے وہ اب بھی
کہی جاوے گی اور وہ ایسی بات ہے جس سے اختلاف کرنے کی بہت کم گنجائش
ہے یعنی یہ کہ جس قدر زیادہ درسگاہیں بھی ملک میں قایم ہوں وہ نامکمل اور
ناقص حالت میں نہ ہوں ورنہ اُن سے بجائے فائدہ کے نقصان پہونچے گا
اور قوم کی مجموعی کوشش منتشر ہو جاوے گی اور ایک کام بھی پورا نہ ہو سکے گا
لیکن ڈھاکہ یونیورسٹی یا دوسری کوئی یونیورسٹی (جو گورنمنٹ کی طرف سے قائم
ہو) وہ اس خطرہ سے محفوظ ہوگی اور اس سے مسلمان بھی یقیناً بہت کچھ فائدہ
حاصل کر سکیں گے۔

اس یونیورسٹی کی تجویز سامنے آتے ہی بنگال میں ہندوؤں نے اس کے خلاف ایک نیا ایجی ٹیشن
برپا کر دیا اور ویسرائے کے حضور میں ایک وفد پیش کیا نواب صاحب نے اس مضمون میں اُس
کی طرف بھی توجہ دلائی اور پھر دوسری اشاعت میں اُنھوں نے مسلمانوں کے نقطہ خیال سے
اس کی ضرورت و افادیت اور بنگالیوں کی ناپسندیدگی پر مفصل بحث کرتے ہوئے لکھا کہ

> بنگالی ڈپوٹیشن نے جو وجوہ اپنے نارضامندی کی ڈھاکہ یونیورسٹی کی نسبت حضور
> ویسرائے کے سامنے پیش کیں اور حضور ممدوح نے اُن کا نہایت صاف صاف
> جواب دیا وہ اب پبلک کی نگاہ کے سامنے ہیں لیکن جو کچھ اس وقت تک بنگالی
> حضرات کی طرف سے معرض بیان میں آیا ہے اُس کے علاوہ اور کچھ وجوہ بھی ہونی
> چاہئیں جنھوں نے بنگالیوں کی مخالفت کو ڈھاکہ یونیورسٹی کی نسبت برانگیختہ کیا
> ہے کیونکہ جو وجوہ بیان کی گئی ہیں وہ اس قدر کمزور ہیں کہ اُن نہایت لایق اور

قابل مدبروں کی شان کے بالکل خلاف معلوم ہوتی ہیں جن کی زبان سے وہ ادا ہوئیں۔ مثلاً ان کا یہ فرمانا کہ اس سے اندرونی تقسیم بنگال کی پھر لازم آتی ہے یا ڈھاکہ میں یونیورسٹی قایم ہونے سے مسلمانوں اور ہندوؤں میں اختلاف و عناد پیدا ہوگا یہ اس قسم کے امور ہیں جن کو کوئی منصف شخص ایک لمحہ کے لئے بھی قبول نہیں کرسکتا بہت ہی بہتر ہوتا اگر یہ صدائے مخالفت بلند نہ ہوتی اور معاملہ ڈھکا چھپا رہ جاتا - لیکن خیر جو کچھ ہوا وہ ہوا اب گورنمنٹ اور مسلمان پبلک دونوں کو اصلی حالات پر غور کرنے کا موقع مل گیا ہے۔

بنگالی اخبارات ڈھاکہ یونیورسٹی کو اپنے پرانے ایجی ٹیشن کے تازہ کرنے کا ذریعہ خیال کرتے ہیں جس سے زیادہ سخت مخالفت کا اظہار دوسرے لفظوں میں ہو نہیں سکتا۔ وہ اصلی وجہ جو اس درجہ بنگالیوں کی ناراضمندی کا موجب ہوئی ہے بہت صاف ہے اور وہ یہ ہے کہ تقسیم بنگال کی منسوخی سے جو توقع بنگالیوں کو ہوئی تھی کہ مسلمان پھر قعر مذلت میں ڈھکیل دئے جائیں گے وہ اس نئے انتظام سے کہ ڈھاکہ میں ایک جداگانہ یونیورسٹی قایم ہوا اور ایک خاص افسر صیغہ تعلیم کی نگرانی کے واسطے مقرر کیا جائے پوری نہیں ہوتی اور اب اس کے بعد ہر شخص آسانی کے ساتھ سمجھ سکتا ہے کہ مسلمان کیونکر بنگالی پلیٹ فارم پر شریک ہوکر اپنے مقاصد میں کامیاب ہو سکتے ہیں۔ ہمارے وہ مسلمان دوست جو حال میں کانگریس میں شریک ہونے کی طرف مائل ہوئے تھے غالباً اب اُن کو اپنے رائے بدلنی ہوگی۔

تقسیم بنگال کے وقت بھی کوئی اور وجہ اس قدر ناراضی کی نہ تھی جبتنی ناراضی کہ بنگالیوں نے اس پر دکھلائی اور تعجب ہے کہ گورنمنٹ نے بھی چال

میں یہ کیوں کر تسلیم کر لیا کہ ایک زبان بولنے والی قوم دو گروہوں میں منقسم ہو جانے سے مُلک کو ایک اچھی وجہ نارضامندی کی تھی۔ ارضی تقسیم سے کوئی حقیقی روک ان دونوں صوبوں کی رعایا کے میل جول میں پیدا نہیں ہوتی تھی ریلیں ویسے ہی جاری تھیں۔ تار وہی قایم تھے ڈاک کا سلسلہ بدستور باقی تھا۔ جہاز اُسی طرح آمد و رفت کرتے تھے کوئی قرنطینہ دونوں صوبوں کے درمیان قایم نہیں ہوا تھا۔ ہائی کورٹ ایک تھی۔ یونیورسٹی ایک تھی۔ قوانین ایک تھے فرق جو کچھ ہو گیا تھا وہ صرف یہی تھا کہ جدید صوبہ کے قایم ہو جانے سے مسلمان (جو پہلے بالکل ڈوبی ہوئی حالت میں تھے) وہ کچھ اُبھر آئے تھے اور اُن کی گردنیں نظر آنے لگی تھیں اور امید ہو چلی تھی کہ وہ اب کنار ترقی پر آلگیں گے اسی بات کا ایجی ٹیشن کرنے والوں کو اصلی رنج تھا اس کے علاوہ اصلی مقصد اُن کا یہ تھا کہ ہندو رعایا کو گورنمنٹ کی طرف سے ناراض کردیں اس کے واسطے یہ ایک بہت اچھا حیلہ اور بہانہ اُن کے لیڈروں کے ہاتھ آگیا تھا جس کو آئندہ بھی مختلف ذریعوں سے قایم رکھنا چاہتے ہیں تاکہ اُن کی قومی فیلنگ اور قومی جوش برقرار رہے اور یہ وہ اس وقت تک کئے جائیں گے کہ اُن کا سوراج اُن کو حاصل ہو جائے۔

اب رہا یہ سوال کہ ڈھاکہ یونیورسٹی مسلمانوں کے لئے کس طرح مفید ہو سکتی ہے بے شک ہم شکرگذار ہیں کہ گورنمنٹ نے منسوخی تقسیم بنگالہ کے بعد یہ ایک تدبیر ایسی کی ہے کہ جو آیندہ مسلمانوں کے حق میں مفید ہو سکتی ہے۔ لیکن ابھی اس کے متعلق عملی طور سے بہت کچھ غور و فکر کی ضرورت ہے تاکہ گورنمنٹ کا جو منشاء اس کے ذریعہ سے مسلمانوں کو فائدہ پہنچانے کا ہے وہ پورا ہو۔ آج حالت یہ ہے کہ شرقی بنگالہ کے مسلمانوں میں ایسے لائق اشخاص کی بہت کمی ہے جو

یونیورسٹی کو کامیابی کے ساتھ چلا سکیں۔ حضور والا سرائے سے ہر ایک مسلمان اس صوبہ کا اور باہر کے مسلمان بھی بالکل متفق ہیں کہ ڈھاکہ یونیورسٹی کچھ خالص مسلمانوں کی یونیورسٹی نہ ہوگی بلکہ اس کے دروازے سب قوموں کے لئے کُھلے ہوں گے۔ اور مسلمانوں کی جو پسیت حالت مشرقی بنگال میں تعلیم کے لحاظ سے ہے اور جو ترقی ان کے دوسرے ہمسایہ تعلیم میں کر رہے ہیں اس کے لحاظ سے اس میں کوئی شک نہیں ہے کہ ڈھاکہ یونیورسٹی کے قائم ہونے سے بھی زیادہ نفع بنگالیوں کو پہنچے گا۔ اور جب تک کہ گورنمنٹ اپنے اس ارادے پر مضبوطی سے قایم نہ رہے گی کہ وہ خاص خاص تدابیر عمل میں لائے جن سے مسلمان بھی یونیورسٹی سے زیادہ فائدہ حاصل کر سکیں اس وقت تک مسلمانوں کی کامیابی کی کوئی صورت نہیں معلوم ہوتی۔ بلاشبہ انصاف کی بات ہے کہ جن افراد کے ہاتھ میں ڈھاکہ یونیورسٹی کا انتظام ہوگا اُن میں ہندو بنگالیوں کی ایک کافی تعداد ہونی چاہئے تاکہ ان کو کوئی اصلی وجہ شکایت کی پیدا نہ ہو۔

اسی سلسلہ بیان میں اس کے قانون اساسی میں بعض امور انتظامی پر بحث کرتے ہوئے فیلوز کے جداگانہ انتخاب اور تعداد پر توجہ دلا کر تجویز کی کہ

جس قدر تعداد مسلمان فیلوز کے واسطے قرار پائے اگر اُس قدر مسلمان گریجویٹ میسر نہ آسکتے ہوں تو جس قدر کمی رہ جائے اس پر عارضی طور سے گورنمنٹ اپنے انتخاب سے یورپین فیلوز مقرر کر دے اور پھر رفتہ رفتہ اور جیسے مسلمان گریجویٹوں کی تعداد (جو انتخاب کا حق رکھتے ہیں) بڑھتی جائے یورپین ممبروں کی تعداد رفتہ رفتہ کم ہوتی رہے یہاں تک کہ مسلمان اپنی مجوزہ تعداد پوری کر لیں۔ یہاں یہ ضرور یہ اعتراض کیا جائے گا کہ یہ ایک ایسی تجویز ہے جس سے صوبہ

کے دو گروہوں میں تعلقات خوشگوار نہ رہیں گے۔ اور یہ ایک بڑی بدگمانی ہے جس کا اظہار مسلمانوں کی طرف سے اپنے دوسرے ہمسایوں کی نسبت ہونا نہیں چاہئیے لیکن تجربہ سب سے بہتر دلیل ہے۔ جو تجویز اوپر بیان کی گئی ہے اُس کی واجبیت تجربہ اور مشاہدہ سے ثابت ہے چند یوروپین جو اس اسکیم کے متعلق اپنے واجبی حصہ سے کچھ زیادہ عارضی طور پر معتبر ہو جائیں گے اُن سے ہر طرح یہ توقع کی جا سکتی ہے کہ وہ ہندو اور مسلمان دونوں کے حق میں منصفانہ اور بے طرف داری کی رائے دیں گے یہی توقع بلا شبہہ ہم کو اپنے ہندو اور مسلمان ممبروں سے بھی رکھنی چاہئیے اور ممکن ہے کہ زمانہ آیندہ ہماری اس توقع کو پورا کرے۔ لیکن آج کی جو حالت ہے اور مدت ہائے دراز سے جو تجربہ ہوتا چلا آتا ہے اُس سے یہی نتیجہ نکلتا ہے کہ اگر مسلمان ہندوؤں کے مقابلہ میں میناریٹی میں رہیں گے تو کبھی ان کے ساتھ انصاف نہ ہوگا۔ یہ ایک نہایت واجبی رائے ہے جس کا بیان نہ کرنا ایک سخت غلطی کا ارتکاب ہوگا۔

مشترک انتخاب سے اختلاف

نواب وقار الملک نے پولیٹکل آرگنائزیشن اور مسلم لیگ کے قیام واساس سے جو سیاسی تحریک مسلمانوں میں پیدا کر دی تھی اگرچہ ۱۹۰۸ء سے اس کی رہنمائی کا بار اُن کے شانوں پر نہ تھا تاہم علی گڑھ میں مسلم لیگ کا دفتر قائم تھا اور آنریری سکریٹری کا بنگلہ اس تحریک کا مرکز اور چشمہ بنا ہوا تھا تعلیم یافتہ نوجوانوں کا پُرجوش طبقہ نواب صاحب کی سیاسی رہنمائی کا منتظر رہتا تھا اور وہ بھی وقتاً فوقتاً نہ صرف پرائیوٹ طور پر بلکہ اخباروں اور تقریروں کے ذریعہ اپنے خیالات سے آگاہ کرتے رہتے تھے۔

۱۹۰۸ء میں یہ مرحلہ پیش آیا کہ ۱۹۰۶ء میں انتخابات کے متعلق لارڈ منٹو کی گورنمنٹ

آف انڈیا بلکہ برٹش گورنمنٹ کی جانب سے جو مستحکم وعدہ کیا تھا اس سے مسلمان کامل طور پر مطمئن ہو گئے تھے لیکن ہندو وعدہ یا تسلیم حقوق پر جو احتجاج کر رہے تھے اور اس کو بعض گورنمنٹوں کے اخلاف سے جو تقویت پہنچ رہی تھی اس لئے ایک طرف گورنمنٹ کو لفظاً و معناً اس وعدہ کا پورا کرنا مشکل نظر آیا اور دوسری طرف اول ہفتہ جولائی ۱۹۰۹ء میں چند مسلمان جن میں سر مؤید الملک سید علی امام خاص طور پر سرگرم تھے یہ تحریک لے کر آگے بڑھے کہ

مسلمانوں کا مشترک انتخاب سے کلیتاً علیحدہ رہنا ہندوؤں سے بالکل ہی علیحدہ کر دے گا لہذا ان کو مشترک انتخاب میں بھی شریک ہونا چاہیئے اور اس لئے مسلمان نمایندوں کی کچھ تعداد ایسی ہو جو مشترک طور پر منتخب کئے جائیں اور ان میں کچھ کمی بیشی بھی روا رکھی جائے۔

اُنہوں نے اس امر کی کوشش کی کہ اپنے چند ساتھیوں کی امداد سے مسلم لیگ کے اجلاس میں جو (۱۰ جولائی کو بذریعہ تار طلب کیا گیا) اس اصول کو باضابطہ طور پر تسلیم کرا کے گورنمنٹ آف انڈیا کا ڈسپیچ روانہ ہونے سے پہلے باضابطہ طور پر پیش کر دیا جائے اور جب جلسہ منعقد ہوا تو باوجود کورم پورا نہ ہونے کے اس تحریک کے منظور کئے جانے پر ان کا زور اور اصرار رہا لیکن نواب صاحب نے سخت مخالفت کی اور جلسہ بغیر نتیجہ کے ختم کرنا پڑا۔

چوں کہ اس جماعت نے اپنے میلان اور رائے کی اخبارات میں بھی کافی اشاعت کی تھی اس لئے نواب صاحب نے اس اثر کو دور کرنے کے لئے اپنی رائے دو نہایت معرکۃ الآرا مضامین کے ذریعہ سے ظاہر کی۔ ایک مضمون میں اپنے پولیٹکل حقوق کو صدمہ پہنچائے بغیر دونوں قوموں کو شیر و شکر رہنے کی ہدایت کی اور ہندوؤں کے ساتھ مذہباً حقوق ہمسائگی پیش کر کے ہمدردی و سلوک سے بسر کرنے کی نصیحت کی مگر مشترکہ انتخاب کو جھگڑوں اور قصوں کا باعث اور قدیمی تعلقات میں خرابی کا سبب بتا کر مشورہ دیا کہ جو کچھ جداگانہ انتخاب کے ذریعہ سے ملے اُس پر قناعت کرنی چاہیئے اور اگر اس میں کسر رہ جائے

توآئندہ کے لئے کوشش جاری رکھی جائے اُنہوں نے مشترک انتخاب میں کامیابی کو غیر متیقن بتانے کے بعد اس امر پر توجہ دلائی کہ اس کے ساتھ ہی وہ ذلت و رسوائی مزید برآں ہوگی جو مجارٹی کے سامنے دست گدائی پھیلانے سے حاصل ہوگی اور اگر کوئی کامیابی ہو بھی جائے گی تو وہ دوسرے غالب گروہ کی مہربانی کا نتیجہ ہوگی[۵] اور ایسے ممبر قوم کے حق میں بعض اوقات سخت مضرت کا موجب ثابت ہوں گے۔

ان صوبوں کی جہاں مسلمانوں کی مردم شماری زیادہ ہے بعض مثالیں پیش کیں کہ کس طرح ہندوؤں نے اپنی دولت و قوت اور تعلیم وغیرہ کے اثر سے کام لے کر مسلمانوں کو اپنی رائے کے خلاف ووٹ دینے پر مجبور کیا آخر میں اس بات پر زیادہ زور دیا کہ مشترک انتخاب دائمی رنج اور فساد کا باعث ہوگا اور اس اکھاڑے میں مسلمانوں کو نہیں اُترنا چاہئے۔

ایک مدلّل مضمون لیکن دوسرے مضمون میں اُنہوں نے نہایت آزادی کے ساتھ گورنمنٹ کی پالیسی پر نکتہ چینی کی اور اس پالیسی کے جو نتائج متیقن ہو سکتے تھے اُن پر بحث کی یہ مضمون نہایت اہم ہے اور جب تک فرقہ وارانہ اختلافات قایم ہیں اُس کی اہمیت قایم رہے گی اس لئے بجنسہ اس موقع پر نقل کیا جاتا ہے۔

گورنمنٹ کی پالیسی اب یہ ہے کہ کونسل ہائے قانون کی ممبریوں کے متعلق ایک حصہ مسلمانوں اور ہندوؤں کے لئے مشترک بھی چھوڑ دیا جائے تاکہ وہ دونوں گروہ صلح سے یا جنگ سے جس طرح مناسب سمجھیں اپنی اپنی کامیابی کے لئے کوشش کریں۔ اس پالسی سے گورنمنٹ کو ایک فائدہ تو یہ ہو گیا ہے کہ ہندوؤں کا گروہ جو گورنمنٹ سے یہ شکایت کرتا تھا کہ مسلمانوں کو مردم شماری سے زیادہ جو کچھ ان کی پولیٹکل عظمت کے لحاظ سے دینا تجویز کیا گیا وہ ان کے نزدیک خلاف انصاف ہے اب اس شکایت کے جواب میں بجائے اس کے کہ نہایت مضبوط

[۵] صوبہ دہلی سے ۱۹۳۴ء میں اسمبلی کے لئے مسٹر آصف علی بار اٹ لا کے انتخاب میں ایک سخت کشمکش کے بعد یہی مہربانی بروئے کار آئی۔

اور صاف آواز سے کہہ دیا جاتا کہ گورنمنٹ کا یہ فیصلہ واقعات اور واجبیت پر
مبنی ہے اب ان شکایت کرنے والوں کو یہ کہہ کر مطمئن اور ساکت کر دیا جاویگا
کہ مسلمانوں کا وہ زائد حصہ اب تمھاری ہی مجارٹی کے اختیار میں ہے چاہے
ان کو دو یا نہ دو تم جانو اور تمھارا کام جانے۔

دوسرا پہلو گورنمنٹ کی پالیسی کا ایک اور ہے جس کی نسبت بلا خوف
تردید کہا جا سکتا ہے کہ بہت سے اشخاص اس پالیسی کی نسبت یہ بدگمانی
کرتے ہیں کہ مشترک انتخاب کو قائم کر کے گورنمنٹ نے اپنی رعایا کے دو بڑی
گروہوں میں مخالفت کی بنیاد قائم کر دی ہے تاکہ وہ دونوں باہم کسی
وقت متحد نہ ہونے پاویں کیونکہ اگر مسلمان اور ہندو اس مُلک میں کسی
وقت متحد اور متفق ہو جاویں تو جو کچھ ملکی حقوق ایک تعلیم یافتہ ملک کو اعلیٰ
گورنمنٹ سے انصافاً ملنے واجبی ہیں ان کو گورنمنٹ زیادہ عرصہ تک روک
سکے گی یہ حالات کچھ نئے نہیں ہیں بہت عرصہ سے اس کا چرچا ہو رہا ہے
اوائل میں تعلیم یافتہ گروہ میں اس سے اکثر اختلاف ہوتا تھا اور اب بھی جس
کی تعلیم بہت اعلیٰ ہے اور جو گورنمنٹ کی ذمہ داریوں اور اُس کے اعلیٰ
فرائض سے بخوبی واقف ہیں اور جن کو خاص طور پر گورنمنٹ کے کاروبار
میں شریک رہنے کا زیادہ موقع ملا ہے وہ قبول نہیں کرتے کہ گورنمنٹ ایسی
تنگ دلی کی پالیسی اپنی رعایا کے متعلق اختیار کرے گی۔

خیر وجوہ کچھ ہی ہوں گورنمنٹ نے جب یہ پالیسی اختیار کر لی ہے کہ ملک
میں ایک حصہ مشترک انتخاب کا بھی قائم رکھا جاوے تو اب افسران گورنمنٹ
کی طرف سے بھی یہ لازمی امر ہے کہ وہ کم از کم در پردہ اس بات کی سعی کریں
کہ ہندو اور مسلمان دونوں مشترک انتخاب میں شریک ہوں جہاں تک

ہندوؤں کا اس سے تعلق ہے وہاں تک چونکہ مجارٹی ان کی ہے لہذا ان کی نسبت مجارٹی کا لفظ ایک فرضی لفظ ہے در اصل جہاں تک اشتراک اور عدم اشتراک سے بحث ہو سکتی ہے وہ مسلمانوں ہی سے متعلق ہو سکتی ہے مسلمان رؤسا اور امرا کی دو قسمیں ہیں ایک تو وہ جنہوں نے اعلیٰ تعلیم پائی ہے یا اُن کی خداداد دماغی قوت نے ان کو ضروریات زمانہ سے بخوبی آگاہ کر دیا ہے اور وہ عزت کے اصل مفہوم کو اچھی طرح سمجھے ہوئے ہیں اور دوسری پرانی وضع قطع کے غیر تعلیم یافتہ حضرات اُن میں سے اول الذکر تو گورنمنٹ سے صاف صاف مُلک کے موجودہ حالتوں اور ضرورتوں کو بیان کر کے مشترک انتخاب سے اپنے آپ کو علٰحدہ رکھیں گے مگر اس گروہ کی تعداد ابھی بہت کم ہے اور دوسرا گروہ جن کی تعداد بھی زیادہ ہے اُن کو گورنمنٹ کے اعلیٰ افسروں کے ایما سے گریز کرنا ناممکن کے قریب ہوگا۔ اور گو وہ اپنے دل میں کیسا ہی پیچ و تاب کھائیں اور مشترکہ مقابلہ کی مشکلات اور ادنےٰ ادنےٰ لوگوں کے سامنے التجائے جانے کو وہ کیسا ہی معیوب اور اپنی قدیمی وضع کے خلاف سمجھیں لیکن طوعاً و کرہاً ان کو مشترکہ انتخاب میں شریک ہونا پڑے گا نتیجہ میں اگر وہ کامیاب ہوئے تو مختلف قسم کے ایسے اسباب پر مبنی ہوگا جس کو اول الذکر گروہ برداشت نہ کر سکتا تھا تو فبہا ورنہ گورنمنٹ دوسرے طریقہ سے ان کی اشک شوئی کرے گی اور ان کو ان عزتوں سے سرفراز کرے گی جن کو وہ غلطی سے عزت سمجھے ہوئے ہیں۔ اس دوسرے گروہ کی نسبت میں بلا تامل یہ کہوں گا کہ چاہے مقابلہ کے وقت ان کو کیسی ہی ندامت حاصل کرنی پڑی ہو لیکن ان کی خیرخواہی اور وفاداری میں جس کو گورنمنٹ خیرخواہی اور وفاداری سمجھتی ہے اس ناکامی کی وجہ سے

کوئی فرق نہ آوے گا اور وہ گورنمنٹ کو ویسے ہی خیر خواہ اور وفادار رہیں گے جیسے کہ پہلے تھے۔

لیکن اول الذکر تعلیم یافتہ مسلمان گروہ میں سے اگر کوئی مشترک انتخاب کا حامی بنا تو اس کی حالت بالکل دوسری ہو گی امارت اور بڑی بڑی تعلقہ داریوں اور زمینداریوں سے قطع نظر کر کے اعلیٰ تعلیم یافتہ مسلمان گریجویٹوں میں سے اگر کسی نے یہ رائے قائم کی کہ مشترک انتخاب میں حصہ لینا ملک کے لئے مفید ہے تو اس قسم کے اہل الرائے سے جو گروہ بنے گا وہ ایک ایسا گروہ ہو گا جس کی قوت کو آخر الامر گورنمنٹ اس خوشی اور اطمینان سے نہ دیکھ سکے گی جس طرح کہ آج دیکھے گی۔ ایک تعلیم یافتہ شخص اپنی یہ رائے اُسی وقت قائم کرے گا جب کہ یا تو وہ کانگریس کا مُرید بن چکا ہے یا وہ ملکی محبت میں اس درجہ سرشار ہو گیا ہے جس نے قوم قوم کی صدا کو اپنے لئے موجب ننگ سمجھ لیا ہے اور بندۂ عشقم و از ہر دو جہاں آزادم، اس کے رگ وپے میں سرایت کر چکا ہے وہ صرف اس زاد بوم کی آزادی چاہتا ہے جس میں وہ پیدا ہوا ہے گو کہ اس کی قوم پامال ہی کیوں نہ ہو جائے اس درجہ کے لوگ جن کو میں حد سے بڑھ جانے والا ملکی دیوانہ کہوں گا اور اُن کی نیک نیتی کی وجہ سے اُن کی بہت ہی عزت کروں گا ضرور مشترک انتخاب میں خوشی سے حصہ لیں گے اور ہندوؤں کے اکسٹریمسٹ گروہ کے نشو ونما کو میں گورنمنٹ کی اس غلط پالسی کا نتیجہ قرار دوں گا جو اس نے مشترکہ انتخاب کے قائم کرنے میں اختیار کی۔

مسلمان سر گروہوں نے اس وقت تک اپنے مرحوم و مغفور سر سید احمد خاں کی پالسی کو برقرار رکھنے اور مسلمانوں کو من حیث القوم نیشنل کانگریس سے علیحدہ رہنے اور ان میں اس خیال کو بطور اصول کے ذہن نشین کرنے میں کہ

ہندوستان میں مسلمانوں کی بقا وثبات برٹش گورنمنٹ کے بقا اور ثبات پر منحصر ہے جس طرح ان سے ہوسکا جی توڑ کر کوشش کی ہے اور میں دعوی کے ساتھ کہہ سکتا ہوں کہ وہ اس میں کامیاب ہوئے ہیں لیکن گورنمنٹ کی اس قسم کی غلطیاں اگر ان کو راہ راست سے رد گرداں کر کے فصیح مقرروں اور ملک کی آزادی کے لکچروں کے پھندے میں پھنسا دیں اور سبز باغوں کی اُن کو سیر کرانے لگے تو اس کی تمامتر ذمہ داری آیندہ گورنمنٹ پر ہوگی نہ کہ سرگروہوں پر۔

اسی طرح ایک اور اندیشہ بھی ہے اور وہ یہ ہے کہ جب مسلمان مشترک انتخاب میں بار بار زک پاویں گے اور ذلیل وخوار ہوں گے تو عجب نہیں جو کسی وقت وہ یہ سمجھ جاویں کہ یہ مشترک انتخاب کا کوئی محفوظ راستہ نہیں ہے جو گورنمنٹ نے ہمارے لئے تیار کیا ہے اور جس طرح بسا اوقات مایوسی بھی ایک ذریعہ کامیابی کا ہو جاتی ہے وہ اس آپس کے جھگڑوں سے باز آویں اور باہم شیر وشکر بن کر بہ تعداد کثیر نیشنل کانگریس کے پلیٹ فارم پر دکھائی دینے لگیں اور یاد رکھو کہ جو لوگ اس طرح پلٹا کھائیں گے وہ ماڈریٹ پارٹی میں شامل نہ ہوں گے بلکہ وہ سیدھے اکسٹریمیٹ پارٹی کا جزو ہو جاویں گے اور اُس دن گورنمنٹ کو تو افسوس ہوگا وہ ہوگا ہی مسلمانوں کے لئے بھی وہ دن قیامت کا دن ہوگا میں یہ اندیشہ صرف قیاسی طور پر ظاہر نہیں کر رہا حال ہی میں ایک نہایت دردانگیز مثال اس کی پیش آچکی ہے جب پانی سر سے اونچا ہو گیا اور ڈوبنے کا وقت آگیا تو اصلی اور سچی بات کو دل میں رکھنا اور ظاہر نہ کرنا میرے نزدیک قومی اور ملکی نمک حرامی ہے تھوڑے ہی عرصہ کا ذکر ہے جو لندن میں ایک ایسا جلسہ ہوا جس میں مسلمانوں اور

ہندؤں کے حقوق اور تحفظ کی پالیسی کی حفاظت کی گئی اور بظاہر گورنمنٹ کی چہیتی پالسی انتخاب مشترکہ کی طرفداری کی گئی اس میں ہمارے کالج کی بعض وہ طلبا بھی شریک ہوئے جواب تک ہماری اسی قومی پالسی کے دلدادہ تھے جو سرسید صاحب مرحوم ومغفور کے وقت سے ہم میں وراثتاً منتقل ہوتی چلی آئی تھی۔ اور اُنھوں نے بھی اسی جلسہ کی پالسی کی تائید کی اس جلسہ کی نسبت صرف اتنا کہنا اور کافی ہے کہ اس میں بپن چندر پال جیسے اکسٹریمسٹ سرگروہ کانگریس بطور ایک قیمتی جزو اس جلسہ کے شریک تھے یہ خبر جس روز مجھ کو ملی اس رات میں مجھ کو اچھی طرح نیند نہیں آئی اور میں برابر اس خیال سے بے چین رہا کہ گورنمنٹ نے مشترکہ انتخاب کے صرف ایک صفحہ کو دیکھا اور دوسرے صفحہ کی طرف نظر نہیں کی کہ وہاں کیا تماشا ہو رہا ہے اور ہماری سالہا سال کی محنتوں اور کوششوں پر گورنمنٹ کی غلط پالیسیاں پانی پھیرے دیتی ہیں کام خود گورنمنٹ خراب کر رہی ہے اور بدنامی آخر الامر مسلمان سرگروہوں کے سر پڑے گی۔ وما علینا الا البلاغ

بے چینی اور قوم کو تنسیخ تقسیم بنگال سے اثر پذیری

۱۹۰۵ء میں تقسیم بنگال سے چونکہ مشرقی اضلاع کے پسماندہ مسلمانوں کے لئے عام ترقی کی جدید توقعات پیدا ہو گئی تھیں اور اُن کے اُبھرنے اور ترقی کی اسباب کا مہیا ہو جانا متیقن تھا اس لئے اُنھوں نے اس تقسیم کا خیر مقدم کیا لیکن بنگالی ہندووں میں حکومت کے خلاف شدید جذبات پیدا ہو گئے جن کے زبردست اجی ٹیشن نے برطانوی مال کے مقاطعہ اور دہشت انگیزی کی صورت اختیار کر لی۔

یہ خوفناک جذبات صرف بنگال ہی تک محدود نہ تھے بلکہ اُن سے تمام ہندوستان کی ہندو آبادی متاثر تھی اور سیاسئین کا طبقہ اس کا موید و حامی تھا کانگریس کے اجلاسوں

میں اس تقسیم کے خلاف غم وغصہ کا اظہار کیا جاتا تھا چنانچہ ۱۹۰۹ء میں کانگریس کے سالانہ اجلاس میں پنڈت مدن موہن مالویہ نے اپنے پریسیڈنشل ایڈریس میں اس مسئلہ پر بہت کچھ کہا اور بعدہ رزولیوشن کی صورت میں احتجاج کیا گیا اسی سلسلہ میں مشرقی بنگال کے بعض مقامات پر دونوں قوموں میں تصادم بھی ہوا اور مسلمانوں کے خلاف جارحانہ کارروائیاں کی گئیں۔ ہندو مسلم زعمائے ملک کو ان دونوں قوموں کے اتحاد کی اہم ضرورت کا بھی احساس تھا یکم جنوری ۱۹۱۱ء کو الہ آباد میں ہندو مسلم کانفرنس قائم ہوئی اور نواب وقارالملک بھی اس کانفرنس میں شریک ہوئے۔ لیکن اسی سال کے خاتمہ پر جب دربار تاج پوشی منعقدہ دہلی میں انتظامی تبدیلیوں کے ضمن تقسیم بنگالہ کی تنسیخ ہوئی اور دربار میں ملک معظم قیصر ہند نے اس کا اعلان کیا تو مسلمان حیران رہ گئے۔

(نوٹ) ۱۹۰۵ء سے مسٹر گوکھلے اس اتحاد پر بہت کچھ زور دے رہے تھے انہوں نے دورے کرکے تقریریں بھی کی تھیں نواب محسن الملک نے بھی ان کی کوششوں کا خیر مقدم کیا تھا ایم اے او کالج میں بھی ایک تقریر ہوئی تھی مگر نا اتفاقی کی یہ خلیج متواتر وسیع ہوتی جا رہی تھی اور افسوسناک واقعات کی لہریں روز بروز بڑھ رہی تھیں خود مسٹر گوکھلے کی کوشش اتحاد مشتبہ تھی مسٹر (مولانا) محمد علی نے ان کی دوست نما دشمنی کے عنوان سے ٹائمز آف انڈیا میں سلسلہ مضامین شروع کیا تھا ۱۹۱۰ء سر ولیم ویڈربرن نے جو اس سال کے کانگریس سشن کے پریسیڈنٹ منتخب ہوئے تھے ہز ہائینس آغا خان اور سید امیر علی کے اتفاق رائے سے انگلستان میں ایک اتحاد کانفرنس کا فیصلہ کرلیا تھا، چنانچہ وہ منعقد ہوئی چالیس مسلمان اور ساٹھ ہندو سیاسیئین جمع ہوئے ہندوؤں میں سر سرندر ناتھ بنرجی، مسٹر گوکھلے، پنڈت مدن موہن مالویہ، سر سندر لال، پنڈت موتی لال نہرو (ڈاکٹر) تیج بہادر سپرو (لالہ) سنھا مہاراجہ دربھنگہ، مسلمانوں میں ہز ہائینس آغا خان، نواب وقارالملک، سر ابراہیم رحمۃ اللہ مسٹر محمد علی جینا، مسٹر حسن امام (پٹنہ)، (مولانا) محمد علی، مسیح الملک حکیم اجمل خان، قابل الذکر اصحاب تھے، کانفرنس کے غور کے لئے حسب ذیل امور تجویز ہوئے۔ (بقیہ نوٹ بر صفحہ آئندہ)

چوں کہ اس موقع پر کانفرنس اور لیگ کے اجلاس بھی تھے اِسلئے بہت زیادہ مسلمانوں کے سیاسی مستقبل پر بحثیں ہوئیں اور سب ہی نے غم و غصّہ کا اظہار کیا۔

نواب صاحب کا ایک پُر جوش مضمون

نواب صاحب خاموشی کے ساتھ اس حالت پر غور کرتے رہے اور علی گڑھ واپس آکر پہلی فرصت میں انھوں نے "ہندوستان میں مسلمانوں کی آیندہ حالت" کے عنوان سے

(بقیہ نوٹ صفحہ گذشتہ) (۱) صلح کرانے والی پنچایتوں اور عدالتوں کا قیام (۲) مقدمہ بازی کو کم کرنے کی کوشش (۳) طرفین سے بائیکاٹ کی بندش (۴) اس کوشش کا روکنا کہ ہندو یا مسلمانوں کو کسی خاص محلہ میں داخل ہونے سے روکا جائے (۵) اردو ہندی کا نزاع (۶) میونسپل اور ڈسٹرکٹ بورڈوں میں مسلمانوں کے حق نیابت کو تسلیم کرنا (۷) شرح سود کی کمی۔ (۸) رہن شدہ جائدادوں کی جبریہ فروخت کا انسداد (۹) قومی تعلیم (۱۰) آریہ سماج کی اشتعال انگیز تحریک (۱۱) گاؤکشی اور باجہ کے متعلق مسلمانوں اور ہندوؤں کی احتیاط (۱۲) بوجہ اقلیت مسلمانان کسی ایسے مسئلہ پر زور دینا جو مسلم لیگ کی رائے میں مسلمانوں کے لئے مضر ہو۔ پریسیڈنٹ نے ایک جوش انگیز تقریر کی ہز ہائینس سر آغا خان نے مسلمانوں کی جانب سے اور بابو سرودا چرن مترنے ہندؤں کی طرف سے تقریریں کیں اور مسائل زیر غور پر نیک نیتی و فراخ دلی اور ہمدردی سے بحث کرنے کی ضرورت ذہن نشین کرائی، گاؤکشی اور باجہ کے مسائل پر غور کرنے کیلئے ایک مقتدر کمیٹی قائم ہوگئی لیکن اس کمیٹی اور کانفرنس کا کوئی نتیجہ نہ نکلا زیر غور مسئلہ اردو ہندی کا تھا مگر دوسری طرف ناگری پرچارنی سبھا جو عرصہ سے ناگری پرچار اور ہندوستانی کی مخالفت کے لئے قائم تھی اپنی کوشش کو تیز کر رہی تھی اور اُسی زمانے میں مہاراجہ بڑودہ نے اس کے ایڈریس کے جواب میں ایک نہایت حوصلہ افزا تقریر بھی کی تھی اور ہنوز اس کانفرنس کی روئداد کی روشنائی بھی خشک نہ ہوئی تھی کہ یونائیٹڈ پراونسز کانفرنس کے اجلاس منعقدہ بریلی میں پنڈت بشن نرائن دَر نے بحیثیت صدر جو ایڈریس کیا اس میں مسلمانوں کے جداگانہ نیابت کے (بقیہ نوٹ برصفحہ آئندہ)

۲۰ر دسمبر کے انسٹیٹیوٹ گزٹ میں ایک مضمون شایع کیا اور ایک تمہید کے بعد انتظامی تبدیلیوں سے جس سے عام فوائد و نقصانات کا امکان تھا اظہار رائے کر کے لکھا کہ:-

سب سے زیادہ معرکۃ الآرا، مضمون دونوں بنگالوں کے الحاق کا ہے۔ جہاں تک مسلمانوں کا تعلق ہے یہ عام رائے سمجھنی چاہیئے کہ یہ الحاق عام طور پر ناپسند کیا جاتا ہے اور بعد اس کے کہ وزرائے سلطنت نے یکے بعد دیگرے الحاق کے خلاف امیدیں دلائی تھیں الحاق کا عمل میں آنا گورنمنٹ کی کمزوری اور آئندہ اس کے قول و فعل کی بے اعتباری کی ایک وجہ قرار دی جائیگی۔ اور اسلئے اگر ایسا نہ ہوتا تو بہتر تھا۔ لیکن جب کہ بدقسمتی سے ایسا ہو گیا ہے تو اب سوال یہ ہے کہ آئندہ مسلمانوں کو کیا کرنا چاہیئے؟ بات یہ ہے کہ اب جو کچھ ہو گیا اور شہنشاہِ معظم کی زبانِ مبارک سے نکل گیا اُس کے خلاف ایجی ٹیشن کا جاری رکھنا نہ مفید ہوگا اور نہ مناسب، اب جس بات کی ضرورت ہے اس کی طرف ہم کو بھی اور گورنمنٹ کو بھی کوشش کرنی چاہیئے اور وہ یہ ہے کہ جو فوائد مسلمانوں کو شرقی بنگالہ کی علیحدگی سے حاصل ہوئے تھے (اور حاصل ہو رہے تھے) ان میں کوئی فرق نہ آئے اور ایسا ہونا اگر گورنمنٹ چاہے تو مطلق دشوار نہیں ہے اور گورنمنٹ جس قدر جلد اس قسم کے انتظاموں کا اعلان کرے گی اسی قدر ملک میں عام اطمینان کا موجب ہوگا اور ایجی ٹیشن رُک جائے گا اور مسلمانوں میں عام نارضامندی پیدا نہ ہونے پاوے گی، ان اعلانوں کا ہونا اسی وقت میں ضروری ہے جب کہ شہنشاہ معظم

(نوٹ بقیہ صفحہ گذشتہ) اصول و حق پر نہایت سخت اعتراض کرتے ہوئے سرسید کی نسبت کوتاہ نظر پالیٹیشن کے الفاظ بھی استعمال کئے جن سے مسلمان لیڈروں کو ہندو سیاسئین کی نیتوں پر جو شکوک تھے اور بھی قوی ہو گئے۔

ہندوستان میں تشریف رکھتے ہیں ورنہ ایجی ٹیشن بہت ترقی کر جائے گا
اور مسلمان جو طرابلس اور ایران کے معاملات سے پہلے ہی شکستہ خاطر ہو رہے
ہیں اُن کے خیالات اور بھی زیادہ مایوسانہ ہو جائیں گے۔ ہماری دلی خواہش
اب یہی ہے کہ حضور شہنشاہِ معظم اِس مُلک سے رخصت ہوتے وقت اپنے پیچھے
نعرہ ہائے مسرت اور شکر گذاری کے سوا اور کچھ نہ چھوڑیں۔

پھر مشرقی بنگالہ کے مسلمانوں کو بہ اصرار ایجی ٹیشن سے باز رہنے کی ہدایت کرتے ہوئے گورنمنٹ کو اُن تدابیر کے عمل میں لانے پر متوجہ کیا کہ جن سے مسلمانوں کے حقوق کافی اور قطعی طور پر محفوظ ہو جائیں۔

نیز اس تقسیم کے بعد مشرقی بنگالہ کے مسلمانوں نے جو ترقی کی تھی اُس کا بھی مجملاً تذکرہ کیا اور اب جو تبدیلی ہوئی اُس کو پولٹیکل غلطی سے تعبیر کر کے اسکے اثر کو اس طرح بیان کیا۔

اس کارروائی سے گورنمنٹ نے مسلمانوں کی طرف سے نامناسب بے پروائی
برتی اور اس کا اثر یہ ہوا کہ بعض تعلیم یافتہ مسلمانوں میں بھی انہی تھوڑے دِنوں
میں یہ فیلنگ پیدا ہو چلی ہے کہ ہندوؤں سے علیحدہ رہنے میں مسلمانوں کا کوئی
فائدہ نہیں ہے مسلم لیگ کو اب خیرباد کہنا چاہیئے اور ہم کو نیشنل کانگریس کے
ساتھ مل جانا چاہیئے جس کے واسطے کانگریس مدتوں سے کوشش کرتی چلی
آرہی ہے ہم اس سے تو متفق ہیں کہ گورنمنٹ کی طرف سے ضرور ایسی کارروائی ہوئی
ہے جس سے مسلمانوں کے دِلوں کو واجبی طور پر صدمہ پہنچا ہے لیکن اس سے ہم کو
قطعی اختلاف ہے کہ قومی شیرازہ کو منتشر کر کے ہم دوسرے زبردست گروہ کے
ساتھ اسی طرح شامل ہو جائیں جس طرح کوئی دریا سمندر میں شامل ہو کر اپنی
ہستی کو معدوم کر دیتا ہے، ہماری علیحدگی کانگریس وغیرہ سے اس بنا پر نہیں
ہے کہ ہم کو گورنمنٹ کے ساتھ وفادار رہنا چاہیئے۔ وفاداری غرض ہے وہ

جو ہر نہیں ہے۔ اس کی بنیاد بھی اورکسی چیز پر قائم ہوتی ہے اور جس قدر اس بنیاد میں تزلزل ہوگا وفاداری بھی متزلزل ہوگی پس مسلمان جو من حیث القوم نیش کانگریس سے ابتک علیحدہ رہے ہیں اُس کی بنیاد یہ ہے کہ کانگریس کے بعض اہم دعادی مسلمانوں کے حق میں مضرت بخش ہیں۔ اُن کا سوراج مسلمانوں کے حق میں تباہ کُن ہے، برٹش گورنمنٹ کا سایہ ہندوستان سے اُٹھنا یا اُس کا اثر بہت زیادہ کم ہوجانا مسلمانوں کے حق میں بربادی بخش ثابت ہوگا، یعنی ایک ہی چیز جو ہمارے ابنائے وطن کے حق میں خوش سمجھی جاسکتی ہے، مسلمانوں کے حق میں (جن کا شمار اس ملک میں کم ہے) وہ سم قاتل ہے، شرقی وغربی بنگال کے الحاق کا جو نتیجہ بھی نکلے اس سے مذکورہ بالا کلیہ باطل نہیں ہوتا، اگر ہمیں ہندوستان میں رہنا ہے تو برٹش گورنمنٹ سے بگاڑ کر رہنا یہ ہمارے لئے ٹھیک نہ ہوگا، گورنمنٹ کے استحکام میں کوشش کرنا اور اس کے ساتھ شریک رہنا یہ خود ہم کو اپنے استحکام میں کوشش کرنا ہے، لہذا اس قسم کے خیالات سے ہم کو احتراز کرنا چاہیئے، یہ سچ ہے کہ بسا اوقات مایوسیاں انسان کو خودکشی پر آمادہ کر دیتی ہیں۔ اور یہ خیال کہ ہم کو کانگریس کے ساتھ شامل ہونا چاہیئے اسی قسم کی مایوسیوں کا نتیجہ ہے۔ جس کی خاص ذمہ دار موجودہ گورنمنٹ ہے لیکن خودکشی کی صلاح کسی وقت میں بھی نہیں دی جاسکتی، لامحالہ ہم کو سوچنا پڑتا ہے کہ ہم کو کیا طریقہ اختیار کرنا چاہیئے۔

یہ آفتاب نصف النہار کی طرح اب روشن ہے کہ ان واقعات کو دیکھنے کے بعد جو اس وقت مشاہدہ میں آئے یہ مشورہ دینا کہ مسلمانوں کو گورنمنٹ پر بھروسہ کرنا چاہیئے لاحاصل مشورہ ہے، اب زمانہ اس قسم کے بھروسوں کا

نہیں رہا خدا کے فضل و کرم کے بعد جس پر بھروسہ کرنا چاہیئے وہ ہماری اپنی قوتِ بازو ہے اور اِس کی نظیر جو ہمارے قابلِ احترام ابنائے وطن نے پیش کی ہے ہمارے سامنے موجود ہے۔

خاتمہ مضمون پر مسلمانانِ مشرقی بنگالہ کو اپنے صوبہ میں ایجوکیشنل کانفرنس کی اور لیگ کی شاخوں کے قایم کرنے اور اپنے حقوق کی طلب و تحفظ، عام اور اعلیٰ تعلیم کی ترقی اور گورنمنٹ کے سامنے ان تدابیر کے پیش کرنے کا مشورہ دیا جس کے ذریعہ سے وہ اپنی ترقی پذیر حالت اور اپنے حقوق کو محفوظ رکھ سکتے ہیں۔

مضمون پر اعتراضات

اس مضمون کی اشاعت نے مسلمانوں کے سامنے اپنے مستقبل کے تحفظ کا ایک اہم سوال پیش کر دیا مگر کانگریسی پریس نے گورنمنٹ کو دھمکی سے تعبیر کیا اور ہندو مسلم سوال کے نقطہ نظر سے دیکھا اور اینگلو انڈین پریس نے مسلمانوں کی قدیم پالسی سے انحراف تصور کیا۔

پانیر نے جو اس زمانہ کے اخبارات میں نہایت مقتدر تھا چھتے دن اس کا خلاصہ شائع کر کے ایک نوٹ لکھا اور اُس میں وہ خیالات منسوب کئے جن کا اصل مضمون میں شائبہ نہ تھا اور اس بات پر افسوس ظاہر کیا کہ ایم اے او کالج کا سکرٹری ان فقرات کی اشاعت کے لئے ایک ایسے اخبار کو انتخاب کرے جو طالبعلموں کا ہے۔

جب اس قسم کے مضامین شایع ہوئے تو نواب صاحب نے اپنے مضمون کی وضاحت اور غلط فہمی رفع کرنے کے لئے ایک اور مضمون لکھ کر پانیر کو بھیجا لیکن اُس نے عرصہ کے بعد وہ توڑ مروڑ کر شایع کیا۔

یہاں یہ امر بھی مدنظر رہنا چاہیئے کہ پانیر کا دفتر نواب صاحب کے خلاف حیدرآبادی سازشوں کا ایک بڑا مرکز رہ چکا تھا اور مسٹر آرچبولڈ کے قبضئے کے بعد اس کا صاف اور کھلا ہوا اور مخالفانہ رویہ تھا۔ اور بقول "کامریڈ"[1] کے کہ "پانیر" علی گڑھ یورپین تفوق کے حمایتی

---

[1] مولانا محمد علی مرحوم کا مشہور ہفتہ وار انگریزی اخبار جو پہلے کلکتہ سے اور پھر دہلی سے شایع ہوتا تھا۔

ہونے کی حیثیت سے نواب وقارالملک پر انتقام کی کسر نکالنے میں اس حد تک تجاوز کرجاتا ہے کہ نواب صاحب ممدوح کے جوابات کو بھی جو اس کی نکتہ چینی معاملات علی گڈھ کے متعلق ہوتے ہیں توڑ مروڑ کر ہفتوں کے بعد شایع کرتا ہے۔

جواب اعتراضات نواب صاحب نے اردو میں بھی ایک مضمون لکھا جس میں کانگریسی اخبارات کے منسوبہ خیالات کی تردید کی اور بتایا کہ مسلمان سلطنت کے وفادار ہیں اور دھمکی دینا ان کا شیوہ نہیں اور یہ کہ :-

ہماری تمام تر قوت بازو جس سے ہم ہندوستان میں آئندہ عزت اور کامیابی کے ساتھ زندگی بسر کرسکتے ہیں سب کچھ اس میں مضمر ہے کہ ہم اپنی تعلیم کو اعلیٰ معیار پر پہنچاویں صنعت و حرفت میں ترقی کریں تجارت و زراعت کو اپنی قوم میں ترقی دیں ....

پھر ان وسائل و ذرائع پر روشنی ڈال کر جو مسلمانوں کے ہاتھوں میں ہیں اور پارسیوں کی قلیل التعداد قوم کی حالت کی طرف اشارہ کرکے لکھا کہ :-

ہندوستان کے مسلمان اب بھی خواب غفلت سے ہوشیار ہوں تو کچھ زیادہ زمانہ نہ گذرے گا کہ باوجود اپنی مردم شماری کی کمی کے دُنیا کی ممتاز قوم شمار ہونے لگیں گے اور گورنمنٹ بھی (جس کو آج یہ جرأت ہوئی کہ مسلمانوں کو کافی اطمینان دلائے بغیر اُس نے ایک زبردست گروہ رعایا کو خوش رکھنا کافی سمجھا) آئندہ کسی کارروائی کے وقت لازمی طور پر ہمارے حقوق اور ہماری فیلنگوں کا بھی کافی خیال رکھنے پر مجبور ہوگی اس وقت گورنمنٹ نے جو پالسی اختیار کی ممکن ہے کہ مسلمانوں کو غفلت سے ہوشیار کرنے کی غرض سے ایک تازیانہ کا کام دے۔ لعل اللہ یحدث بعد ذالک امرا۔

اس وقت جو اہم تبدیلیاں گورنمنٹ نے کی ہیں اُن کے ساتھ جو تجویزیں مسلمانوں کے حقوق کی حفاظت کی غرض سے بیان کی گئیں وہ ان حقوق کی حفاظت کے واسطے کافی نہیں تھیں اور اس کی وجہ زیادہ تر یہ ہے کہ اُن تجویزوں کے متعلق گورنمنٹ نے مشرقی بنگال کے مسلمان لیڈروں سے کوئی مشورہ کرنا ضروری نہیں سمجھا اور دوسری شکایت مسلمانوں کو یہ بھی بجا طور پر ہو سکتی ہے کہ وزرائے سلطنت کو چاہیئے کہ حضرت شہنشاہ معظم کو یہ بھی مشورہ دیتے کہ ایک بڑی قوم کی ضد اور ہٹ پوری کرتے وقت کم از کم اشک شوئی کے طور پر جن کے منھ سے نوالہ چھینا جا رہا تھا اُنکے حقوق کی حفاظت کی غرض سے زبان مبارک سے ارشاد فرماتے جاتے مگر خیر، برگذشتہ صلوٰۃ۔ جو کچھ ہونا تھا وہ ہوا لیکن اب گورنمنٹ کو ایک منٹ بھی ضائع نہ کرنا چاہیئے کہ مسلمانان صوبہ مشرقی کے سرگروہوں سے مشورہ کر کے جو کچھ تجویزیں مسلمانوں کے مفید مطلب گورنمنٹ کے نزدیک واجبی ہوں ان کا تمام وکمال اعلان عین اس وقت میں کر دیا جائے جب کہ حضور شہنشاہ معظم ہندوستان میں تشریف رکھتے ہیں۔

پھر اُنھوں نے ایک اخبار کے ایسے ریمارکوں پر جن سے دونوں قوموں کے احساسات پر اثر پڑتا ہے ہندو مسلم کے سوال کے متعلق لکھا کہ :-

دونوں کو سمجھ لینا چاہیئے کہ ہم کو ایک ہی مُلک میں رہنا ہے۔ لہٰذا بطور راحت رساں ہمسایہ کے رہنا چاہیئے نہ بطور ایک مضرت رساں ہمسایہ کے۔

اس کے بعد اُنھوں نے اس اتحاد کے متعلق لیگ کے اُن اساسی اصول کو بیان کر کے جو اس کے قیام کے وقت اُنھوں نے پیش کئے تھے لکھا کہ :-

میں اب بھی کہتا ہوں کہ آیندہ ہندوستان کا فائدہ صرف اسی میں ہے کہ یہ دونوں قومیں متذکرہ بالا اُصول کے ساتھ شیر وشکر کی طرح بسر کریں اور یہ کچھ ناممکن نہیں ہے ہم کو بطور اصول یہ مان لینا چاہیئے کہ ہمارے دوسرے ہمسایہ جو اپنے حقوق کی حفاظت کی سعی کرتے ہیں ان کو کرنے دو ہر ایک کو اپنے حقوق کی حفاظت خود کرنی چاہیئے جس کا ہر ایک کو حق ہے اپنے حق کی حفاظت بطور اپنے حق کے کرنی چاہیئے نہ دوسروں کو مضرت پہنچانے کی غرض سے اور جو امور ہمارے باہم متنازعہ رہیں اُن کے فیصلے کے واسطے ایک زبردست قوت ہمارے اوپر موجود ہے۔

ایک پرائیوٹ خط کا اقتباس

نواب صاحب پران واقعات کا جو اثر تھا اس کا اندازہ ذیل کے فقرات سے ہوگا جو اُنھوں نے مولوی فضل الرحمٰن صاحب ایڈوکیٹ کانپور کو ایک خط میں لکھے تھے کہ:۔

کم از کم مسلمانوں کا یہ کام تو ضرور ہے کہ ایک مضبوط کوشش کر کے تبلادیں کہ گورنمنٹ کی طرف سے مسلمانوں کے ساتھ یہ بے اعتنائی مسلمانوں میں بہت مایوسانہ خیالات سے دیکھی گئی ہے کہ دونوں بنگالہ کے الحاق کے ساتھ گورنمنٹ نے مطلق بھی اسکی ضرورت نہ سمجھی کہ ساتھ ہی ساتھ مسلمانوں کو اطمینان دلایا جاتا کہ ان کی ترقی پزیر حالت اور حقوق کی حفاظت فلاں فلاں ذریعہ سے کی جائے گورنمنٹ کی یہ پالیسی بمنزلہ ایک توپ خانہ تھی جو مسلمانوں کی مُردہ لاشوں پر سے گزر گیا۔ بدون اس احساس کے کہ ان غریب لاشوں سے کسی میں کچھ جان باقی ہے اور ان کو اس سے کوئی تکلیف محسوس ہوگی اِنّا لِلّٰہِ وَاِنّا اِلَیہِ رَاجِعُوْنَ ط کس کا مرا کو اور کس کی ٹر یپولی اور کہاں کا ایران یہاں سرے سے اسلام ہی کا قلع قمع ہوا جاتا ہے۔ ولعل اللہ یحدث بعد ذالک امرا

مسلمانانِ بنگال کو مشورہ

اس تنسیخ سے مسلمانانِ بنگال میں جو اضطراب پیدا ہوا اس کے رفع کرنے کے لئے سنٹرل محمڈن ایسوسی ایشن بنگال نے چند تجاویز گورنمنٹ میں پیش کرنے کے لئے پاس کیں اس سلسلے میں نواب صاحب نے دو باتوں سے اختلاف کیا اور باقی کی تائید کی ان دو باتوں کے متعلق انھوں نے لکھا کہ:-

جن دو باتوں سے ہم کو اختلاف ہے اُن میں سے اول تو یہ ہے کہ لوکل اور ڈسٹرکٹ بورڈوں میں جو ہر ایک قوم کے ممبروں کی تعداد اس قوم کی مردم شماری کی مناسبت سے چاہی گئی ہے یہ ٹھیک نہیں ہے جب دوسرے تمام حصص ملک میں مسلمانوں نے صرف اس بات کی خواہش کی ہے کہ باوجود ان کی کمی مردم شماری کے ان کے ممبروں کی تعداد ان بورڈوں میں نصف سے کم نہ ہو تو یہ مطلب نہیں ہو کہ مشرقی بنگالہ کے مسلمان اپنی کثرت آبادی کے لحاظ سے نصف سے زیادہ اپنے ممبروں کو چاہیں۔ لہذا ان کو بھی اپنے ممبروں کی نسبت یہی خواہش کرنی چاہیئے کہ اُن کی تعداد نصف سے کم نہ رہے۔

دوسرے یہ کہ گورنر بنگالہ کی کونسل میں جو یہ خواہش کی گئی کہ مثلاً ایک ہندو اور ایک مسلمان کی جگہ نہ نکل سکے تو مجبوراً باری باری کبھی مسلمان اور کبھی ہندو مقرر کیا جائے، اس سے بھی ہم کو اختلاف ہے، اس باری کے انتظام سے وہ اطمینان حاصل نہ ہوگا جس ضرورت سے افراد رعایا کونسل میں لئے جاویں گے جس وقت صرف مسلمان ممبر کونسل میں ہوگا ہندو مطمئن نہ ہونگے اور جس وقت ہندو ممبر ہوگا مسلمانوں کا اطمینان نہ ہوگا۔ گو ہماری دلی امید یہی ہے کہ کونسل میں ایسے مسلمان اور ایسے ہندو ممبر مقرر ہونگے جو دونوں قوموں کے حقوق کی واجبی طور پر حفاظت کریں گے۔ مگر بایں ہمہ آخر جو مقصد دونوں قوموں کے ممبروں کے تقرر سے ہے وہ صرف اسی صورت میں حاصل ہو سکے گا جبکہ دونوں قوموں کے ممبر

گورنر کی اگزیکیٹو کونسل میں شامل رہیں گے اور کوئی وجہ نہیں کہ ایسا کیوں نہ ہو۔
رعایا کے اطمینان کا مسئلہ نمبر اول کا مسئلہ ہے اور تھوڑے سے خرچ کا مسئلہ (جس
سے کام میں بہت مدد ملے گی) درجہ دوم کا مسئلہ ہے اسی کے ساتھ اس وضاحت
کی بھی ضرورت ہے اگر مسلمانان صوبہ میں کسی وقت کافی قابلیت کے اشخاص
نہ مل سکیں تو دوسرے صوبہ سے لائق تر مسلمان منتخب ہو سکے لیکن ہر وقت
کم از کم ایک ہندو اور ایک مسلمان ممبر کا وجود کونسل میں لازمی سمجھا جانا چاہیئے۔
سنٹرل محمڈن ایسوسی ایشن کی اس رائے سے بھی تمام ہندوستان کی مسلمان
متفق ہوں گے کہ جو انتظام بھی اس وقت گورنمنٹ بنگالہ مسلمانوں کے حقوق
کی حفاظت کی غرض سے کرے وہ ایسا مستحکم انتظام ہو کہ کم از کم جب تک شرقی
و غربی بنگالہ کا الحاق قائم ہے وہ انتظام بھی قائم رہے اور ہر ایک ایجی ٹیشن
کے اثر سے محفوظ رہے۔ ہم پہلے لکھ چکے ہیں اور اب پھر لکھتے ہیں کہ یہ انتظامی
غلطی تھی کہ مسلمانوں کے حقوق کو خطرہ میں ڈالنے والے انتظام کا ذکر تو ذمہ دار
افسروں نے حضور شہنشاہِ معظم کی زبان فیض ترجمان سے کر دیا مگر جن تدابیر سے
مسلمانوں کے حقوق کی حفاظت اور ان کی ایک طرح کی اشک شوئی ہوتی ان کو
شہنشاہ معظم سے بالکل بے تعلق رکھا۔ حالانکہ حضور ممدوح جیسے ایک گروہ کے شہنشاہ
ہیں ویسے دوسرے گروہ کے بھی ہیں اور حضور ممدوح الشان سے اپنے دونوں فرق
رعایا کی دلجوئی یکساں متعلق ہے۔ لہذا اب جن الفاظ میں سنٹرل ایسوسی ایشن اپنا مزید
اطمینان چاہتی ہے ان کا مطلب یہی ہے کہ جو انتظام بھی کیا جائے اس کی منظوری
بطور ایک جزو انتظامِ جدید کے شہنشاہ معظم کی پیش گاہ سے ہو جانی چاہیئے کیونکہ
ہندوستان ایک شہنشاہ پرست ملک ہے اور گورنمنٹ نے دیکھ لیا ہے کہ باوجودیکہ
مسلمانانِ شرقی بنگالہ کو جدید انتظام سے صریح نقصان پہنچا تھا چونکہ وہ انتظام

شہنشاہ معظم کی زبان درفشاں سے ارشاد ہوا تھا لہذا مسلمانوں نے اس کے خلاف کسی ایجی ٹیشن کو جائز نہیں رکھا اور اس کو سوئے ادب سمجھا۔

واقعات طرابلس و ایران پر مضامین

تنسیخ بنگال سے جو بے چینی پیدا ہوئی اور اس کے جو مضر نتائج تھے اُن کا تعلق ہندوستانی مسلمانوں سے تھا لیکن ہندوستان کے علاوہ گذشتہ دو تین سال سے اسلامی ممالک جن مصائب میں مبتلا تھے ان سے بھی ہر ایک مسلمان مضطرب و بے چین تھا اسی حالت میں لنڈن ٹائمس کے حوالہ سے یہ خبر شائع ہوئی کہ :۔

اگر ترکوں نے اب بھی اٹلی سے صلح نہ کی تو اٹلی کے ہوائی جہاز خانہ کعبہ اور روضۂ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر گولہ برسا کر ان کو منہدم کر دیں گے اس سے قبل اٹلی نے دیگر سلطنتوں کو اطلاع دی ہے کہ ایام حج کے بعد وہ جدہ و ینبوع کے بندرگاہوں کا محاصرہ کریں گے اور ان کو آنے جانے والوں پر بند کر دیں گے۔

اس خبر نے مسلمانوں کے دلوں پر بجلی کا سا اثر کیا اخبارات میں متعدد مضامین نکلے جن میں غم و غصہ کا اظہار تھا اور انھوں نے متعدد مقامات پر جلسے کر کے حکومت کو توجہ دلائی کہ اٹلی کو اس ارادہ سے باز رکھے۔

نواب وقار الملک نے اس موقع پر ایک مختصر مضمون شائع کیا جس میں اس خبر وغیرہ کا تذکرہ کر کے لکھا کہ :۔

ہمارے نزدیک کوئی ضرورت نہیں ہے کہ گورنمنٹ کو اس قسم کے معاملات میں تکلیف دی جائے۔ گورنمنٹ کی پالسی کسی مصلحت یا مجبوری سے اٹلی کو اس قسم کا مشورہ دینے کی نہیں ہے تو نہ سہی۔ یہ لڑائیاں زیادہ عرصہ تک جاری نہیں رہتیں۔ زیادہ سے زیادہ اگر اس جنگ کو طول ہوا تو ایک سال یا انتہا دو تین سال۔ اتنے عرصہ تک مسلمانوں کو صبر و استقلال سے اپنی تکالیف برداشت

کرنی چاہیئیں اور اٹلی سے اس قسم کی غلطیاں جتنی زیادہ سرزد ہوں ان کو ہونے دینا چاہیئے۔

ترکوں اور عربوں کے ساتھ ہماری ہمدردی اگر ہے تو اسلامی اخوت ہونے کے علاوہ زیادہ تر اسی بُنیاد پر ہے کہ وہ حرمین شریفین کے محافظ ہیں لیکن جب خود اُن مقاماتِ متبرکہ کے ساتھ اس قسم کی بے ادبی کی جائے تو ظاہر ہے کہ تمام دُنیا کے مسلمان اٹلی کے اور اٹلی کے طرفداروں کے سخت دشمن ہو جائیں گے جس کا خمیازہ اٹلی والوں کو خاتمہ جنگ کے بعد بھی عمروں تک برداشت کرنا پڑے گا۔ اٹلی نے سواحل طرابلس پر چند ناکردہ گناہ عربوں اور عورتوں اور بچوں پر ظلم کر کے جو غصہ طرابلس کے عربوں اور ترکوں میں نمودار کیا ہے اسی کا نتیجہ ہے کہ ترک اور عرب دونوں مثل ایک جسم و جان کے اٹلی کو ناک چنے چبوا رہے ہیں۔ آئندہ اگر اس قسم کی کارروائیاں اٹلی سے ہوئیں تو وہی خدا جس نے اصحاب فیل کو برباد کیا تھا اب بھی زندہ ہے اور آئندہ ہوائی جہاز والوں کو بھی ویسی ہی آسانی سے تباہ کر سکتا ہے۔ ساتھ ہی اب یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ اٹلی کے بڑے سے بڑے طرفدار بھی اس بات کے قائل ہو چکے ہیں کہ اٹلی کی فوجی طاقت (مع اُس کے جہازوں کے) اس قابل نہیں ہے کہ ترکوں اور عربوں کے مقابلہ پر کچھ بھی غلبہ حاصل کر سکے۔ سوائے اس کے کہ ایک عمارت پر گولہ باری کریں یا دوسری عمارت پر۔ ہم کو یاد ہے کہ جس زمانہ میں ترکوں اور آرمینیوں کا جھگڑا ہو رہا تھا اور ترک اپنے آرمنی باغیوں کو پوری طرح سزا دے رہے تھے انگلستان میں ایک عام جوش اس بات کا پیدا ہوا تھا کہ انگلستان کو ترکوں کے مقابلہ پر اعلان جنگ کرنا چاہیئے اُس وقت لارڈ سالسبری نے پارلیمنٹ میں بیان کیا تھا کہ اس اعلان جنگ کا نتیجہ اس کے سوا کچھ نہ ہوگا کہ ہم ترکوں کے چند پرمٹ

گھروں پر قبضہ کریں۔ ہمارے جہاز ترکوں کے پہاڑوں پر نہیں چڑھ سکتے جن کی حفاظت ترک جیسے بہادر سپاہی کر رہے ہوں بجنسہ وہی کیفیت اس وقت اٹلی کی ترکوں اور عربوں کے مقابلہ پر ہو رہی ہے۔ رہا خانہ کعبہ اور روضہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا منہدم کرنا۔ اس سے سوائے اس کے کہ مسلمانوں کا غصہ بھڑکے اور کوئی نقصان نہ مسلمانوں کا ہوگا نہ اسلام کا اور مسلمان منہدمہ عمارتوں کی جگہ پہلے سے بہتر عمارتیں تیار کریں گے اب بھی موجودہ دونوں عمارتیں کوئی قدیم یادگار عمارتیں نہیں مسلمانوں ہی نے زمانہ ہائے مابعد میں ان کو مختلف وقتوں میں تیار کیا ہے۔ تمام عیسائی دنیا کو معلوم رہنا چاہیئے کہ اس قسم کے خرافات کا کوئی اثر اسلام یا مسلمانوں کو ذرا بھی مضرت نہیں پہنچا سکتا ہے۔

اسی زمانہ میں روسی فوج ایران میں داخل ہوگئی تھی۔ برطانیہ نے بھی اپنے فوائد کی حفاظت کے لئے اپنی فوجیں اتاری تھیں اور اس طرح ان دونوں طاقتوں کے درمیان ایران کے پس جانے کا خطرہ پیدا ہوگیا۔ ایران کے علاوہ ٹرکی اور افغانستان بھی زد پر تھے نواب صاحب نے ان حالات کے متعلق بھی نہایت آزادی کے ساتھ اپنے جذبات و خیالات کو اس طرح ظاہر کیا کہ :۔

"اسی کے ساتھ جب مسلمان دیکھتے ہیں کہ مراکو فرانس کے پنجہ میں گرفتار ہوگیا اور ٹونس پہلے ہی سے مسلمانوں کے قبضہ سے نکل کر فرانس کے قبضہ میں ہے طرابلس پر اٹلی نے مصیبت ڈھا رکھی ہے۔ مصر انگریزی قبضہ میں ہے تو ایسی حالت میں ایران پر جو کارروائی اب روس و انگلستان کی طرف سے ہو رہی ہے اس کے لحاظ سے اگر مسلمان یہ خوف کرتے ہیں کہ یورپ کی سلطنتوں نے اسلامی حکومتوں کے مقابلہ کے واسطے باہم کوئی قرار داد کر لی ہے تو ان کا یہ خوف کچھ بیجا نہیں ہے

اور اس خوف کے بعد جو پریشانی مسلمانوں میں نہ ہو کم ہے .... اب یہ مسئلہ ہندوستان کے شیعہ سنی کا مسئلہ نہیں رہا۔ ہندوستان کے تمام مسلمان خواہ وہ شیعہ ہوں یا سُنی ہوں ان کو ایران کے ساتھ اب یکساں ہمدردی ہے اور ہونی چاہیئے"۔

اس کے بعد وزراء کی پالیسیوں پر بحث کر کے لکھا کہ :۔

"ہم پھر کہتے ہیں اور بتاکید کہتے ہیں کہ اس موقع پر مسلمانوں کو کامل اتحاد کے ساتھ ایران کی ہمدردی کا اظہار کرنا چاہیئے جس میں شیعہ اور سنی کا کوئی نام نہ آنے پائے"۔

پھر تمام معاملات پر بحث کی ہے اور مسلمانوں کو مشورہ دیا ہے کہ "وہ اظہار ہمدردی کا جو طریقہ اختیار کریں اس کو علی الاعلان عمل میں لائیں" اور آخر میں تحریر کیا کہ :۔

جب انسان کا دل بھرا ہوتا ہے تو بات لمبی ہو ہی جاتی ہے، اس وقت ایران کی حالت اور اس کے انجام کا جس وقت تصوّر بندھ جاتا ہے تو خدا ہی جانتا ہے کہ دل کی کیا کیفیت ہوتی ہے مگر مایوس کسی وقت نہ ہونا چاہیئے ومن بعد ما قنطوا وینشر رحمتہ کو وردِ زبان رکھنا چاہیئے مضطر کی دُعا خدا جلد قبول کرتا ہے۔ کیا عجب ہے کہ پردۂ غیب سے اب بھی کچھ ایسے اسباب مہیا ہوں جو مسلمانوں کے عام اطمینان کا باعث ہو جائیں۔

یہ مضامین اگرچہ انھوں نے آنریری سکریٹری کالج کی حیثیت سے نہیں لکھے لیکن اسی زمانہ میں انسٹی ٹیوٹ گزٹ میں شائع ہوئے اور ہندوستان کے تقریباً ہر اخبار میں نقل کئے گئے یہ پہلے مضامین تھے جن کو ایک ذمہ دار اور با اثر لیڈر نے قدیم پالسی سے متجاوز ہو کر لکھا اور کوئی شک نہیں کہ مسلمانوں کی پولیٹیکل پالسی پر اُن سے بہت گہرا اثر پڑا۔

باب شانزدہم

زمانہ آخریں

نواب صاحب کی صحت عرصہ سے خراب تھی اور کالج کی پُر مشقت خدمات نے اور بھی مضمحل کر دیا تھا سکریٹری شپ سے سبکدوش ہوتے ہی ۱۹۱۳ء میں فالج کے متواتر حملے ہوئے اس حالت میں ہندوستان اور ہندوستان سے باہر عالم اسلامی کے واقعات و مصائب سوہانِ روح تھے۔ لیکن جب تک اُن میں غور و فکر کی قوت رہی قوم کی رہنمائی کرتے رہے۔

اُن کے سامنے ہر صبح ڈاک کا اک انبار ہوتا تھا اور جب تک مجبور نہ ہوگئے اپنے قلم سے ہی جواب لکھتے تھے۔ قوم کے سربرآوردہ اصحاب بھی دور دور سے ان کی خدمت میں تبادلہ خیالات اور مشوروں کے لئے آتے تھے اور حکومت بھی ان کے اثر و اقتدار سے ایک پُرسکون فضا قائم ہونے کی خواہش مند تھی۔ چنانچہ اس آخری زمانہ میں ہز آنر سر جیمس مسٹن لفٹننٹ گورنر اور (موید الملک) سر سید علی امام لا ممبر گورنمنٹ آف انڈیا کی آمد بھی انھیں اغراض پر مشتمل تھی اس فقیر منش نواب نے ان دونوں جلیل القدر مہمانوں کا استقبال بھی اپنے اسی مکان میں کیا جو امروہہ کے ایک پیچ در پیچ کوچہ میں واقع ہے جہاں کہ دروازہ تک اکہ اور ٹانگہ کا بھی گذر نہیں، ہز آنر نے تخلیہ میں ملاقات کی اور اس زمانہ میں احرار و مستبدین جس طرح دست و گریبان تھے اور حکومت کے متعلق اظہار رائے میں جو سخت الفاظ اور خلافِ واقعہ امور کا بیان کرتے تھے اس پر دیر تک گفتگو رہی اور ہز آنر نے خواہش کی کہ نواب صاحب اس فضا کے بدلنے کیلئے اپنا اثر استعمال کریں۔

نواب صاحب نے بھی اس بات کو منظور کر لیا اور جب پریس کے لئے اُنھوں نے مضمون شروع کیا تو افسرانِ حکومت کے طرزِ کارروائی پر بھی نکتہ چینی کی مگر فالج کے شدید حملہ کے باعث وہ مضمون پورا نہ کر سکے جس کی اطلاع ہز آنر کو دیدی، اُن کی سختی سے یہ رائے تھی کہ ایسے مضامین میں افسرانِ حکومت کے طرز کارروائی کو بیان کرنے سے چشم پوشی دیانت و انصاف کے خلاف ہے چنانچہ کچھ عرصہ قبل نواب محمد اسحاق خاں صاحب نے بھی ایک ایسے مضمون پر اُن کے دستخطوں کی خواہش کی تھی لیکن انھوں نے اپنے دستخط اسی شرط کے ساتھ مشروط کئے تھے کہ اس میں حکام کی غلطیوں کو بھی صاف صاف بیان کیا جائے۔

چونکہ اب وہ جلسوں کی شرکت اور قومی اداروں کی عملی خدمت سے معذور تھے اس لئے انھوں نے ۱۹۱۲ء کے آخر میں ایم اے او کالج کی ٹرسٹی شپ سے استعفا دیدیا لیکن ٹرسٹیوں نے ۲۶ جنوری ۱۹۱۳ء کے اجلاس سالانہ میں "ان کی شاندار اور مخلصانہ خدمات" کے اعتراف میں بطور اظہار احسان مندی مدرسۃ العلوم کی "وزیٹر شپ" پیش کی یہ اعزازی عہدہ ان کو منظور کرنا پڑا اور اس طرح نفس واپسیں تک ان کا نام اپنے محبوب ادارہ سے وابستہ رہا۔

وہ اگرچہ عملی کاموں سے معذور ہو گئے تھے لیکن چونکہ مسلم پبلک وقت کے معاملات پر ان کی رائے کی منتظر رہتی تھی اس لئے کبھی کبھی اخبارات میں اپنے خیالات ظاہر کر دیا کرتے تھے۔ چنانچہ ۱۹۱۳ء میں بلقانی جنگ نے خانۂ کعبہ اور اماکن مقدسہ کی حفاظت اور ترکوں کی امداد کا ایک ایسا سوال دُنیائے اسلام کے سامنے پیش کر دیا تھا جس سے ہر جگہ مسلمانوں میں ایک زبردست بے چینی پیدا ہو گئی تھی۔ ہندوستان کے مسلمان بھی سخت بے چین تھے، مولانا شوکت علی نے اسی کے لئے "انجمن خدام کعبہ" بھی قائم کی جس کا مرکزی دفتر دہلی تھا۔

اس انجمن نے نواب صاحب سے بھی شرکت کی خواہش کی تو اُنہوں نے دو شرطوں کے ساتھ فوراً منظور کر لی اوّل یہ کہ "جو کمیٹیاں کام کرنے کے واسطے مقرر ہوں ان میں شریک ہونے سے معاف کیا جائے"۔ دُوسرے یہ کہ "خدّام کعبہ جب تک کسی سلطنت کی رعایا ہیں اُس وقت تک وہ اپنے مذہب کی مطابق اس سلطنت کے قوانین کے بموجب عمل کرنے کے پابند ہوں گے"۔ مگر اُنہوں نے بہت زیادہ زور ترکوں کی اعانت پر اس لئے دیا کہ

جب تک کوئی زبردست قوت کسی مذہب کی محافظ نہیں ہوتی اُس وقت تک اُس مذہب کی نشانیوں کی حفاظت اور اُن کی بقا و ثبات نہایت دشوار اور بسا اوقات ناممکن ہو جاتی ہے ....
اب وقت ہے کہ ہر ایک مسلمان سے جو کچھ ہو سکے دامے درمے سُخنے ترکوں کی مدد کرے جو عین اپنے مذہب کی مدد ہے یوں تو اپنے کارخانۂ قدرت کے بھیدوں کو خدا ہی خوب جانتا ہے لیکن اگر خدانخواستہ ترکوں کی حالت اور زیادہ ضعیف ہو گئی تو پھر ظاہرا دُوسری کوئی قوت ایسی قائم نہیں ہو سکتی جو مخالف حملہ آوروں کے مقابلہ میں حرمین شریفین اور دیگر مقامات متبرکہ کی ملکہ اسلام کی حفاظت کا بیڑہ اُٹھا سکے گی۔

نظارۃ المعارف القرانیہ کی سرپرستی

مولانا عبیداللہ صاحب سندھی ایک روشن خیال عالم تھے اُنہوں نے ۱۹۱۳ء میں مسلمان گریجویٹوں کی عربی تعلیم اور قرآن مجید و حدیث کی تدریس کے لئے دہلی

ف یہ مدرسہ نہایت عمدگی کے ساتھ مسجد فتحپوری میں قائم ہوا اور چند ہی دن میں طلبا کی معقول تعداد ہو گئی مولانا عبیداللہ صاحب کی تعلیم میں ایک خاص کشش تھی، ہر طرف سے امدادوں کا سلسلہ بھی جاری ہو گیا لیکن جنگ عظیم کے آغاز میں مولانا (بقیہ نوٹ صفحہ آئندہ)

میں "نظارہ المعارف القرآنیہ" کے نام سے ایک مدرسہ قائم کیا اور اس میں ایک شعبہ علما کو انگریزی کی ضروری تعلیم کا بھی رکھا، مولانا نے نواب صاحب سے اُس کی سرپرستی کی خواہش کی جس سے وہ انکار نہ کرسکے اور جب اس کو قبول کرلیا تو باوجود معذوریوں کے اس کے لئے چندہ کی کوششیں کیں علاوہ پرائیویٹ کوششوں کے اخبارات میں بھی ایک پرزور اپیل شائع کی جس میں ایک موقع پر لکھا کہ:-

جس وقت قوم میں اس قسم کے تعلیم یافتہ موجود ہوگئے جن کو پیدا کرنے کی کوشش کی جارہی ہے تب دنیا دیکھ لے گی کہ جس چیز کی مدتوں سے تمنا کی جارہی ہے وہ بات حاصل ہوگئی ہے۔ بڑی خوبی اس کوشش میں یہ ہے کہ جو پودے لگائے جارہے ہیں (خدا مولانا صاحب مدظلہ العالی کی اسکیم کو کامیاب کرے) وہ پودے بہت جلد بارآور ہوں گے۔ اور پھر جس طرح ایک تخم سے بہت سے تخم پیدا ہوجاتے ہیں اور ایک چراغ سے بہت سے چراغ روشن ہوجاتے ہیں اسی طرح زیادہ زمانہ نہ گزرے گا کہ جو تمام اقطاعِ ملک میں ان شیریں پھلوں کے باغ موجود ہوجائیں گے اور ہندوستان دیکھ لے گا کہ اسلامی اخلاق جس کے اب تک بہت شاذ نمونے کہیں ملتے ہیں یا جن کا ذکر کتابوں میں ہے وہ ہر جگہ برائے العین مشاہدہ میں آئیں گے جن کو ہمارے ہمسایہ ہندو بھائی اور دیگر اقوام اپنی راحت و آسائش کے لحاظ سے بہت مغتنم سمجھیں گے گورنمنٹ جن پر بہت زیادہ بھروسہ کرسکے گی بمقابلہ اُس بھروسہ کے جو اب تک بھی وہ بیجا طور پر ہماری نسبت کرتی رہی ہے سوسائٹی کے لئے وہ ایک آیہ رحمت ہونگے۔

(بقیہ نوٹ صفحہ ۳۵۳) حکومت کی نظر میں مشتبہ ہوگئے اور وہ ہندوستان سے ہجرت کرگئے اُن کے بعد مدرسہ جاری نہ رہ سکا۔

بہتر باپ بہتر بیٹے، بہتر بھائی، بہتر شوہر، اور پورے کفایت شعار فضولیات سے مجتنب۔

اس کے بعد چندوں کے عام عذر کی نسبت تحریر کیا کہ :۔

ہم کو ان چندوں کے ادا کرنے کے وقت یہ خیال بھی رکھنا ضرور ہے کہ اللہ تعالیٰ جو ہم سب کو رزق بخشتا ہے اُس کی عادت کیا ہے وہ ہر سال ہمارے لئے بارانِ رحمت بھیجتا ہے فصلیں پیدا کرتا ہے جو ہماری زندگانی کا موجب ہیں اور اُس کی طرف سے یہ عذر کبھی نہیں ہوتا کہ ہم گذشتہ سال یہ نعمتیں تم کو دے چکے ہیں اسی طرح ہم کو کسی نیک کام میں مالی مدد دیتے وقت یہ عذر ہرگز نہ کرنا چاہئے کہ ہم گذشتہ سالوں میں اس قسم کی مدد کر چکے ہیں۔

ترکی تمسکات کی فروخت میں امداد

سنہ ۱۹۱۲ء میں ترکوں کی امداد کے خیال سے ترکی گورنمنٹ کے تمسکات کی خریداری کی تحریک بھی زور شور سے جاری تھی اور مختلف مقامات میں با اثر اصحاب کوشاں تھے کہ مسلمانان ہند زیادہ سے زیادہ تعداد اور مقداریں خریدیں اس سلسلہ میں بعض اطراف سے یہ رائے پیش ہوئی کہ مسلم یونیورسٹی فنڈ سے بھی یہ تمسکات لئے جائیں لیکن نواب صاحب نے آخر نومبر میں یہ رائے دی کہ :۔

جو جوش ترکی امداد کا جائز طور پر اس وقت قوم میں پیدا ہو گیا ہے اور جس سے بہت بڑی مدد ملنے کی توقع ہے اس کو اسی حالت میں جاری رہنے دیا جائے یونیورسٹی فنڈ کو اس کام لگانے کی ضرورت نہیں ہے نہ وہ مقتضائے مصلحت ہے

مگر چند ماہ کے بعد جب سفیر ٹرکی نے ایک جلسہ میں اس امر کا اطمینان دلایا کہ مسلم یونیورسٹی فنڈ کے تمسکات کا روپیہ ایک سال کی مدت میں ادا کر دیا جائے گا تو نواب صاحب کی رائے

میں تبدیلی پیدا ہوئی اور انہوں نے خریداری کے لئے یہ مشروط مشورہ دیا کہ

(۱) گورنمنٹ سے اس امر کا اطمینان کر لینے کے بعد کہ خریدی تمسکات کی صورت میں اس گفتگو کی ترقی میں تو کوئی مزاحمت نہ ہوگی جو یونیورسٹی کانسٹی ٹیوشن کے متعلق زیر غور ہے۔ (۲) ایک رقم کالج کی اس ترقی کے لئے محفوظ رکھی جائے جو یونیورسٹی کے درجہ تک پہنچانے کے لئے عمل میں لائی جا رہی ہے۔ (۳) فونڈیشن کمیٹی سے منظوری لی جائے۔

اس مشورہ کے دو ہفتہ بعد پھر عام مسلمانوں کو چندہ ہلال احمر اور ترکی قرضہ کے متعلق ایک مضمون کے ذریعہ سے توجہ دلائی اور غربا کی ہمدردیوں کا اعتراف کر کے امرا اور متوسط الحال طبقہ کی کم توجہی پر افسوس کرتے ہوئے لکھا کہ :۔

اور اگر ترکی قوت کمزور ہوگئی اور اس قابل نہ رہی کہ اپنے اماکن متبرکہ مکہ معظمہ و مدینہ منورہ زادہم اللہ شرفاً و تعظیماً اور اسی طرح دیگر اماکن مقدسہ کی حفاظت نہ کر سکے تو مسلمانوں کو وہ دن دیکھنے کے لئے تیار رہنا چاہئے جب کہ بلاد عرب و شام پر کسی نہ کسی یورپین سلطنت کا جھنڈا لہراتا ہوگا جس کو کوئی مسلمان بھی بغیر سخت اندوہ اور رنج و ملال کے برداشت نہیں کر سکتا۔ لیکن با ایں ہمہ یہ ایک واقعہ ہے کہ اعلیٰ اور اوسط درجہ کے طبقہ کے مسلمانوں سے جو مالی مدد اس موقع پر ملنی چاہئے وہ نہیں ملتی تو آخر اس کا کوئی سبب ہونا چاہئے۔ اعلیٰ طبقہ کی نسبت جن میں ہمارے بڑے بڑے صاحب خزانہ امراء و تعلقہ داران اور مسلمان والیان ملک شامل ہیں میرا کچھ عرض کرنا چھوٹا منہ اور بڑی بات ہے لہذا جو کچھ میں اب بیان کروں گا وہ متوسط الحال مسلمانوں کی نسبت ہے۔

پھر انہوں نے متوسط الحال اصحاب سے مدد نہ ملنے کے اسباب پر روشنی ڈال کر ان طریقوں

کو بیان کیا جن سے کامیابی متوقع تھی اس سلسلہ میں خریداری تمسکات و ایسی قرضہ اور منافع وغیرہ کے متعلق یہ رائے دی کہ :۔

لہٰذا ضرورت ہے (اور اشد ضرورت ہے) کہ ترکی کے قرضہ کے واسطے بڑی بڑی رقمیں حاصل کی جائیں۔ لیکن جب لوگوں کے پاس روپیہ نہیں تو بڑی رقمیں حاصل کیوں کر کی جائیں ؟ اس کے واسطے میرے نزدیک اس کے سوا کوئی چارہ نہیں ہے کہ متوسط الحال مسلمان اپنی اس قدر جائداد جس کی علحدگی سے ان کے روزمرہ کے مصارف میں کوئی تکلیف دہ اثر مترتب نہ ہوتا ہو اس کو خدا کا نام لے کر فروخت کر دیں اور اس سے ترکی قرضہ کے تمسکات خرید کر لیں۔

بات رہ جاتی ہے اور وقت نکل جاتا ہے

ترکوں کی (یا یوں کہنا چاہیئے کہ اسلام کی، قسمت میں جو کچھ لکھا ہے وہ ضرور ظہور میں آنے والا ہے، لیکن اگر خدانخواستہ نتیجہ بربادی بخش نکلا (جس کے آثار موجود ہیں) اور اس کے ساتھ یہ معلوم ہوا کہ بربادی اور تباہی کی بڑی وجہ ترکوں کے پاس روپیہ کا موجود نہ ہونا تھا، تو جب تک ہم لوگ زندہ ہیں اُس وقت تک یہ کلنک کا ٹیکا ہمیشہ ہماری پیشانیوں پر لگا رہے گا اور تاریخ ہمیشہ ہماری آیندہ آنے والی نسلوں کو اس بات پر شرمندہ کرتی رہے گی کہ ہم نے اسلام کو ایسی شدید مصیبت میں مبتلا دیکھا اور ہم سے اتنا بھی نہ ہو سکا کہ جن جواں مردوں نے ہر قسم کی سختیاں اپنے اوپر برداشت کیں اور اپنے مال اور اپنی جان تک کی پروا نہ کی جن کی بیبیوں اور جن کے بچوں تک نے ایثار کا کوئی دقیقہ اُٹھا نہیں رکھا جن کی عصمت دری تک نوبت پہنچ گئی اُن کے حق میں ہم جو بڑے فخر کے ساتھ اپنے آپ کو مسلمان

کیتے اور مسلمان سمجھتے ہیں ان کی مالی مدد بھی نہ کر سکے اور ایک دن ہم کو خدا کے سامنے بھی جانا ہے اس دن ہم اس غفلت کا کیا جواب دیں گے۔ ہرگز اب تاخیر کا وقت نہیں ہے جو کچھ ہم کو کرنا ہے آج کرنا چاہئے معلوم نہیں کل کو زندہ بھی رہیں گے یا نہیں۔

ممکن ہے کہ کچھ لوگ سوال کریں کہ قرضہ کی واپسی اور اُس کے منافع کے وصول کا کیا اطمینان ہے اس کی نسبت میں یہ عرض کرنے کی معافی چاہتا ہوں کہ بہت سے ایسے کام ہیں جن میں انسان روپیہ لگاتا ہے اور اُس میں آخرالامر نقصان ہوتا ہے۔ بہت سے مال و دولت گھر میں رکھے رکھے برباد ہو جاتے ہیں۔ بہت سے لوگ اپنی اولاد کے ہاتھ میں بہت کچھ مال و دولت چھوڑ جاتے ہیں جو تھوڑے ہی عرصہ میں اس کو بہت بے جا طریقہ سے صرف کر دیتے ہیں تو ایک ایسے کام میں روپیہ لگانے سے کیوں دریغ کیا جائے جس کا نفع یقینی ہے اگر خدانخواستہ یہ قرضہ کی رقوم بھی وصول نہ ہوں تو اس کا اجر جو خدا سے ملنے والا ہے وہ تو کہیں جانے والا نہیں، اور جو کچھ خداوند تعالیٰ جل شانہ نے اس قسم کے قرضہ کی نسبت ارشاد فرمایا ہے اُس سے زیادہ کوئی انسان اور کیا اطمینان دلا سکتا ہے خدا نے اس قسم کے قرضہ کو ایسا قرضہ دیا ہے جو خود خداوند تعالیٰ کو دیا جاتا ہے اور وہ ہی اس کا صلہ دینے کا کفیل ہے جس سے بڑھ کر ایک مسلمان کے لئے کوئی دوسری کفالت قابل اطمینان نہیں ہو سکتی۔

منافع کی نسبت میں تو اس سے زیادہ کچھ نہیں کہہ سکتا کہ سب سے بڑا منافع وہ مدد ہے جو اس کی وجہ سے مصیبت زدہ ترکوں کو پہنچے گی، اور مسلمانوں کو حقیقت میں حضور ولیسرائے کا بے حد ممنون ہونا چاہئے کہ جو حضور ممدوح نے

ہم لوگوں کو اس بات کا موقع دیا جس کے بدون ہم اگر چاہتے بھی تو کچھ نہ کر سکتے تھے۔ اور اس موقع کو غنیمت سمجھ کر اس سے فائدہ اٹھانا چاہیئے اور خوبی اس میں ہے کہ شروع ہی سے ارادہ کر لیا جاوے کہ ہم اس قرضہ پر کوئی منافع نہ لیں گے اور اسی کا نام قرض حسنہ ہے لیکن اگر فتووں کے لحاظ سے جو علمائے ٹرکی اور مصر نے سلطنت کے پرامیسری نوٹوں کی نسبت دئے ہیں کوئی صاحب عثمانیہ پرامیسری نوٹ مع نفع کے خرید کرنا چاہتے ہیں تو مجھے اس کی نسبت کچھ عرض کرنے کی ضرورت نہیں ہے وہ جانیں اور اُن کا خدا،،

ذاتی عمل نواب صاحب بھی طبقہ متوسط میں تھے اُنھوں نے مسلمانوں کو مشورہ دینے سے پہلے خود اسی پر عمل کیا اور دو ہزار روپیہ کی قیمتی حقیت فروخت کر کے جب روپیہ ادا کر دیا تو اُس وقت مندرجہ بالا مضمون پریس میں بھیجا۔ اس کے علاوہ بھی ہلال احمر وغیرہ میں وہ ذاتی مدد کرتے رہے اور بجنور و مراد آباد کے اضلاع میں بھی خاص طور پر اپنے اثر سے عام و خاص مسلمانوں کو متوجہ کیا۔

ایک اپیل اس کے بعد جب ڈاکٹر مختار احمد انصاری (مرحوم) جولائی ۱۹۱۳ء میں اپنے طبی مشن[۵۱] کی خدمات سے واپس آرہے تھے تو نواب صاحب نے تمسکات کی خریداری اور بعض غلط فہمیوں کو رفع کرنے کے لئے حسب ذیل اپیل شائع کیا۔

یقین ہے کہ ہندوستان کے تمام مسلمانوں نے ڈاکٹر انصاری صاحب کے مع الخیر والعافیت مراجعت فرمانے کو بہت خوشی سے سنا ہوگا جو چھ

---

۵۱ جنگ کے ترکی مجروحین کی مرہم پٹی اور تیمار داری کے لئے ۱۹۱۲ء میں ڈاکٹر انصاری کی قیادت میں ایک طبی مشن ٹرکی کو گیا تھا جس میں ایم اے او کالج کے چند طلبا بھی شریک تھے اس مشن نے اپنی ہمدردی و دلسوزی اور محنت کا جو گہرا نقش ترکوں کے دلوں پر قایم کیا وہ نہ صرف ارکان مشن کے لئے بلکہ مسلمانان ہند کے لئے تاریخی شرف اور سرمایہ افتخار ہے۔

سات روز میں انشاء اللہ بمبئی پہنچنے والے ہیں وہاں سے تمام بڑے بڑے مقامات پر بذات خود تشریف لے جا کر مسلمانوں کو ترکی تمسکات قرضہ کی خریداری کی ترغیب دیں گے درحقیقت ابھی تک بہت سے ایسے مسلمان ہیں جو یہ سُن کر کہ جنگ ختم ہو چکی ہے یہ سمجھ رہے ہیں کہ اب ترکوں کو ہندوستان سے مالی مدد بھیجنے کی ضرورت نہیں۔ اُن کا یہ خیال صرف واقعات کی لاعلمی کی وجہ سے ہے اور واقعات کی لاعلمی زیادہ تر اس پر مبنی ہے کہ عام اشخاص کو ابھی تک اخبار بینی کا مذاق پیدا نہیں ہوا۔ ڈاکٹر صاحب کا یہ دورہ تمام مصائب تکالیف و ضرورت سے پردہ اٹھا دے گا جو گذشتہ پُر افسوس جنگ اور ہولناک بربادی کی وجہ سے ترکوں اور مقدونیہ وغیرہ کے مسلمانوں کو اس وقت لاحق ہو رہے ہیں۔ نیز جس قدر تدبیریں اور کوششیں کہ اُن مصیبت زدوں کو مدد پہنچانے کی غرض سے ہندوستان میں کی جا رہی ہیں اور جن کی بابت واقعات کی ناواقفیت کی وجہ سے بعض صاحبان کو کچھ غلط فہمیاں ہو رہی ہیں اُن کی غلط فہمیوں کی اصلاح بھی اسی موقع پر ڈاکٹر صاحب موصوف کے ذریعہ سے پوری طرح ہو جائیگی انہیں مسائل میں اناطولیہ میں سے اہل اسلام کے واسطے نو آبادیاں قایم کرنے کا مسئلہ بھی ہے اُس کے متعلق بھی جو شبہات بعض صاحبوں کو پیدا ہوئے ہیں ڈاکٹر صاحب کا بیان سُننے کے بعد غالباً وہ بھی رفع ہو جائیں گے حالانکہ بعض شبہات تو اس قسم کے ہیں جو ذرا بھی غور و تامل کے بعد یوں بھی قائم نہیں رہ سکتے مثلاً جب حکام نے اُس کمیٹی کو منظور کر لیا ہے، جو نو آبادیوں کے واسطے قایم کی گئی ہے اور جس میں خود ترکی تجربہ کار افسر شریک ہیں تو اب ہم کو اس بحث میں پڑنا کہ پہلے سے جو ایک کمیٹی مہاجرین اس قسم

کی امداد کے واسطے ٹرکی میں قایم تھی اُسی کے سپرد یہ کام بھی کیوں نہ کیا گیا ہمارے منصب سے بالکل خارج ہے۔ اور جب تمام واقعات کمیٹی کے سامنے ہیں اور کمیٹی موقع پر اُن کی نسبت غور کررہی ہے تو وہ ہماری نسبت بہت اچھی طرح اس بات کا تصفیہ کرے گی کہ کن کاموں کی ضرورت ہے اور اُن میں کس قدر خرچ ہونا چاہئے یا مثلاً اس قسم کی نکتہ چینیاں کہ چندہ کا روپیہ کس کے پاس گیا اور خزانچی کون ہونا چاہیئے وغیرہ وغیرہ چلتی گاڑی میں روڑا اٹکانا ہے۔ ایک بزرگ ابھی تک اسی خیال میں ہیں کہ بجائے طبی وفد بھیجے جانے کے نقد روپیہ کا ترکوں کے پاس بھیجا جانا زیادہ مفید تھا۔ آفتاب نصف النہار پر پہنچ چکا ہے دوست اور دشمن نے اقرار کرلیا ہے کہ ڈاکٹر انصاری صاحب کے طبی وفد نے جو کامیابی حاصل کی ہے اُس سے بہتر مفید نتائج اور طرح حاصل نہیں ہو سکتے تھے اُس کے بعد بھی وفد بھیجنے یا نقد روپیہ بھیجنے کے سوالات کو جاری رکھنا یہ اسلام کی سچی خدمت نہیں ہے جس وقت یہ وفد روانہ ہو رہا تھا میرا خیال بالکل اس طرف منتقل نہیں ہوتا تھا کہ مجروحوں کے علاج معالجہ کے سوا جس میں بے شبہ ایک خاص جزو بہت زیادہ ہمدردی کا شامل ہوگا اور کوئی ایسا اہم پولیٹکل نتیجہ بھی پیدا ہوگا جس کا سلسلہ اب شروع ہوا ہے یعنی ہندوستان کے مسلمانوں اور ترکوں کے درمیان ایک اتحاد قایم ہونا اور یہ وہ نتائج ہیں کہ جس قدر خرچ وفد کی کارروائی میں ہوا اگر اُس سے دس گنا روپیہ بھی خرچ ہو جاتا تو بھی یہ نتائج جو حاصل ہوئے بہت ارزاں سمجھے جانے کے قابل تھے آج جو بیج کہ قسطنطنیہ میں ڈاکٹر انصاری صاحب اور مولوی ظفر علی خاں صاحب اور اُن صاحبوں کے دوسرے اعوان و انصار کی کوشش سے بویا گیا ہے اگر مسلمانان ہندوستان اپنی مالی امداد

سے آبیاری کرتے رہے تو وہ عنقریب ایک تناور درخت ہوگا اور ایسا شیریں پھل لائے گا کہ جو بزرگوار اس وقت وفد کی کارروائی کو فضول خرچی سے تعبیر کرتے ہیں وہ بھی غالباً اپنی رائے کو بدلنے پر مجبور ہوں گے۔

علیٰ ہٰذالقیاس قسطنطنیہ میں ایک اسلامی بنک قایم کرنے کی تجویز کی نسبت اعتراضات کا پیدا کرنا ٹھیک نہیں ہے۔ معترضین کا یہ خیال کہ ایک وقت میں چند قسم کی کوششوں کو جاری کر دینا ہر ایک کوشش کی ضعف کا موجب ہوگا اُصولاً صحیح ہے لیکن ایک وقت ایسا بھی آجاتا ہے جبکہ مستثنیات سے ہی کام لینا پڑتا ہے اور آج جو مصیبت پر ترکوں پر عاید ہو رہی ہی یہ اُسی قسم کی مصیبت ہے جس کے لئے جائز ہے بلکہ لازمی ہے کہ ساتھ ہی ساتھ چند کام شروع کئے جائیں ایک شخص بھوکا بھی ہے پیاسا بھی ہے اُس کے بدن پر کپڑے بھی نہیں ہیں وہ بیمار بھی ہے تو اب جو شخص بھی ایسے ایک مصیبت زدہ بندہ خدا کے ساتھ ہمدردی کرنا چاہے وہ قابل معافی ہوگا اگر اُس کی سب ضرورتوں کو ایک ساتھ بہم پہنچانے کی کوشش کرے اور جو صاحب اُس پر معترض ہیں اُن کو چاہئے کہ بجائے اُس کے کہ مختلف کاموں کو بند کر دینے کی رائے دیں جس کام میں اُن کو زیادہ دلچسپی ہو وہ اپنی کوشش خاص اُسی کام میں مصروف رکھیں۔ پھر اس کی بھی شکایت کی جاتی ہی کہ چندہ مانگنے میں سخت کلامی سے کام لیا گیا جس کا نتیجہ یہ ہو سکتا ہے کہ دینے والا بھی عاجز آ کر ناد ہند بن جائے اور بلاشبہہ اسی قسم کی معذرت اُن صاحبوں کی طرف سے ہو سکتی ہے جو چندہ میں تو ایک پیسہ نہ دیں اور دنیا جہاں کی اعتراضات پیدا کر کے لوگوں کو ترکوں کی مدد سے باز رکھیں اور دوسرا کوئی عذر اس قسم کی کارروائی کے واسطے وہ پیش ہی کیا کر سکتے ہیں لیکن پوری

قلعی کھل جاتی ہے جب ان اعتراضات کا پڑھنے والا معترضین کی اس مشورہ پر پہنچتا ہے کہ بجائے اس کے کہ ٹرکی سلطنت کی حفاظت میں مہاجرین کے واسطے نوآبادیاں قایم کی جائیں بہتر یہ ہے دول یورپ کے توسط سے پھر مہاجرین کو ان کے پہلے وطنوں کو لوٹانے کا انتظام کیا جائے اور پھر اُن کو انہیں سفاک و بے رحم ناخداترس ظالموں کے پنجہ میں دیدیا جائے جنہوں نے ان میں سے بہتوں کو بے گناہ قتل کیا ہے۔ اُن کو لوٹا ہے اُن کی آنکھوں کے سامنے اُن کی بیبیوں کی اور بیٹیوں کی عصمت دری کی ہے اور کوئی دقیقہ اُن کو نقصان تکلیف اور ذلت پہنچانے کا باقی نہیں چھوڑا مشفق ناصح اس موقع پر یہ لکھنا بھول گئے ہیں کہ اگر دول یورپ اُن کو اپنی طرف سے بلقان و یونان میں ایجنٹ مقرر کرکے بھیجدیں تو وہ ذمہ دار ہوں گے کہ بلقانی و یونانی ریاستوں کو ایک سر مو بھی مسلمانوں پر دوبارہ دست تعدی دراز نہ کرنے دیں گے یہ ہیں ہمارے مسلمان ناصح خدا کے واسطے کوئی بتادے کہ آیا ان نصیحتوں پر عمل کرنا مسلمانوں کی عقلمندی اور عزت غیرت اور حمیت کے شایاں ہوگا۔ ایک وقت میں یہی دلسوز ناصح ہندوستان کے مسلمانوں کو حجاز ریلوے میں چندہ دینے سے روکتے تھے۔۔ آیا ان نصیحتوں پر عمل کرنے سے مسلمان دنیا میں اپنے عزت و وقار قائم رکھ سکتے ہیں۔

گر مسلمانی ہمیں است کہ واعظ دارد ؀ وائے گر در پس امروز بود فردائے

اس سے زیادہ اور اس باب میں لکھنے کو جی نہیں چاہتا۔ سوائے اس کے کہ خدا نے ڈاکٹر انصاری صاحب کو اس وقت بہت ہی برمحل اور برموقع ہندوستان کو واپس بھیدیا ہے پس ہر ہر جگہ جہاں جہاں سے وہ گذریں اور جہاں تشریف لے جائیں اُن پر یہ ثابت کر دیا جائے کہ مسلمانوں نے اُن کی خدمات کو بہت ہی احسان مندی و شکر گذاری و اعتماد کے ساتھ دیکھا ہے اور پورے

جوش کے ساتھ اُن کا استقبال کریں اور عام جلسہ کرکے اُن کے بیانات سے مستفید ہوں لیکن اس کا بھی خیال رکھیں کہ وہ بہت سخت محنت برداشت کرکے اور ایک بڑے سفر سے واپس آرہے ہیں لہذا اُن کا وقت بہت قیمتی ہے اور جو وقت بھی اُن سے کسی کام میں صرف کرانا چاہیں وہ کام بھی بہت قیمتی ہونا چاہئے۔ "کامریڈ" اور "ہمدرد" اُن کے پروگرام کو وقتاً فوقتاً چھاپتے رہیں گے اور بالفعل جہاز سے اُترنے کے بعد پہلا قیام اُن کا بمبئی میں ہوگا جن ہمدردان قوم کو اُن کاموں سے دلچسپی ہے چاہئے کہ وہ بمبئی ہی سے اُن کو اپنی طرف کھینچنے کی کوشش اس طرح شروع کردیں کہ اُن کا وقت زیادہ صرف نہ ہو نہ زیادہ تکلیف ہو اور بہت سے مسلمانوں کو وہ نہایت مفید اور ضروری اطلاعوں سے مستفیض فرماسکیں۔

خاکسار

مشتاق حسین امروہوی

مقام دہلی۔ ۲۵ جون ۱۹۱۳ء

انہدام مسجد کانپور کا اثر بیسویں صدی کا دوسرا عشرہ مسلمانانِ عالم کے لئے ایک ایسی مصیبت کا زمانہ تھا جس میں کسی جگہ بھی ان کو اطمینان نصیب نہ تھا، انہیں مصائب کے سلسلہ میں اگست ۱۹۱۳ء میں ایک سڑک کے لئے مچھلی بازار کانپور کی مسجد کے ایک حصّہ کو منہدم کیا گیا۔ مسلمانوں نے مزاحمت کی مسٹر ٹائلر مجسٹریٹ و کلکٹر نے بندوقوں کے فیر کرائے بہت سے مسلمان زخمی ہوئے اتلاف جان بھی ہوا اور پھر اُنہیں پر مقدمات فوجداری چلائے گئے، اس خونین واقعہ نے مسلمانانِ ہند میں ایک سخت جوش و اضطراب پیدا کردیا[1]

[1] پھر جب ہز اکسلنسی لارڈ ہارڈنگ کی خاص توجہ اور ہز آنر سر جیمس مسٹن کے علی الرغم بہت کچھ تلافی ہوگئی مقدمات اُٹھائے گئے اور منہدم حصّہ کی درستی کرادی گئی تو نواب صاحب نے مولانا عبدالباری صاحب (مرحوم) اور دیگر علماء سے حاصل کرکے حکومت ہند کا شکریہ اور قوم میں سکون پیدا ہونے کے لئے ایک اور مضمون بھی شائع کیا۔

نواب صاحب پر بھی زبردست اثر تھا اُنھوں نے "کانپور کا ہنگامۂ محشر" کے عنوان سے ایک مضمون شائع کیا جس میں مجروحین و مقتولین کے پسماندوں اور عدالتی کارروائیوں میں مالی امداد کے لئے قوم سے اپیل کی قانون پیشہ اصحاب کی خدمات کا اعتراف کر کے توجہ دلائی کہ "سب سے بڑی ضرورت یہ ہے کہ ہندوستان سے لے کر انگلستان تک ہر ایک ممکن کوشش جو حدود قانون کے اندر ہو اس غرض سے کرنی چاہئے کہ مسجد کا جو حصہ منہدم کر دیا گیا ہے وہ پھر از سر نو مسجد میں شامل ہو جائے"، پھر حکام کے طرز عمل وغیرہ پر بحث کرتے ہوئے عدالتی کارروائی کو نہایت استقلال سے جاری رکھنے اور بشرط ضرورت انگلستان کو ایک "ڈپوٹیشن" بھیجنے کی ضرورت پر زور دیا اسی سلسلہ میں اُنھوں نے یہ تنبیہ بھی کی کہ :-

> بدمزاج سے بدمزاج حاکم بھی زیادہ عرصہ تک اپنی بدمزاجی پر قایم نہیں رہ سکتا اگر رعایا اپنی آزادی کی حفاظت اعتدال و استقلال کے ساتھ کرتی رہے - اب جو معاملات کانپور کے متعلق مسلمانانِ صوبہ متحدہ کے سامنے ہیں یہ ایک ایسا موقع ہے کہ اگر ہم نے اس کو بغیر کافی توجہ کے ہاتھ سے جانے دیا تو ایک "ٹائلر" نہیں آیندہ ہم کو توقع رکھنی چاہئے کہ ہر ایک سب انسپکٹر ہمارے لئے "ٹائلر" ثابت ہو گا اور اب ہمارے ہاتھ میں ہے کہ اپنی آزادی و عزت کو برقرار[1] رکھیں یا پیروں کے تلے پامال ہونے دیں"



اجودھیا میں قربانی گاؤ سے اجتناب کے متعلق ایک خط

نواب صاحب قومی حقوق اور بعض سیاسی مسائل میں ہندوؤں سے متفق نہ تھے لیکن دل سے ہندو مسلم اتحاد کے حامی تھے اور معاشری تعلقات میں وہ اس اتحاد کو نہایت ضروری

---

[1] مولانا شبلی مرحوم کی وہ نظمیں بھی جو اُس زمانہ میں شائع ہوئیں ان واقعات کی نہایت پر درد یادگاریں ہیں

تصور کرتے تھے جدید دور بیداری میں گاؤکشی دونوں قوموں کے درمیان ایک اہم مسئلہ نزاعی بن گیا ہے جو بڑے بڑے فسادات کا باعث ہوتا رہتا ہے اس کے متعلق ان کا خاص طرز عمل تھا جو اس دور انتشار وفتن میں ظاہر ہوا ہنگامہ مسجد کانپور کے قریب ہی زمانہ میں اجودھیا میں ایک زبردست فساد ہوا تھا جس میں بہت سے ہندوؤں کو سزائیں ملی تھیں اس کے متعلق بستی کے ایک وکیل نے یہ کوشش کی کہ کم از کم اجودھیا میں مسلمان رضامندی کے ساتھ گاؤکشی چھوڑ دیں اور قیدیوں کو رہا کر دیا جائے انہوں نے آنریبل مسٹر مظہر الحق کی بھی ہمدردی حاصل کی اور نواب صاحب کو ایک طولانی خط لکھا جس کا آخر فقرہ یہ تھا کہ :-

> میں ہندوؤں کی جانب سے بعاجزی التماس کرتا ہوں کہ اجودھیا میں گائے کی قربانی کے معاملہ میں مسلمان ہندوؤں پر احسان کریں۔ ہندوستان بھر میں اس کا روکنا قطعی غیر ممکن ہے اور یہ درخواست بھی غالباً بہت بڑی ہے لیکن اجودھیا ہمارا کعبہ ہے اگر آپ کی کوشش سے ممکن ہو تو اجودھیا میں ہمارے مسلمان دوسرے جانور سے اپنا فرض ادا کریں۔

نواب صاحب نے جواب تحریر کیا کہ :-

> جس خاموش طریقہ سے آپ نے اجودھیا میں قربانی کے مسئلہ کے متعلق کوشش شروع فرمائی ہے وہ صاف اس بات کی دلیل ہے کہ جناب عام مخلوق میں امن وراحت پھیلانا چاہتے ہیں اور مذہبی تعصبات کا جس نے ملک کو سخت نقصان پہنچایا ہے آپ کی تحریک میں شائبہ بھی نہیں ہے اور اس نیک نیتی کے ساتھ جب کوئی کوشش ہوتی ہے تو خدا اُس میں مدد کرتا ہے اپنی نسبت میں اس موقع پر مجبوراً عرض کرتا ہوں ورنہ یہ الفاظ کبھی میری زبان پر بھی نہ آتے کہ جس وقت سے میں نے ہوش سنبھالا ہے میرے ہاں سوائے بکروں اور مینڈھوں کے کبھی کسی دوسری قسم کی

قربانی نہیں ہوئی ہو لیکن عام طور پر اس بحث کو اُٹھانا یہ علمار کا کام ہے اور بدقسمتی سے میرا شمار اس زمرہ میں نہیں ہے تاہم میں دل سے اس کا خواہشمند ہوں کہ جہاں تک ممکن ہو ہندوستان کی ان دو بڑی قوموں میں صلح و اتحاد قائم رہے اور آنریبل مسٹر مظہر الحق کا اپیل جس وقت شائع ہوگا میں اُس پر دل سے غور کروں گا اور اس اپیل کا اس وقت میں شائع ہونا جب کہ مسلمانوں کے دل ہندو بھائیوں کی اس ہمدردی سے لبریز ہو رہے ہیں جو کانپور کی مسجد کے معاملہ میں خاص کر اُن کی طرف سے مسلمانوں کے ساتھ ظہور میں آئی۔ بہت ہی موزوں اور برمحل ہوگا اس میں میری طرف سے انشاء اللہ مطلق دریغ نہ ہوگا نیز قیدیان مقدمہ اجودھیا کی رہائی کے واسطے اگر کوئی تحریک ہوگی تو میں بہت خوشی سے اس میں شریک ہوں گا

اس موقع پر مجھکو یہ بھی عرض کر دینا ضروری ہو کہ میری عمر اس وقت ستتر سال کی ہے اور تکلیف دہ عوارض نے مجھ کو اس قدر کمزور کر دیا ہے کہ کسی مفید سی مفید تحریک کا محرک ہونے سے میں قاصر رہتا ہوں اور اسی معذوری سے میں نے علی گڑھ کالج کی آنریری سکریٹری شپ سے علٰحدگی اختیار کی اور ایک ایسی مفید ترین قومی خدمت سے مجھکو دست کش ہونا پڑا لیکن میں ہر ایک مفید تحریک کی تائید کرنے کے واسطے البتہ بخوشی تمام حاضر ہوں۔

وفد انگلستان کی تائید

اُن رفتار واقعات کے لحاظ سے جو گذشتہ تین سال میں رہی۔ (آنریبل سر) سید وزیر حسن آنریری سکریٹری آل انڈیا مسلم لیگ اور (مولانا) محمد علی اڈیٹر ہمدرد و کامریڈ اس خیال سے کہ انگلستان جاکر مسلمانان ہند کے صحیح نقطہ خیال اور دیگر ممالک کے مسلمانوں کے خیالات کے اہم پہلوؤں

سے اخبارات کو اور دیگر مناسب ذرائع سے ملکِ معظم کے وزراپارلیمنٹ کے ممبروں دیگر با اثر اشخاص اور کل انگریز قوم کو واقف کریں اور بالخصوص ملک معظم کی ذات وتخت کے ساتھ مسلمانوں کی وفاداری کی اہمیت اور ان کے مطالبات کے حق بجانب ہونے کا یقین دلائیں ستمبر ۱۹۱۳ء میں انگلستان روانہ ہوگئے۔

اس مقصد کے ساتھ ان کا دوسرا مقصد اپنے وطن کی خدمت اور چند اہم مسائل پر توجہ دلانا تھا اور چوں کہ اس وقت ہز ہائی نس سر آغا خان، خواجہ کمال الدین (مرحوم) مسٹر محمد علی جینا آنریبل مسٹر گوکھلے بھی وہاں موجود تھے اس لئے ان اصحاب سے ہر دو مقاصد میں مدد ملنے کی پوری توقع تھی۔

جب یہ وفد انگلستان پہنچا تو اس نے ہز ہائی نس سر آغا خاں اور رائٹ آنریبل سید امیر علی صدر مسلم لیگ شاخ لندن سے خواہش کی کہ دونوں اپنی متفقہ دعوت سے ان کو موقع دیں کہ اس ملک کے با اثر آدمیوں کے سامنے وہ اپنے خیالات کا اظہار کریں ہز ہائی نس نے اس خواہش کو منظور کر لیا مگر سید امیر علی نے اس کو نامناسب سمجھ کر انکار کر دیا اور ایک قسم سے مخالفانہ رویہ ظاہر کیا۔ دوسری طرف وزرائے سلطنت نے بھی اس وفد کی کچھ اہمیت نہ سمجھی اور ارکان وفد کو ملاقات تک کا موقع نہ دیا۔

ان وجوہ سے ارکان وفد اور سید امیر علی کے مابین سخت اختلاف پیدا ہو گیا اور نتیجہ میں آخر الذکر مسلم لیگ شاخ لندن کی صدارت سے مستعفی ہو گئے۔

نواب وقار الملک اگرچہ پبلک لائف سے اب کنارہ کش ہی سے تھے لیکن لندن کی

نوٹ:۔ ہندوستان میں بھی اس امر کی کوشش کی گئی کہ قوم کے با اثر اور ممتاز لیڈروں کو الگ رکھ کر ہز ہائی نس نواب صاحب فرماں روائے رام پور کی صدارت میں جلسہ ہوا اور اس میں سیاسی پروگرام بنایا جائے اور اس وفد کی اہمیت کم کی جائے۔

چنانچہ یکم اکتوبر ۱۹۱۳ء کو دہلی میں یہ جلسہ منعقد ہوا اور نتیجہ میں ذاتی رقابتوں نے مسلمانوں کی متفقہ سیاسی پالیسی کو مجروح کر کے قوم میں سیاسی انتشار پیدا کر دیا۔

ان کارروائیوں سے ان کے قلب کو بہت تکلیف پہنچی اس لئے اُنہوں نے ارکان وفد کے ساتھ جو سلوک ہوا اُس پر ایک بسیط مضمون میں اپنے خیالات کا اظہار کیا۔ نیز بعض حقائق و اصول پر گہری روشنی ڈالی۔ وہ لکھتے ہیں کہ:-

بے شک یہ امر افسوس سے خالی نہیں ہے کہ وزرائے انگلستان نے مسٹر محمد علی خاں اور وزیر حسن اور مولوی ظفر علی خاں[۵۱] کی ملاقات سے انکار کر دیا لیکن ہندوستان کے مسلمانوں کو اس سے بد دل نہ ہونا چاہئے اور گورنمنٹ کی بھی کچھ مشکلات ہیں جن پر نظر رکھنا بھی ضروری ہے۔ ایک ڈپوٹیشن جو ہندوستان سے انگلستان کو سیاسی امور کے متعلق بلا توسط بلکہ بلا اطلاع جاتا ہے۔ وزیر ہند اور وزیر اعظم اگر ان سے ملنے میں تامل کرتی ہیں تاکہ ولیسرائے کی منزلت میں فرق نہ آوے تو وہ بھی ایک حد تک حق بجانب ہیں۔ ساتھ ہی ہم کو یہ بھی ہرگز نہ سمجھنا چاہئے کہ اس انکار ملاقات سے ڈپوٹیشن کے مقاصد میں کوئی نقص آگیا ہے، لیکن انکار ملاقات کے جو وجوہ وزراء کی طرف سے بیان ہوئے اگر وہ بیان نہ ہوتے اور صرف اس قدر بیان کر دیا جاتا کہ ملکی پالیسی اس ملاقات کے لئے مانع ہے تو یہ پالیسی وزرار کے واسطے زیادہ محفوظ ہوتی۔ وزرار کی طرف سے بیان ہوتا ہو کہ ان کی معلومات ان کے افسران متعینہ ہندوستان کے ذریعہ قابل اطمینان ہے لہذا ان کو ضرورت نہیں ہے کہ وہ ہندوستانیوں سے بلا واسطہ ہندوستانی واقعات پر گفتگو کریں۔ وزراء کی یہ دلیل بہت ہی زیادہ کمزور ہے اور اگر خدانخواستہ آیندہ کسی وقت ہندوستان کی حکومت برٹش قوم کے ہاتھ سے نکل جائے تو اس وقت کے مورخین وزرا کی اس پالیسی کو انقلاب کی ایک بہت بڑی

---

[۵۱] مولوی صاحب لندن میں شریک ہوگئے تھے۔

وجہ کے طور پر پیش کریں گے کہ حکومت اس حالت پر پہنچ گئی تھی کہ سوائے
اس کے کہ جو کچھ اُس کے افسر اس کے کانوں میں کہیں دوسری کوئی بات
رعایا کی زبان سے سُننا نہیں چاہتی تھی۔

وزراء ہندوستان یہ بھی کہتے ہیں کہ ممبران ڈیپوٹیشن مسلمانان
ہندوستان کے جائز نمائندے نہیں ہیں یہ ایک ایسا خلاف واقعہ امر ہے
جس کا وزارت کی زبان سے ادا ہونا صرف اس حالت میں ممکن ہوا ہے
جبکہ وہ اپنے افسران متعینہ ہندوستان کی رپورٹوں کے سوا اور کوئی بات
سُننی یا دیکھنی گوارہ نہیں کرتے ورنہ وزراء کی نظر اگر ہندوستانی اخباروں
پر ہوتی تو وہ ایسی بات مشکل ہی سے زبان سے نکل سکتی تھی جو بالکل اس
کی مترادف ہے کہ سورج نکل رہا ہو اور اُس کے وجود سے انکار کیا جائے۔

وزراء کی ایک دلیل یہ بھی ہے کہ ہندوستان میں ایک گروہ ان لوگوں
کا بھی ہے جو ممبران ڈیپوٹیشن کے خیالات سے اختلاف رکھتا ہے۔ یہ گروہ
جس کی طرف وزراء نے اشارہ کیا ہے اس میں ایک حصہ تو بالکل
اُسی قسم کا ہے جیسا کہ یکم اکتوبر گذشتہ کو دہلی میں جمع ہوا تھا اور اس حصہ
کے مقابلہ میں ہمارے نمائندوں کی پوزیشن بہت مضبوط ہے اور فی
صدی اہل الرائے اشخاص کے خیالات وہی ہیں جو ہمارے نمائندوں کے
ہیں۔ البتہ مسٹر محمد علی خاں صاحب اور سید وزیر حسن صاحب سے ایک خاص
مسئلہ کے متعلق اکثر اہل الرائے کو سخت اختلاف ہے اور وہ سلف گورنمنٹ
کا مسئلہ ہے اور گذشتہ آل انڈیا مسلم لیگ سے چند نوجوانوں کی تائید میں
مجارٹی کا حاصل ہو جانا صرف اس بنا پر ہے کہ دوسرے قدیم خیالات کے
حضرات نے اس مباحثہ کے وقت لیگ میں بہت کم شرکت کی تھی۔ لہذا

کثرت رائے درحقیقت مغلوب حالت میں ہے ہمارے مذکورہ بالا نمائندے جنہوں نے اس وقت انگلستان کا سفر اختیار کیا وہ سلف گورنمنٹ پر بحث کرنے نہیں گئے بلکہ ان کے سامنے دوسرے اکثر اہم سوالات تھے جن میں فی صدی نقرے سے زیادہ مسلمانان ہندوستان ان کے ساتھ ہیں اور اور یہ مسائل ضرور اس کا استحقاق رکھتے تھے کہ برٹش وزارت اُس طرف اپنی آنکھوں اور کانوں کو کھلا رکھتے۔

کچھ عجب نہیں ہے اگر وزرا کی پالیسی میں کوئی اثر رائٹ آنریبل سید امیر علی صاحب کی شخصیت کا بھی شامل ہوا ہو اور انہوں نے یہ نہ چاہا ہو کہ جس معمر بزرگ نے گورنمنٹ کے اتفاق سے لندن کمیٹی کو اب تک ایک خاص پالیسی کے ساتھ چلایا ہے اس کو چند نوجوانوں کے مقابلہ میں خفیف ہونا پڑے۔ لیکن اگر درحقیقت یہی پالیسی وزرا کی تھی تو اُس میں ایک بڑی مشکل یہ ہے کہ وزارت نے اپنے آپ کو ایک خاص پارٹی سے شامل کر دیا حالانکہ وزارت کی پوزیشن اس سے بہت اعلیٰ وارفع ہونا چاہئے۔ اس کو سمجھنا چاہئے تھا کہ وہ شہنشاہ کی زبان اور کان ہے اور شہنشاہ کو اپنی مختلف فرقہ ہائے رعایا پر بطور ایک سرپوش اپنی جگہ قائم رکھنی چاہئے کوئی نہیں کہہ سکتا کہ اس گروہ سے جس کے قائم مقاموں کے ساتھ انگلستان میں اس وقت یہ بے اعتنائی برتی گئی آیندہ سلطنت کے حق میں کیا کیا مفید کارروائیاں اور کارگذاریاں ہونے والی ہیں۔ اور حال میں جو حضور سکریٹری آف اسٹیٹ نے جنوبی افریقہ کے متعلق ہندوستانیوں کے ایک ڈیپوٹیشن کو باریابی بخشی جن میں ایک معزز ممبر رائٹ آنریبل سید امیر علی صاحب بھی ہیں۔ اس کارروائی سے ہمارا مذکورۂ بالا اعتراض رفع نہیں ہوتا بلکہ اور مستحکم ہوا جاتا ہے کیونکہ اس کے صاف معنی یہ

ہیں کہ برٹش وزراصرف اُنہیں حضرات سے سابقہ رکھنا پسند کرتے ہیں جو پہلے سے اُن کے ہم خیال ہیں اور جو لوگ فی الحقیقت قوم کے نمایندہ ہیں اُن سے تعلق نہیں چاہتے لیکن یادرکھنا چاہیئے کہ اب یہ زمانہ ختم ہوتا جارہا ہے اور عنقریب وہ دن آتے ہیں جبکہ گورنمنٹ خود اپنی حفاظت اور اپنا نفع اسی میں سمجھے گی کہ ملک کے اصلی نمایندوں سے اپنے تعلقات قائم کرے۔

اب رہا یہ امر کہ وزرا کے انکار ملاقات سے ہمارے نمایندوں کی کوئی توہین تو نہیں ہوئی یا اُن کو کوئی نقصان پہنچا ہے ایسا خیال ہرگز نہیں کرنا چاہیئے نمایندوں نے اپنا فرض نہایت خوبی سے ادا کیا اور فی صدی نوّے سے زیادہ سے اہل ملک نے اُن کی خدمات کو پوری قدردانی سے دیکھا اور اور قوم کی نگاہ میں جو عزّت اُن کو حاصل ہوئی (گو اُن کا یہ کام کسی عزّت کر معاوضہ کی غرض سے نہیں تھا) اس کے مقابلہ میں کسی توہین کا خیال تک بھی نہیں کیا جاسکتا اور اب تعلیمی ترقی روز بروز اس خیال کو ترقی دے رہی ہے کہ اصلی عزّت وہ نہیں ہے جو کوئی شخص گورنمنٹ کی طرف سے حاصل کرے بلکہ اصلی عزّت اس میں ہے کہ قوم و ملک کسی کو قدر کی نگاہ سے دیکھے۔

نیز کوئی نقصان وزرا کی کارروائی سے ہماری پالسی کو بھی نہیں پہنچا اصل مقصد ہمارے نمایندوں کا یہ تھا کہ انگلش پبلک کو یہاں کے حالات سے اطلاع دیں جس اطلاع دینے کی غرض سے انگلش پریس تجربہ سے بہت کچھ قاصر ثابت ہوا ہے اور وزرا کے انکار ملاقات نے ان مسائل کو اور بھی زیادہ شہرت دیدی اور سمجھنے والے اس کو اچھی طرح سمجھتے ہیں کہ بہت سے برٹش اہل الرائے کے خیالات پر ہمارے نمایندوں کی کارروائی سے بہت مفید اثر پڑا گو جلد نہ سہی مگر کسی قدر توقف کے ساتھ اپنا رنگ جمائے بغیر نہ رہے گا ہوالمقصود۔

ارکانِ وفد کی خدمات کا اعتراف

جب یہ وفد ہندوستان واپس آیا تو نواب صاحب نے مسلم لیگ کے جلسہ (دسمبر ۱۹۱۳ء) میں اُس کے ارکان کی خدمتوں اور کوششوں کا اس طرح اعتراف کیا کہ خاص قاصد کے ذریعہ پھولوں کے ہار بھیجے اور صدر جلسہ نے ارکانِ وفد کو پلیٹ فارم پر بلا کر پہنائے جس سے اُس جلسہ میں ایک عجیب جوش پیدا ہو گیا۔

لندن مسلم لیگ کی آزادی سے اختلاف

اسی اختلاف کی بنا پر نومبر ۱۹۱۳ء میں آنریبل سید امیر علی نے اعیان و اکابر قوم کے سامنے ایک گشتی خط کے ذریعہ سے یہ سوال پیش کیا کہ چونکہ لندن لیگ برٹش حکومت کے مرکز میں قائم ہونے کی وجہ سے رائے عامہ پر مسلسل اثر ڈالتی رہی ہے لہذا اس اثر کو قائم رکھنے کے لئے اُس کو آزاد اور آل انڈیا مسلم لیگ کا ہم پلہ ہونا چاہئے اور اگر وہ کسی ارگنائزیشن کے ماتحت ہوگی تو یہ مستحکم اور مستقل پالیسی رکھنے میں ناکام ہو جائے گی، ہندوستانی لیگ کے بعض ممبروں کی یہ خواہش کہ ان کے احکام کی پابندی کی جائے ہم منظور کریں تو وہ اثر جو لندن مسلم لیگ نے اب تک پیدا کیا ہے یقیناً زائل ہو جائے گا اس سوال کو سامنے لانے کے ساتھ ہی اعیان و اکابر کی رائوں کو متاثر و مرعوب کرنے کے لئے انھوں نے اور لندن لیگ کے دیگر عہدہ داران نے استعفے بھی دیدئے۔ آنریبل (سر) میاں محمد شفیع (لاہور) نے بھی اس کی تائید میں ایک گشتی خط جاری کیا اور مشورہ دیا کہ "وہ لیڈر جو معاملات پر ٹھنڈے دل سے غور کرنے کے عادی ہیں اس بات کی پوری کوشش کریں کہ وہ ہندوستان کے مسلمانوں کو اس نشیب کی طرف گردن توڑنے والی تیز رفتاری سے جانے نہ دیں جو بالآخر ان کی قومی ہستی کے لئے پر خطر ہے"۔ انھوں نے یہ اپیل کی کہ مسلمان زیادہ تعداد میں مسلم لیگ کے آیندہ اجلاس میں شریک ہو کر سید امیر علی پر اظہار اعتماد کریں مگر نواب وقار الملک نے جواب میں سید امیر علی سے سخت اختلاف کیا اور دسمبر ۱۹۱۳ء کے اجلاس مسلم لیگ منعقدہ آگرہ میں کونسل کو ایک پیغام بھیجا جس میں اپنی علالت طبع کے باعث عدم

شرکت پر اظہار معذوری کرنے کے بعد یہ توجہ دلائی کہ :-

پہلا مسئلہ جو کو قوم کے سامنے آخر میں پیش آیا ہے لیکن بلحاظ اپنی اہمیت کے وہ سب سے اول قابل غور اور تصفیہ ہی مسلم لیگ کی لندن کمیٹی کا مسئلہ ہے کہ آیا وہ آل انڈیا مسلم لیگ کی ایک شاخ سمجھی جائے یا وہ آل انڈیا مسلم لیگ کے اتباع سے بالکل آزاد ہو۔ اس مسئلہ کے متعلق میں نے جہاں تک غور کیا ہے میرے نزدیک کوئی دلیل اس بات کے لئے نہیں ملتی کہ لندن کمیٹی کو آل انڈیا مسلم لیگ سے آزادی دی جاے۔ لندن کمیٹی کی گذشتہ تاریخ پر اگر غور کیا جاتا ہے تب بھی یہی ثابت ہوتا ہے کہ اپنے ابتداے قیام سے اُس نے بطور ایک معزز شاخ کے آل انڈیا مسلم لیگ کے ساتھ کام کیا ہے سات کروڑ مسلمانوں کی جگہ جو ہندوستان میں آباد ہیں اگر سات لاکھ مسلمان بھی انگلستان میں آباد ہوتے تو بھی لندن کمیٹی کی حالت آزاد حالت تسلیم کی جاسکتی تھی اور میں نے تو کچھ روز پہلے اپنے معزز دوست کو خط لکھتے وقت یہاں تک بھی لکھا تھا کہ اگر طلبا کے علاوہ دو سو تعلیم یافتہ ہندوستانی مسلمان بھی ہندوستان کے مختلف حصص سے انگلستان میں موجود رہا کرتے تب بھی اس مسئلہ پر غور ہو سکتا تھا کہ لندن کمیٹی کو آل انڈیا مسلم لیگ سے آزاد تسلیم کرنا ممکن ہے یا نہیں لیکن بحالت موجودہ تو کسی طرح بھی ایسی رائے نہیں دی جاسکتی اور اگر عالی جناب رائٹ آنریبل سید امیر علی صاحب کی اس رائے کو قبول کیا جائے اور لندن کمیٹی کو آل انڈیا مسلم لیگ سے آزاد رکھا جائے جس میں چند طلبا اور صرف چند دوسرے بزرگان قوم کے سوا اور کسی شخص سے رائٹ آنریبل ممدوح صاحب کو کوئی مدد اور مشورہ نہ مل سکے گا تو اس کے صاف معنی یہ ہو جاتے ہیں کہ ایک پوری آزاد لیگ کی قوت صرف جناب ممدوح کی ایک ذات واحد میں جمع

ہو جاتی ہے اور قوم جناب ممدوح پر کتنا ہی زیادہ بھروسہ کیوں نہ رکھتی ہو لیکن جہاں تک میرا علم ہے قوم ایسی کسی تجویز کے لئے تیار نہیں ہے اور درحقیقت اگر ایسی کوئی تجویز مان بھی لی جاے تو علاوہ اس کے کہ وہ بالکل خلافِ اصول ہوگی مسلمانوں کے لئے اہم ترین خطرات سے بھی خالی نہ سمجھی جاوے گی خصوصاً اُن جدید واقعات کے بعد جن پر مسٹر محمد علی خاں اور سید وزیر حسن صاحب اور مولوی ظفر علی خاں صاحب کے سفر انگلستان سے روشنی پڑتی ہے ایک منٹ کے لئے بھی یہ رائے تسلیم نہیں کی جا سکتی کہ قوم اپنے تمام اہم سیاسی مطالب صرف کسی ایک ذات واحد کی راے کے تابع کر دے۔ مجھکو اسی وقت شبہہ ہوا تھا جب کہ جناب ممدوح نے اپنا یہ خیال ظاہر کیا تھا کہ اگر مسلمانوں کی سیاسی پالیسی کی باگ ان لوگوں کے ہاتھ میں رہی جو ہندوستان میں مقیم رہتے ہیں تو گورنمنٹ کے ساتھ مل کر کام کرنا مشکل ہو جائے گا میں بھی تسلیم کرتا ہوں اور غالباً کوئی بھی اس سے انکار نہ کر سکے گا کہ جہاں تک ممکن ہو گورنمنٹ کے اتفاق کے ساتھ کام کرنا ہمارے لئے کامیابی کا بہت ٹھیک راستہ ہے لیکن ہر چیز کی ایک حد ہوتی ہے بسا اوقات ایسے معاملات بھی پیش آتے ہیں جن میں گورنمنٹ کا ایک مقصد ہوتا ہے اور رعایا کا دوسرا مثلاً جب سے برٹش گورنمنٹ اور روسی گورنمنٹ سے خاص قسم کا اتحاد ہوا ہے برٹش گورنمنٹ کے دل میں مسلمانوں کی خاطر داشت کا اس قدر خیال نہیں رہا جتنا کہ اس سے پہلے تھا اور بہت سی مثالوں نے اس کو صاف طور پر ثابت کر دیا ہے کہ جو چیزیں مسلمانان ہندوستان کے دل کو بہت زیادہ تکلیف رساں تھیں ان کو برٹش گورنمنٹ نے روسیوں کی خاطر سے بے تامل جائز رکھا تو ایسی حالت میں کیونکر ممکن ہے کہ ہندوستان کے مسلمان اپنی پالیسیوں کے

قائم کرنے میں گورنمنٹ کے منشار کا پورا لحاظ رکھیں جیسا کہ کچھ عرصہ پیشتر ان کا طرز عمل رہا اور جس نے کوئی خاص مفید بات مسلمانوں کے حق میں پیدا نہ کی

رائٹ آنریبل سید امیر علی صاحب کی پالیسی پر جو روشنی اب پڑتی ہے اس نے تمام مسلمانوں کو اس بات سے آگاہ کر دیا ہے کہ جناب ممدوح نے مسلمانوں کی طرف سے جو آواز گورنمنٹ میں بلند اور جو کوششیں اُنھوں نے اپنی قوم کے مقاصد کے لحاظ سے اختیار کیں اُنھوں نے ان میں اول گورنمنٹ کے اعلیٰ افسران سے اجازت حاصل کی اور یہ امر محتاج ثبوت نہیں ہے کہ اس طرح پر اجازت حاصل کرنے کے بعد جو خواہشات کہ گورنمنٹ کے سامنے پیش کی جائیں گی اُنکا کچھ زیادہ اثر گورنمنٹ پر نہ ہوگا اور یہ ہی وجہ ہے کہ جو ہم دیکھتے ہیں کہ گورنمنٹ پر ان باتوں کا اثر بہت ہی کم ہوا ایران میں طرابلس و بلقان میں کیس بھی مسلمانان ہندوستان کی فیلنگس کا جیسا خیال چاہیئے تھا ہرگز نہیں کیا گیا۔ خدا لارڈ ہارڈنگ کو سلامت اور خوش رکھے اگر کچھ ہوا تو اُن کی توجہ اور مہربانی اور رعایا پروری سے ہوا اور اس میں لندن کمیٹی اور رائٹ آنریبل سید امیر علی صاحب کی کوششوں کو کوئی دخل نہ تھا بلکہ وہ ان مسلمانوں کی آواز کا اثر تھا جو اُنھوں نے بلا لحاظ اس بات کے کہ گورنمنٹ آخر الامر کیا کرے گی اور کیا نہ کرے گی پوری آزادی کے ساتھ اپنے جذبات کو گورنمنٹ آف انڈیا کے سامنے اپنے پریس کی مدد سے بار بار پیش کیا۔

خلاصہ یہ ہے کہ پالیسیوں کا مرکز ہندوستان ہی میں قائم رکھنا مفید ہوگا۔ البتہ یہ ہر آئینہ قرین مصلحت ہوگا کہ آل انڈیا مسلم لیگ جہاں تک ممکن ہو اپنی پالیسیوں سے لندن کمیٹی کو مطلع کرتی رہے لندن کمیٹی اپنے مشوروں سے آل انڈیا مسلم لیگ کو مدد دیتی رہے اور ایک دوسرے کے اتفاق کے ساتھ کام کرے لیکن

اگر کسی مسئلہ میں اتفاق نہ ہو تو لندن کمیٹی کو بھی اس پالیسی کا اتباع ضرور ہوگا جو ہندوستان میں قائم کی جائے رائٹ آنریبل صاحب ممدوح اگر اس اصول کو اپنے لئے ناقابل برداشت خیال فرماتے ہوں تو اس کے سوا دوسرا چارہ قوم کے ہاتھ میں نہیں ہے جو بہت ادب اور افسوس کے ساتھ ان کی خدمت میں عرض کرے کہ بالخیر وشما السلامت۔

نمائش مصنوعات ترکی کا افتتاح ڈاکٹر انصاری کی مراجعت کے بعد ان کی اور مولانا محمد علی (مرحوم) کی متفقہ کوششوں سے مہاجرین بلقان کی امداد کے لئے جنوری ۱۹۱۴ء میں مصنوعات ترکی ایک نمائش منعقد ہوئی اس کے اراکین مجلس انتظامیہ نے افتتاح کے لئے نواب صاحب کو مدعو کیا تو اگرچہ وہ اس زمانہ میں امراض کے متواتر حملوں سے نہایت کمزور اور ناتوان تھے لیکن اس کام کو سعادت و ثواب

---

۵ بلقانی مسلمان ارض بلقان سے ہجرت کر کے ولایت کوجک میں بے سروسامانی کی حالت میں آئے تو غیر ممالک کے مسلمانوں اور اکثر عیسائیوں نے بھی حکومت سے بہت سے قطعات حاصل کر کے اُن کے لئے مکانات کی تعمیر اور دیگر ضروریات زندگی کی فراہمی کا انتظام کیا۔

اسی غرض کے لئے ڈاکٹر انصاری (مرحوم) کی کوشش سے ہندوستانیوں اور ترکوں کی ایک مشترکہ سوسائٹی قایم کی گئی اس نے بھی پچاس ایکٹر زمین حاصل کی۔

ڈاکٹر انصاری نے سو خاندانوں کی عارضی بود و باش کے لئے اپنی مشن کے خیمے بھی دیدئے۔ مولانا محمد علی (مرحوم) اور مولانا ظفر علی خاں نے اپنے اپنے اخبارات "کامریڈ" اور "زمیندار" کے ذریعہ سے چار ہزار پانچ سو پونڈ کی رقوم جمع کر کے بھیجیں۔

اس فنڈ میں امداد حاصل کرنے کے لئے مولانا محمد علی کی تحریک پر اس نمائش کا انتظام کیا گیا ڈاکٹر انصاری نے نہایت محنت و اہتمام سے مصنوعات کے نمونوں کو فراہم کیا اور اعلیٰ پیمانہ اور صفائی کے ساتھ نمائش کا انعقاد ہوا۔

سمجھ کر آمادہ ہو گئے اور دہلی جا کر اس کا افتتاح کیا ایڈرس کے جواب میں تقریر کی اور اس میں اس نمائش سے جو تجارتی و سیاسی فوائد متوقع تھے ان کی نسبت کہا کہ :-

اس نمائش کا اثر میرے خیال میں صرف اُن مہاجرین ہی تک محدود نہیں رہے گا جن کو مخصوص طور پر امداد پہنچانے کے لئے اُس کا انعقاد کیا گیا ہے بلکہ اس کو میں اُن اقتصادی تعلقات کا سنگ بنیاد سمجھتا ہوں جو ٹرکی اور ہندوستان کے درمیان پیدا ہوں گے اور جس سے دونوں ملکوں کی گورنمنٹوں کے دوستانہ تعلقات میں بھی ترقی ہوگی جس حالت میں ہم دیکھتے ہیں کہ گورنمنٹ برطانیہ اُن حکومتوں کے لئے ہندوستان میں تجارتی سہولتیں پیدا کر رہی ہے جن سے اُس کو بہت سے ملکی اور مالی خطرات ہیں اور جن کی وجہ سے اُس کو ہر سال ایک کثیر رقم اپنی حفاظت کے لئے صرف کرنی پڑتی ہے اس حالت میں کوئی ایسی کارروائی جو ہندوستان اور ٹرکی دونوں کے فائدہ کا موجب ہو زیادہ قابل قدر ہے اور ہم کو اپنی گورنمنٹ سے تائید کی امید ہونی چاہئے۔ بالخصوص اس وجہ سے کہ ترکی سے برطانیہ کو کسی قسم کا خطرہ نہیں ہے اور خود حکومت ٹرکی برطانیہ کی دوستی کی ہمیشہ خواہشمند ہے۔

آخر میں ترکی تمسکات کی خریداری کی جانب بھی توجہ دلائی کہ :-

میں اس موقع پر اکابر قوم کی توجہ ترکی تمسکات کی خریداری کی طرف بھی مبذول کرنا چاہتا ہوں۔ ترکی مہاجرین کی امداد کی ایک بہتر صورت یہ بھی ہو سکتی ہے کہ ترکی تمسکات کا منافع مہاجرین کی امداد میں فلاں انجمن کو دیا جایا کرے جس کا ذکر ایڈریس میں ہوا ہے۔

جس حالت میں کہ مہاجرین کی اعانت کی ضرورت کو غیر اقوام اور عیسائی

مذہب کے لوگوں نے بھی محسوس کیا ہے تو مجھے اس کے متعلق اپنی قوم اور اپنے ہم مذہبوں سے کچھ زیادہ کہنے کی ضرورت نہیں معلوم ہوتی۔

ادائے حقوق و دیوان اور وقف علی الاولاد۔

نواب صاحب نے اگرچہ حیدرآباد میں ڈھائی ہزار روپیہ ماہوار تک تنخواہ پائی لیکن کبھی آسودہ حالی نصیب نہیں ہوئی۔ البتہ زمانہ معطلی کی پوری تنخواہ ملنے کے وقت ایک معقول رقم یک مشت ان کے ہاتھ آئی تھی مگر قرضوں اور پہلی بیوی کا مہر ادا کرنے میں صرف ہوگئی کچھ رقم حج بیت اللہ کے لئے محفوظ رکھی تھی لیکن اس کا موقع نہ ملا۔ سبکدوشی کے بعد اگرچہ چھ سو روپیہ (سکہ انگریزی) وظیفہ تھا اور تین چار سو روپیہ ماہانہ کی آمدنی تھی۔ مگر اُن کے اخراجات نے جس میں، زیادہ تر کنبہ برادری اور غربا کی امداد شامل تھی ہمیشہ تنگ دست بلکہ مقروض رکھا۔ اور جب بار قرضہ بڑھ گیا تو انہوں نے حیدرآباد کے مکانات فروخت کرکے قرضہ اور ذوی الحقوق کے جملہ حقوق سے سبکدوشی حاصل کی۔

ترکہ مادری سے جو حقیت ملی تھی اس کو اور نیز پہلی بیوی کی متروکہ کو ان کی اولاد پر تقسیم کردیا اور اس تقسیم میں ماں کی وصیت کا پورا لحاظ رکھا۔ محجوب الارث ورثا کو بھی بطور صلہ رحم معقول حصہ دیا۔

غرض تمام دیون ادا کرنے اور تقسیم جائداد کے بعد جون ۱۹۱۵ء میں دو ہزار چار سو چالیس روپیہ سالانہ کے منافع کی جائداد اور کچھ نقد باقی تھا اُس کو اپنے فرزند و دختر کے حق میں جو دوسری بیوی کے بطن سے تھے وقف علی الاولاد کردیا اور دو سو سولہ روپیہ سالانہ اخراجات خیر کے لئے مقرر کئے۔

نواب صاحب قانون وقف علی الاولاد کے بڑے مؤید تھے اور اُنھوں نے مولانا شبلی مرحوم کو ہر قسم کی امداد دی تھی اور جب وہ قانون نافذ ہوا تو اس صوبہ میں سب سے پہلے اُنھوں نے اس پر عمل کیا۔ وقف نامہ کی صدہا مطبوعہ کاپیاں جابجا تقسیم کیں اور ایک

گذارش بطور دیباچہ مسلمانوں کے غور کے لئے تحریر کی اور اس قانون سے جلد تر فائدہ اٹھانے پر توجہ دلاتے ہوئے لکھا کہ :-

مسلمانوں کی بہت سی جائدادیں تلف ہو چکی ہیں اور جو گھر کسی زمانہ میں دولت مند کہلاتے تھے آج نہایت غربت اور افلاس کی حالت میں ہیں اور ان میں سے کتنے ہی اس وقت نان شبینہ کو محتاج ہیں۔ اور اگر یہی حالت خدانخواستہ چندے باقی رہی تو معلوم نہیں کہ مسلمانوں کا انجام کیا ہوگا۔
لیکن خدا کا شکر ہے کہ لارڈ ہارڈنگ بہادر بالقابہ کی گورنمنٹ کی مربیانہ توجہ اور بعض دیگر بزرگان قوم کی حسن سعی سے جن میں جناب مولانا شبلی مرحوم مغفور کا نام نامی ہمیشہ یادگار رہے گا حال میں وقف علی الاولاد کا قانون جو جاری ہوا ہے۔ وہی صرف ایک ایسی تجویز ہے جس سے اگر مسلمان مستفیض ہوں تو آیندہ کے لئے اس تباہی سے محفوظ رہ سکتے ہیں ورنہ دوسری کوئی صورت نظر نہیں آتی۔

ہز اگزالٹڈ ہائی نس کے حضور میں ایک عرض داشت۔

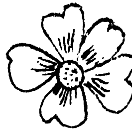
نواب صاحب کو اپنے فرزند مشتاق احمد (سلمہ اللہ تعالیٰ) کی اعلیٰ تعلیم کا بھی خیال تھا جو اس وقت پندرہ سال کے تھے اور دیرہ دون کیمبرج اسکول میں تعلیم پا رہے تھے۔ پہلے فرزند محمد احمد مرحوم کو اُنہوں نے یورپ میں تعلیم دلوائی تھی اور کل مصارف خود ادا کرتے تھے حالانکہ سرکار عالی کی فیاضی سے متعدد عہدہ داروں کی اولاد کو یورپ کے تعلیمی وظائف دئے جا رہے تھے مگر چوں کہ اُس وقت وہ خود کفالت کر سکتے تھے اس لئے اُنہوں نے ایسی فیاضی سے استفادہ کا خیال بھی نہیں کیا۔ اب ان کو اپنی زندگی سے مایوسی تھی اور جو آمدنی تھی اُس سے اُن مصارف کی کفالت ناممکن تھی اس لئے اُنہوں نے ہز اگزالٹڈ ہائینس

آصف جاہ سابع (خلد اللہ ملکہ) کے حضور میں ایک مفصل عرض داشت پیش کی جس میں اپنی مالی حالت وغیرہ کا بھی پورا تذکرہ کر دیا۔ لیکن امداد کی نوعیت و تعین کو اعلیٰ حضرت کی شاہانہ فیاضی پر منحصر رکھا۔

نتیجہ[۱] اعلیٰ حضرت نے نواب صاحب کی خدمات پر لحاظ فرما کر ہندوستان میں تعلیم کے لئے سو روپیہ اور یورپ کی تعلیم کے لئے دو سو پچاس روپیہ ماہانہ منظور فرمائے۔ نیز بعد انفراغ تعلیم سلسلہ ملازمت سرکار عالی میں داخل کئے جانے کا حکم صادر فرمایا۔

---

[۱] اس درخواست کے پیش کرنے کے بعد نواب صاحب تقریباً ایک سال زندہ رہے اور جب ان کا انتقال ہوا تو اعلیٰ حضرت نے ان کے تین نواسوں کو جو زیر تعلیم تھے پچاس پچاس روپیہ ماہانہ کے تین وظائف عطا کیے اور بیوہ کا سو روپیہ حین حیاتی وظیفہ مقرر فرمایا۔



باب ہفدہم

علالت و وفات

نواب صاحب کی صحت عرصہ سے خراب تھی مگر سنہ ۱۹۱۵ء سے امراض کی تکلیف زیادہ ہوگئی متعدد مرتبہ فالج کے حملے ہوئے سنہ ۱۹۱۶ء میں طاقت وصحت نے بالکل جواب دے دیا۔ مرادآباد کے سول سرجن، ڈاکٹر مختار احمد انصاری (مرحوم) اور مسیح الملک حکیم محمد اجمل خاں صاحب (مرحوم) معالج رہے۔

آخر الذکر یہ دونوں اصحاب نہایت محبت وخلوص سے بار بار امروہہ آتے اور تمام امکانی تدابیر میں مصروف رہتے مگر روز بروز حالت ردی ہوتی گئی۔

سنہ ۱۹۱۵ء کے موسم گرما میں ڈاکٹر انصاری مرحوم اور چند اصحاب کی رفاقت میں مولف سوانح بھی عیادت کے لئے حاضر ہوا تھا باوجودیکہ اضمحلال وضعف کی کوئی حد نہ تھی لیکن مہمانوں کی خاطر وآسائش کے لئے خود بار بار تاکید کرتے تھے پھر چند مہینوں بعد دوبارہ گیا تو ہوش وحواس بھی باقی نہ تھے۔

شروع جنوری سنہ ۱۹۱۷ء سے مایوسانہ حالت تھی، غرض سال ڈیڑھ سال ان تکلیفوں میں بسر کرکے ۴ ربیع الثانی سنہ ۱۳۳۵ھ - ۲۸ جنوری سنہ ۱۹۱۷ء کو شنبہ کا دن گذار کر رات کے دو بجے ان کی روح داعی اجل کی صدا پر لبیک کہتی ہوئی - فردوس بریں میں راحت گزیں ہوگئی۔ انا للہ وانا الیہ راجعون۔

صبح کو لاش آبائی قبرستان میں دفن کی گئی نماز جنازہ میں امروہہ کے تمام مسلمان شریک تھے اور جنازہ کی مشایعت میں تمام طبقات کے باشندوں نے شرکت کی

اس واقعہ کی خبر سے جو اگرچہ غیر متوقع نہ تھی تاہم اُس کے سنتے ہی تمام قوم کے دلوں میں ایک شفیق و عزیز لیڈر اور خالص و مخلص رہبر کی دائمی جدائی سے رنج و الم کے جذبات موجزن ہو گئے۔

علی گڑھ میں ماتم سب سے پہلے یہ خبر علی گڑھ میں پہنچی اور بقول انسٹیٹیوٹ گزٹ کے عین اُس وقت علی گڑھ میں موصول ہوئی جب کہ ٹرسٹی صاحبان صرف امور مندرجہ ایجنڈا پر غور کرنے کے لئے جمع ہو رہے تھے اور اس جانکاہ سانحہ کے سُننے کے لئے بالکل تیار نہ تھے اس خبر وحشت اثر نے تمام سننے والوں پر کم از کم تھوڑی دیر کے لئے موت کے سے سکتہ کا عالم طاری کر دیا جس سے افاقہ ہونے کے بعد پہلا خیال جس نے بالتواتر تمام دماغوں میں گردش کی یہ تھا کہ مرحوم کا جنازہ علی گڑھ لانے کی کوشش کی جائے چنانچہ امروہہ کو اس مضمون کا تار دیا گیا اور امروہہ کی جانب جانے والی سب سے پہلی ٹرین میں طلبہ کی ایک جماعت ادھر روانہ ہوئی تاکہ اس فدائے قوم کو اسی خاک کے سپرد کیا جائے جس کی خدمت میں اُس نے اپنی عمر اور قویٰ کا بہترین حصہ صرف کیا تھا لیکن یہ تمام منصوبے اور تمام انتظامات ناگزیر طور پر بالکل بعد از وقت تھے (کیوں کہ لاش دفن ہو چکی تھی)۔

ٹرسٹی صاحبان نے اپنے اجلاس میں تعزیت کا رزولیوشن پاس کیا دوسرے روز جو سالانہ تقسیم انعام کا جلسہ ہونے والا تھا وہ ملتوی کیا گیا اسکول اور کالج میں تعطیل دی گئی اور تیسرے روز مسجد میں فاتحہ خوانی اور اسٹریچی ہال میں ٹرسٹی صاحبان اسٹاف اور طلبہ کا جلسۂ تعزیت پرنسپل صاحب کالج کی صدارت میں منعقد ہوا۔

پیغامات تعزیت ہر گوشۂ ملک سے ان کے فرزند مشتاق احمد (صاحب بی اے آکسن بیرسٹر ایٹ لا) کو تعزیت کے پیغام موصول ہوئے

جس میں اس جلیل الشان ہستی سے دائمی مفارقت پر عمیق رنج والم کے جذبات حسرت و افسوس کا اظہار تھا۔

علیا حضرت سرکار عالیہ فرماں روائے بھوپال، ہز ہائی نس نواب صاحب بہادر فرماں روائے رامپور اور تمام مسلمان عمائدین و اکابر نے ہمدردی و تعزیت کے تار اور خطوط ارسال کئے۔

(۱) پیغام تعزیت میں ہز آنر جیمس مسٹن کے یہ الفاظ جو اُنہوں نے اپنے خط تعزیت میں لکھے تھے

کہ اُن کی زندگی شان دار تھی اور انہوں نے اپنی قوم کے لئے ایک عظیم جنگ کی اور اچھی عمر پاکر اور بڑی شہرت حاصل کرکے اب انتقال کیا۔

اس امر کا ثبوت ہیں کہ گورنمنٹ سرکل میں بھی ان کی صداقت کا کس قدر زبردست اثر تھا سچ ہے۔ الحق یعلو ولا یعلیٰ

اسیران چھندواڑہ (شوکت علی و محمدؐ علی) نے نہایت حسرت آمیز تار دیا کہ

(۲) ہندوستان اپنے فرزند بزرگ سے اور ہم باپ سے جدا ہوگئے۔ خدا ہماری مدد کرے ان کو نہ دیکھنے کا افسوس ہے۔

اس سانحہ پر مولانا شوکت علی نے ایک پرائیویٹ خط میں ایک دوست کو لکھا کہ

ہم لوگوں کی مادہ پرست اور زرق البرق زندگیوں میں جو انقلاب اب نظر آتا ہے اس کو پیدا کرنے والی نواب صاحب مرحوم کی سادہ اسلامی زندگی کی مثال تھی . . . جو احسانات نواب صاحب مرحوم نے ہم نوجوان مسلمانوں پر کئے ہیں اس کا اجر تو خدا سے ان کو ضرور ملے گا ان کی زندگی نے اسلامی عظمت کا سکہ ہمارے دلوں میں بٹھایا اور ہم کو دکھایا کہ اس بیسویں صدی میں بھی مسلمان آسانی کے ساتھ دینی اور اسلامی زندگی بسر کرکے قوم اور ملک کی خدمت کرسکتا ہے نواب صاحب مرحوم کی قبل از وقت موت اور اُس سے

بڑھ کر ان کی بیماری جس نے اُن کو قومی کاموں سے علٰحدہ کر دیا تھا صرف ہمارے ہی لئے نہیں بلکہ خود ہمارے مقدس دین کے لئے عظیم الشان نقصان کا باعث ہوئی ایک کلمۂ حق کا کہنے والا اٹھ گیا جس کو کوئی خدشہ صراط مستقیم سے ہٹانے والا نہ تھا اور جو دین کے معاملات میں مصلحت اندیشی اور دیگر کمزوریوں کو پاس پھٹکنے نہ دیتا تھا۔

ماتمی مضامین تمام قومی اخبارات ورسائل نے اس حادثہ کا نہایت رنج والم کے ساتھ ماتمی کالموں میں ذکر کیا اور نواب صاحب کی سیرت کے متعلق آرٹیکل شائع کئے اُن میں سے اس سلسلہ میں "معارف" اعظم گڑھ اور شیعہ ملّت کے مشہور اخبار "اثنا عشری" دہلی کے اقتباسات حسب ذیل ہیں۔

علم والے علم کا دریا بہا کر چل دیئے ۔ واعظان قوم، سوتوں کو جگا کر چل دیئے
کچھ سخنور تھے کہ سحر اپنا دکھا کر چل دیئے (۱) کچھ مسیحا تھے، کہ مردوں کو جلا کر چل دیئے

نواب محسن الملک کی وفات پر ہم نے تدبیر وسیاست کا ماتم کیا۔ مولانا نذیر احمد کے مرنے پر سحر نگاری اور بزم آرائی کا مرثیہ پڑھا، مولانا شبلی کی موت پر ہم نے علم کے فقدان پر نوحہ کیا مولانا حالی کو رخصت کرتے ہوئے ہم نے سخنوری اور دقیقہ سنجی پر نالہ کیا، لیکن نواب وقار الملک کی رحلت پر ہم قوم کا ماتم کرتے ہیں۔ اور الوالعزمانہ اخلاق کی گم شدگی پر فریاد!

یہ ہستی گرانمایہ جس نے ہماری دنیا کو ۲۷ جنوری ۱۹۱۷ء میں الوداع کہا۔ ہمارے کارفرما قافلہ کا آخری مسافر تھا۔ اس کے بعد وہ دور جو انقلاب ہند کے بعد شروع ہوا تھا ختم ہو گیا! وہ دور جو انگریزی کالجوں کی کائنات نہیں بلکہ بوریا نشین مدارس کا نتیجہ تھی، منتہی ہو گیا! وہ دور جو قدیم تعلیم اور قدیم اخلاق کے نمونوں کو پیش کرتا تھا منقطع ہو گیا! یعنی آیندہ ہماری قسمت کے مالک عربی مدارس کے شملے نہ ہوں گے بلکہ انگریزی درسگاہوں کے ہیٹ اور جھبے ہوں گے اب مشرق، مشرق کی قومیت پر حکومت نہیں کرے گا۔

بلکہ مغرب، اب لیڈری اور رہبری جمہور کے لئے جوشِ دل اور اخلاصِ عمل ضروری نہ ہوگا، بلکہ صرف ایک کامیاب عہدہ اور ایک عمدہ سوٹ!

فیا ویلاہ علیٰ فقد الاسلام ویا خیبتاہ للمسلمین (معارف)

(۲) نوّابؔ وقارُ الملک مغفور

ازمنہ حاضرہ میں نواب وقار الملک بہادر کی وفات بھی حادثہ جانکاہ اور واقعہ ہائلہ سے کم نہیں کیوں کہ جن لامثال اوصاف کے لئے آج درجنوں مرثئے تصنیف ہو رہے ہیں اور اخبارات کے صفحے کے صفحے افسوسناک الفاظ سے سیاہ پوش نظر آرہے ہیں۔ مرحوم انہیں بھی اپنے ساتھ ایک ایسے عالم اور قبر کے اس تنگ و تاریک گوشے میں لے گئے جہاں جان دئے بغیر کوئی نہیں جاسکتا۔

مرحوم نے فرائض ملیہ اور خدمات اسلام کو بغیر کسی اثرِ تصنع کے نہایت خلوص کے ساتھ بے لوث انجام دیا۔ آپ قوم و ملت کے حقیقی اور صمیم قلب سے بہی خواہ تھے، انہوں نے ذاتی سود و بہبود، اغراض و مفاد، نمود و نمائش، خوشامد درآمد کو اپنی سیر چشمی علوہمتی حقیقی عزت اور خودداری کی بدولت کبھی پاس بھی نہیں پھٹکنے دیا اور یہی زرّیں سبق آموز مثالیں تھیں جن کے گہرے نقش آج پسماندگان کے قلوب میں آہ سوزاں بن بن کر ابھر رہے ہیں کیوں کہ اب یہ اوصاف کسی دوسرے قومی لیڈر میں بمشکل نظر آئیں گے۔

اس قحط الرجال کی گھٹاٹوپ تاریکی میں وقار الملک بہادر مغفور کی حیات اگرچہ ایک شمع سحری کا اثر رکھتی تھی مگر افسوس ؎

ظلمت کدہ میں میرے شب غم کا جوش ہے ایک شمع تھی دلیل سحر سو خموش ہے (زمانہ غیبی)

قومی انجمنوں اور انسٹیٹیوشنوں کا اظہار افسوس ہندوستان بھر کی تمام اسلامی انجمنوں اور انسٹیٹیوشنوں نے اس حادثہ پر نہایت اندوہ الم کے ساتھ اظہار افسوس کے

رزولیوشن پاس کئے جن میں سے آل انڈیا مسلم ایجوکیشنل کانفرنس اور آل انڈیا مسلم لیگ کے رزولیوشن علی الترتیب درج ذیل ہیں۔

(۱) یہ کانفرنس مسلمانان ہند کے مسلمہ لیڈر اور واجب الاحترام بزرگ نواب وقارالدولہ وقارالملک مولوی مشتاق حسین صاحب انتصار جنگ مرحوم ومغفور کے ارتحال پر ملال کو ایک قومی مصیبت تصور کرتی ہے اور بلحاظ ان بیش بہا اسلامی اور قومی خدمات کے جو مدت العمر جناب مرحوم نے نہایت خلوص اور صداقت اور بے مثال اخلاقی جرأت کے ساتھ اپنی درماندہ قوم کی فلاح وبہبودی کے متعلق انجام دیں اور بہ اعتبار ان اسلامی اعلیٰ اوصاف اور خصائل حسنہ اور کیرکٹر کی عدیم المثال خوبیوں کے جن کی وجہ سے مرحوم موجودہ قحط الرجال میں سلف صالحین کا قابل تقلید نمونہ تھے ان کی رحلت کو ناقابل تلافی نقصان سمجھتی اور مرحوم کے پس ماندگان کے ساتھ دلی ہمدردی کرتی ہے۔

(۲) آل انڈیا مسلم لیگ مسلمانان ہند کے عظیم الشان اور قابل احترام رہنما نواب وقارالملک بہادر کی موت پر اظہار تاسف کرتی ہے جو کہ اس لیگ کے اولین آنریری سکریٹری تھے اور جنھوں نے کہ اپنی تمام زندگی اپنی قوم کی بے غرض خدمت میں وقف کردی تھی اور جن کی مسلمانوں کے حقوق اور مقاصد کے مردانہ وار تحفظ کی کوششوں نے اپنے ہم مذہبوں کے دلوں میں محبت کی ایک پائدار جگہ قائم کردی۔“

قطعۂ تاریخ شعرا نے اس حادثہ پر بے شمار قطعات مرثئے اور رباعیاں وغیرہ جو ان کے جذبات دلی کے ترجمان تھے تصنیف کئے اُن میں سے ہم پروفیسر عزیز لکھنوی کا ایک قطعہ جو نواب صاحب کی سیرت پر ایک بہترین نظم بھی ہے درج کرکے اس حصہ کو ختم کرتے ہیں۔

قطعہ

اے وقار الملک اے مشتاقِ اقلیمِ بقا
خادمانِ قوم تیرے میکدے کے جرعہ نوش

یادگارِ رفتگاں بانگِ درائے کارواں
ہستیٔ پُر جوش سر سیّد کی موجِ پُر خروش

مقطعِ اقبالِ قوم اے انجمن افروزِ ہند
جانتے تھے تجھ کو فردِ منتخب اربابِ ہوش

کشتیٔ ہندوستان کا ناخدا اک تو بھی تھا
بحرِ ہستی میں ترے فقدان سے ہے اک خروش

تیرے دم سے مطمئن تھے قوم کے افراد سب
مبتلائے فکرِ فردا اور نہ محوِ رنجِ دوش

تیرے مرتے ہی زمانہ بن گیا ماتم کدہ
سازِ ہستی سے صدا ہوتی ہے اللہ رے خروش

تھی بھری کانوں میں اب تک تیرے نغموں کی صدا
انجمن میں آج تک ہے پُر نوا ہر سازِ گوش

حیف اب اس عہد میں جنسِ وفا نایاب ہے
یوں تو ملتے ہیں بہت گندم نما و جو فروش

یوں تو دیکھے ہیں بہت اس تنگنائے دہر میں
لیڈرانِ عیش اہل و واعظانِ خرقہ پوش

ہاں مگر اس آئینہ خانہ میں تم کم پاؤ گے
حق پسند و حق شناس و حق پژوہ و حق نیوش

اے ہوائے بزمِ ساقی آئے ہم اس دور میں
ہو گئے رنداں مئے آشام جب ہستی فروش

یادگارِ ہستیٔ پیرِ مغاں کوئی نہیں
میکدہ ویران بے رونق ہے بزمِ ناؤ نوش

جس قدر تھے گوش بر آوازِ حیّ الرحیل
ہو گئے اس انجمن سے آج وہ سب چشم پوش

دم غنیمت تھا زمانہ میں وقار الملک کا
ہر صدا کو جس کی سمجھے لوگ آوازِ سروش

دل سے نکلا اک دھواں پڑھتے ہی تاریخِ عزیز
ہے جہاں میں آج شمعِ بزمِ سر سید خموش

۱۹۱۷ء